فخر العلماء

(مولانا فخر الحسن محدّث گنگوہی کی سوانح اور خدمات)

از

(سیّد اشتیاق اظہر)

دارالتفسیر والحدیث

شادباش و شادزی، اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تُو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ظفر علی خاں



فخر العلماء

(مولانا فخر الحسن محدّث گنگوہی کی سوانح اور خدمات)

از

(سیّد اشتیاق اظہر)

• جملہ حقوق محفوظ ہیں •

نام کتاب : ________ فخر العلماء
مصنف : ________ سید اشتیاق اظہر
ناشر : ________ اکرم زیبائی
مطبع : ________ انٹرنیشنل پریس - کراچی
سالِ طباعت : ________ سنہ ۱۹۸۵ء
قیمت : ________ ۲۵ روپے

• ملنے کا پتہ •

میزانِ ادب - B-۲۷-K - خالد آباد گلبہار کالونی - کراچی
ٹیلیفون نمبر : ۶۱۴۳۲۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

عمر کے تقاضہ سے طبعی ضعف و اضمحلال اور عادی مشاغل و مصروفیات کے ساتھ میرے لئے کسی طویل مضمون کی ترتیب اس وقت ممکن نہیں مگر حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کا اسم گرامی ایسا نہیں ہے کہ میں انکے ذکر سے پہلو تہی کروں، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ حضرت شیخ الہندؒ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ میں سے تیسرے ہیں دار العلوم سے ان کی فراغت حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ کے ساتھ ہوئی پہلے وہ خورجہ ضلع بلندشہر میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے پھر کانپور منتقل ہو گئے، اور ایک عرصہ تک یہ شہر اور اس کے اطراف حضرت مولانا کی علمی دینی خدمات سے مستفید ہوتے رہے اپنے استاد حضرت مولانا نانوتویؒ کا مباحثۂ شاہجہانپور بھی ان کا ترتیب دیا ہوا ہے "ابوداؤد شریف" پر ان کا حاشیہ ان کے نام سے مطبع مجیدی کانپور سے چھپ کر گذشتہ ایک صدی سے سرمۂ چشم ارباب بصیرت بنا ہوا ہے "ابن ماجہ" پر بھی ان کا حاشیہ قلمبند تھا، میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی سوانح حیات انہوں نے ایک ہزار صفحات پر لکھی تھی کانپور میں کسی وقت ان کے مکان میں آگ لگی، اور یہ قیمتی مسودہ نذر آتش ہو گیا، یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی لکھی ہوئی سوانح عمری اگر سامنے آتی تو حضرت نانوتوی کے متعلق حقائق و معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ

سامنے آجاتا۔

حضرت مولانا فخر الحسنؒ صاحب اپنی علمی بصیرت، علوم اسلامیہ میں تحریری اور تقریری خدمات، تقویٰ و دینداری کی ایک معیاری زندگی اور حضرت نانوتویؒ سے براہ راست فیضیابی بہ سفر و حضر میں ان کی معیت و خدمت اور ان کے اعتماد کامل سے مستفید تھے۔

یہ واقعی ایک خلاء تھا کہ حضرت مولانا فخر الحسنؒ کی کوئی مکمل سوانح عمری سامنے نہیں آئی تھی اگرچہ دار العلوم کے تاریخی لٹریچر اور حضرت نانوتوی قدس سرہ سے متعلق معلومات میں ان کا ذکر بار بار آتا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس فرض کو آپ نے ادا فرمایا "کل امر مرھون باوقاتھا" کے بموجب یہ کام اپنے وقت پر ہو رہا ہے، میں آپ کی اس کتاب کا بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے آپکی اس کتاب کو مقبولیت تامہ نصیب فرمائے۔ اس کتاب کا میں بھی بہت شوق اور آرزو سے متمنی ہوں کہ مستفید ہوں۔

محمد طیب

مدیر جامعہ اسلامیہ دار العلوم

دیوبند - ۸-۶-۱۴۰۰ھ

خواہش و تجویز

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا فخر الحسن صاحب محدث گنگوہی کے نام اور ان کی اہمیت سے پہلے سے واقف تھا نزہتہ الخواطر میں ان کا تذکرہ ہے۔ ان پر جو کتاب لکھی جائے اس پر مقدمہ لکھنا میرے لئے سعادت ہے لیکن اس میں دو دشواریاں ہیں ایک تو یہ کہ میرے لکھنے میں بہت تاخیر کا اندیشہ ہے۔ ہفتہ عشرے میں سفروں کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ دوسرے جب تک کتاب سامنے نہ ہو تو اچھی طرح مقدمہ لکھا نہیں جاتا۔ اس لئے اگر دہلی کے کسی ممتاز عالم اور مؤرخ سے یہ خدمت لے لی جائے تو بہتر ہوگا۔ شاید ایوب قادری یا مولانا تقی عثمانی صاحب اس کے لئے موزوں رہیں گے۔

اظہار خیال

مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مجاز طریقت
حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری

اُس رب کریم کا شکر ہے جس نے ایک عظیم شخصیت کی سوانح لکھنے کی سعادت عطا فرمائی۔ ایسے عظیم، جید اور مستند عالم کی سوانح جس کی حرمت فکر کا الفاظ و معنیٰ احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہم اُس رب العزت کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جسکے جود و سخا سے یہ سعادتِ عظیم ہمارے حصے میں آئی وہی حلیم و حمیم جس نے ایسی ہستیوں کی تخلیق سے ملتِ مسلمین کو نوازا جسکی فکر و عمل کی ضیا پاشیوں نے امتِ مسلمہ کے گوشہ گوشہ کو منور کیا۔

ایسی ہستی جو مذہب اسلام کے "تابعین، محدثین۔ مجتہدین، مفسرین اور علماء میں عظیم تھی الحاج المولوی فخر الحسین کی ہے۔ وہ علوم دینیہ کے خزینہ، اصولِ الفقہ والشرائع والاحکام سنت کے جید عالم جنھوں نے اپنی تصنیف و تالیف کے ذریعہ نجاتِ انسانی کا راستہ بتایا۔

آپ کی تحریر کی ترکیب و ترتیب، بیان کی متانت، تحریر کی قادر الکلامی اہم خصوصیات ہیں۔ مولانا الحکیم الحافظ الحاج المولوی فخر الحسن کی ذات جامع کمالات، عالم و فاضل، محدثِ کامل، حامی اسلام والمسلمین، عالم انسانیت کے علم بردار تھی۔

(ماخوذ از حسامی)

بیان و کلام

مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند

فلک علم و ذکاوت، رشد و ہدایت کے شمس بازغہ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ العزیز بانی دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ درخشندہ ستاروں میں حضرت مولانا حکیم فخرالحسن نور اللہ مرقدہ گنگوہی کو حق تعالیٰ نے خصوصی نام و امتیاز بخشا ہے۔ آپ استاد محترم کے قوت بازو بلکہ معتمد ترجمان کی حیثیت سے اہل باطل کے مقابلہ میں گئے۔ پنڈت دیانند سرسوتی نے جب اسلام پر الزامات وارد کئے تو اولاً مولانا کو جواب کے لئے بھیجا گیا۔ کیونکہ حضرت نانوتوی کی طبیعت علیل تھی۔ پھر حضرت نانوتوی بھی تشریف لے گئے۔ مگر مناظرہ کی صورت نہ بن سکی تاہم پنڈت جی نے جو اعتراضات کئے ان کے جوابات "انتصار اسلام" اور کے عنوان سے شائع کر دیئے گئے۔ پوری صدی گذر جانے پر بھی ان دونوں کتابوں کو رد نہیں کیا جا سکا۔ شاہ جہاں پور میں میلہ خدا شناسی کے نام پر جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں بھی مولانا کی کافی خدمات ہیں۔ تحذیر الناس تصنیف کی گئی۔ تو اس پر اعتراضات کئے گئے۔ ان کے جوابات میں بھی مولانا کے قلم نے خوب جوہر دکھائے۔ عمر کا آخری حصہ کانپور میں گذارا۔ بڑے حاذق طبیب تھے۔ فن حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داود شریف پر بڑا جامع حاشیہ تحریر فرمایا جو اپنی نظیر آپ ہے۔"

غالباً ۱۳۱۶ھ میں وفات پائی ۔ کانپور ہی میں قبر مبارک ہے۔ خدائے پاک رحمتوں اور انوار کی بارش سے سیراب فرمائے ۔

قابل مبارک باد ہیں محترم سید اشتیاق اظہر صاحب انہوں نے مولانا کے حالات تحریر فرما دیئے کہ آنے والی مخلوق بہرہ یاب ہو۔ اللہ پاک اس خدمتِ جلیلہ کو قبول فرمائے اور مصنفِ محترم کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے اور دارین کی ترقیات سے نوازے۔ آمین ۔

دیباچہ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت میں ان کی اولاد و احفاد اور تلامذہ "مسترشدین" نے پوری کوشش کی۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور تبلیغ و تذکیر کے ذریعہ فکر ولی اللہی کو عام کیا اور اس طرح ایک تحریک برپا کردی۔ شاہ صاحب کے فرزندان، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کی دینی خدمات برصغیر میں اصلاح و تبلیغ کی تحریک میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔
شاہ عبدالعزیز (۱۸۲۳ء) کے بعد اس خانوادہ کے نمائندے شاہ اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) اور شاہ اسماعیل (ف ۱۸۳۱ء) ہوئے۔ اول الذکر شاہ اسحاق اپنے نانا شاہ عبدالعزیز کے افکار و خیالات کے بڑی حد تک، پابند رہے اور شاہ اسماعیل، ابن تیمیہ اور اس دور کے مشہور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے متاثر ہوئے۔ شاہ اسحاق نے اپنے نانا شاہ عبدالعزیز کے اتباع میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے طریقۂ کار کو اپنایا اور ان کے مسلک پر کاربند رہے۔

شاہ اسماعیل دہلوی کا رجحان "عمل بالحدیث" کی طرف رہا اور آہستہ آہستہ شیخ عبدالحق بنوتنوی ثم بنارسی وغیرہ کی کوششوں سے عاملین بالحدیث نے جماعتی صورت اختیار کرلی اور یہ جماعت بڑی حد تک شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شیخ شوکانی یمنی کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئی۔ دہلی میں شمس العلما، میاں نذیر حسین اور

بھوپال میں نواب صدیق حسن نے ان افکار کی نشر و اشاعت میں خوب حصہ لیا۔ امتیاز و اختصاص کے لئے نئے نئے مسائل کا شیوع ہوا۔ اور عرف عام میں اس کو "وہابی" تحریک کا نام دیا گیا۔ جس سے ایک نوع کی تحقیر اور منفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ مولوی محمد حسین بٹالوی مدیر اشاعۃ السنہ (لاہور) نے بڑی کوششیں کر کے مرکزی حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں سے اس جماعت کا نام "اہل حدیث" منظور کرایا۔

۱۸۴۱ء میں شاہ محمد اسحاق ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مکہ معظمہ ہجرت کر گئے ان کے مشن کو ان کے تلامذہ نے جاری رکھا۔ جن میں سے چار حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں (۱) شاہ عبدالغنی مجددی (ف ۱۸۷۸ء) کو جنھوں نے شاہ اسحاق کی مسند درس پر بیٹھ کر علم حدیث کو عام کیا۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں (۲) مولانا احمد علی سہارن پوری (ف ۱۸۷۹ء) جنھوں نے حدیث کا درس بھی دیا اور دہلی میں مطبع احمدی قائم کر کے حدیث کی کتابیں صحیح بخاری و مسلم وغیرہ نہایت اہتمام سے شائع کیں (۳) مفتی عنایت احمد کاکوروی (ف ۱۸۶۳ء) جنھوں نے درس و تدریس کے علاوہ ۱۸۵۵ء میں سب سے پہلے ایک اصلاحی انجمن بنام "جلسہ تائید دین متین" بریلی میں قائم کی اور اس سے بہت سی اصلاحی ادب شائع کیا۔ (۴) نواب قطب الدین خاں دہلوی (ف ۱۲۸۹ھ) انہوں نے بھی اصلاح و تذکیر کے میدان میں بڑا کام کیا ہے انہوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ علوم و افکار ولی اللہی کی خوب نشر و اشاعت کی

۱۸۵۷ء کے واقعہ ہائلہ کے بعد دہلی تاخت و تاراج ہوئی۔ علمی

مجالس اور ادبی جلسے ختم ہو گئے مدرسے اور خانقاہیں اجڑ گئیں۔ کتب خانے برباد ہو گئے، خاندانِ ولی اللہی قریب قریب ختم ہو گیا جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جب حالات قدرے درست ہوئے تو حضرت شاہ اسحاق کے سلسلے کے فیض یافتہ علما نے ایک اسلامی درسگاہ کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ یہ حضرات بڑی حد تک، مولانا مملوک علی نانوتوی مفتی صدر الدین آزردہ، شاہ عبدالغنی مجددی، شاہ ابو سعید مجددی وغیرہ سے تلمذ کا شرف رکھتے تھے۔ اس جماعت میں حاجی عابد حسین، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا مظفر حسین وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اس جماعت کے شیخ طریقت تھے اس کے قیام میں ان کی دعائیں بھی شامل تھیں۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں دہلی سے قریب دیوبند ضلع سہارن پور میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دارالعلوم دیوبند نے برصغیر میں مرکزیت حاصل کر لی۔ اس درس گاہ سے نامی گرامی علما پیدا ہوئے۔ جنھوں نے درس و تدریس تصنیف و تالیف، تبلیغ و تذکیر، صحافت و سیاست، غرض ہر شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور یہ تمام مجموعی سرگرمیاں "دیوبند تحریک" کے نام سے موسوم ہوئیں گویا دیوبند تحریک شاہ ولی اللہی تحریک کا تکملہ ہے۔

اب ہم "دیوبند تحریک" کی تاریخ نویسی کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے تو اس ضمن میں جیسا کام ہونا چاہیئے تھا ویسا نہیں ہوا حتیٰ کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حالات و سوانح پر معقول کام نہ ہو سکا۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے ان کے انتقال کے فوراً بعد ایک مختصر سا کتابچہ لکھدیا تھا جس کے ذریعہ سوانحی نکات و اشارات محفوظ ہو گئے تقریباً

پون صدی کے بعد ان کی سوانح عمری مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے مرتب فرمائی جسے ہم معلومات کا ایک خزانہ اور حالات و واقعات کا کشکول کہہ سکتے ہیں کاش حالی، سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی یا مولانا ابوالحسن علی میاں جیسا سوانح نگار ملتا تو بات بنتی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا وہ تو خدا بھلا کرے مولانا اشرف علی تھانوی کا کہ انہوں نے مکتوبات و بیاض یعقوبی شائع کردی اس سے ان کے بہت سے حالات و واقعات محفوظ ہو گئے اور آخر میں ان باپ بیٹوں مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا مملوک علی پر پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی مرحوم نے قلم اٹھایا مگر

ع وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

مولانا رشید احمد گنگوہی پر مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے بھرپور انداز میں لکھا ہے قدیم انداز تحریر ہونے کے باوجود یہ کام خوب ہوا ہے۔ اسی طرح مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الخلیل لکھ کر بھی سوانح ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور اب ان بزرگوں پر جامعات میں بھی کام شروع ہو گیا ہے مولانا رشید احمد گنگوہی پر جامعہ سندھ (حیدرآباد سندھ) میں نفیس احمد صدیقی نے پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے ابھی یہ مقالہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی پر پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا مقالہ لکھا گیا ہے۔ اس طرح مولانا انور شاہ کاشمیری پر علی گڑھ یونیورسٹی میں رضوان اللہ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے۔ شاہ صاحب پر دو کتابیں دیوبند سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔

اوّلیں طبقہ میں حاجی عابد حسین (ف ۱۹۱۳ء) وہ بزرگ ہیں جن پر بالکل توجہ نہیں دی گئی حالانکہ وہ دارالعلوم دیوبند کے بانی اوّل ہیں

پچھلے دنوں ۱۹۸۰ء میں جب دیوبند میں جشن منایا گیا تو حاجی صاحب کے کسی عزیز نے ایک کتابچہ شائع کر کے تقسیم کیا۔ اور اس میں حاجی صاحب کی اُن کوششوں کا جائزہ لیا ہے جو انہوں نے قیام دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں کی تھیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی پر وفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے ایک ضخیم کتاب لکھدی ہے اور ان کے مکتوبات بھی شائع کر دیئے ہیں مگر ابھی کام کی نہ صرف گنجائش ہے بلکہ ضرورت ہے پھر ان کے برادرانِ گرامی قدر مولانا حبیب الرحمٰن، مفتی عزیز الرحمٰن اور والد مولانا فضل الرحمٰن کے حالات و واقعات کو بھی کتابی شکل میں آنا چاہیئے۔ مفتی عتیق الرحمٰن اگر اس طرف توجہ کریں تو یہ کام ہو سکتا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب پر کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ حیات شیخ الہند (میاں اصغر حسین) اسیر مالٹا (حسین احمد مدنی) اور تحریک شیخ الہند اسی نوع کی کتابیں ہیں کاش ڈاکٹر ابو سلیمان شاہجہان پوری صاحب۔ اِدھر توجہ فرمائیں تو جدید انداز پر شیخ الہند کی سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی وہ بزرگ ہیں کہ جن کے متعلق بہت کچھ ملتا ہے اشرف السوانح (تین جلد) ایک طرح سے خود نوشت ہے۔ پھر عبدالماجد دریا بادی نے حکیم الامت لکھ کر بات کو آگے بڑھایا چھوٹی موٹی اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی نے نقشِ حیات دو جلدوں میں خود لکھدی ہے۔ اس میں سیاسی پس منظر اور معلومات زیادہ ہے۔

مولانا مدنی پر کام کرنے کی ضرورت ہے بلکہ آج کل تو مدنی گروپ پاک و ہند میں بہت فعال ہے کوئی اہل قلم اس طرف توجہ کرے۔ مولانا اعزاز علی پر ایک کتابچہ شائع ہوا ہے مولانا محمد سہول صاحب او ر

مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری کے حالات بھی چھپ گئے ہیں۔ مولانا ظفر احمد تھانوی نے بھی اپنے حالات خود شائع کر دیئے ہیں۔

مفتی کفایت اللہ کے حالات پر مفتی حضرات کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے ضرورت ہے کہ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن کے حالات مدون و شائع کئے جائیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات ریشمی رومال کی تحریک کی وجہ سے بہرحال شائع ہو چکے ہیں۔ تبلیغی جماعت تحریک دیوبند کی شاخ ہے۔ اس کے شیخ اول مولانا الیاس پر خاصا کام ہو گیا ہے مولانا ابوالحسن علی میاں کے قلم فیض رقم نے یہ کام انجام دے کر علمی دنیا پر احسان کیا ہے۔ اس طرح مولانا محمد یوسف پر کام ہو گیا ہے اور ہو رہا ہے خاکسار مقدمہ نگار نے بھی پہلے "مرقع یوسفی" پر مقدمہ لکھا اور بعد ازاں تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ ایک کتاب لکھی۔ مولانا محمد زکریا صاحب نے اپنی خود نوشت لکھی ہے۔ اور اب مولانا ابوالحسن علی میاں ان کی سوانح عمری مرتب فرما رہے ہیں۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

جماعت دیوبند کے شیخ طریقت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی پر اب کام کرنے کی ضرورت ہے ان کی کوئی معیاری سوانح عمری مرتب نہیں ہو سکی ہے اگرچہ ان پر مواد کافی ہے۔ کمالات امدادیہ، کرامات امدادیہ، شمائم امدادیہ، مکتوبات امدادیہ، امدادیہ، امداد المشتاق (مجموعہ مکتوبات) اور مولانا اشرف علی کے ملفوظات اس کام کے لئے نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مولوی امداد صابری نے ایک پمفلٹ لکھا تھا۔ جو بالکل ناکافی اور سرسری ہے۔

ع سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

کاش مولانا محمد تقی عثمانی اس طرف توجہ کر سکیں۔

اس جماعت کے ایک ممتاز عالم اور مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی

براقم الحروف نے ایک کتاب ۱۹۶۶ء میں لکھی تھی جو علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ اس موضوع پر ہمارے دوست قاری فیوض الرحمٰن (ایبٹ آباد) خاصا کام کر رہے ہیں۔

مولانا محمد یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مفتی محمود پر بنیات (کراچی) البلاغ، (کراچی) اور ترجمان اسلام (لاہور) کے ضخیم نمبر شائع ہوئے ہیں۔

اگر اس مواد کی روشنی میں ان حضرات کی سوانح عمریاں مرتب کر دی جائیں تو ایک بنیادی کام ہو جاتا جس کی اب بھی ضرورت باقی ہے۔

ضرورت ہے کہ اس تحریک کے علماء پر ایک بورڈ کام کرے اور ہر عالم کی سوانح عمری مرتب کی جائے بعض حضرات کی سوانح عمری ان کی خدمات کے اعتبار سے مختصر، متوسط اور ضخیم بھی شائع ہونی چاہئیں۔

دیوبند تحریک کے علماء و اکابر پر مجموعی طور سے مولانا محمد میاں دیوبندی نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ ان کی کتابیں علمائے ہند کا شاندار ماضی اور علمائے حق اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔ اس کے بعد مولوی محبوب رضوی نے تاریخ دیوبند اور تاریخ دارالعلوم دیوبند لکھ کر کام کو آگے بڑھایا۔ مرحوم کا یہ کام بنیادی اور مستند ہے۔ اسی طرح مولوی محمد شاہد (نبیرۂ مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث) نے مدرسہ مظاہر العلوم اور اس کے علمی کارنامے دو جلدوں میں لکھ کر تحقیق و تفصیل کا حق ادا کر دیا ہے۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے اس موضوع پر قاری فیوض الرحمٰن (ایبٹ آباد) اور خوب لکھ رہے ہیں۔ اس زمرہ میں مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری (تذکرہ مشائخ دیوبند) مولانا احمد رضا بجنوری (مقدمہ انوار الباری) اور حافظ عبدالرشید (مکتبہ رشیدیہ لاہور) کی کوشش بھی آتی ہیں۔

تحریک دیوبند کے ایک نامور عالم، استاد، مصنف اور حکیم۔

مولانا فخر الحسن شاہ عبدالرحمٰن (ف ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۷ء) جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاص شاگرد اور معتمد تھے بلکہ ان کی زبان وقلم تھے وہ دیوبند سے سب سے پہلے گروپ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ساتھ ۱۲۹۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ انہوں نے دہلی میں حکیم محمود خاں سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۹۴ھ میں خورجہ کے مدرسہ میں بحیثیت صدر مدرس، تدریس کے فرائض انجام دینے لگے پھر مدرسہ عبدالرب دہلی میں چلے گئے۔ اور وہاں درس وتدریس کا مشغلہ رہا۔

وہ تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے علم حدیث پر خاص طور سے دقیق نظر رکھتے تھے ابو داؤد کا حاشیہ "التعلیق المحمودؒ" کے نام سے لکھا۔ ابن ماجہ اور تلخیص المفتاح کے حواشی لکھے۔ ان کا سب سے اہم کام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سوانح عمری کی تالیف ہے یہ کتاب ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ افسوس کہ زمانہ کے ناقدر ہاتھوں برباد ہو گئی ایک روایات یہ ہے کہ کانپور میں ان کے مکان میں آگ لگ گئی تھی اس کی نذر ہوئی۔ جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ اس کا ایک نسخہ دارالعلوم دیوبند پہنچا تھا۔ پھر نہ معلوم کیا اسباب ہوئے کہ وہ قیمتی صحیفہ ضائع ہو گیا۔

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا فخر الحسن فنِ مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے خصوصاً آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے ان کے اکثر مچیٹے ہوتے تھے۔ مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں۔

وہ اپنا زیادہ وقت ہندوؤں
اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے
میں صرف کرتے ہیں۔

وہ ہندوؤں سے مناظرہ کرنے میں اپنے استاد محترم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ رہتے تھے بلکہ بعض جگہ مناظرہ کرنے کے لئے مولانا قاسم نانوتوی نے مولانا فخر الحسن گنگوہی کو مامور کیا اور اس میں ان کو شاندار کامیابی ہوئی۔ مولانا نانوتوی نے مناظرہ کے موضوع پر جو کتابیں (۱) مباحثۂ شاہجہانپور (۲) گفتگوئے مذہبی (۳) قبلہ نما (۴) انتصار الاسلام لکھی ہیں وہ مولانا فخر الحسن گنگوہی کی مرتبہ ہیں اور ان کے الفاظ میں ہیں۔ اول الذکر کتاب کا مخطوطہ بخط مولانا فخر الحسن گنگوہی دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود و محفوظ ہے۔

مولانا فخر الحسن گنگوہی انگریزی استعمال کے بھی سخت خلاف تھے ان کو انگریز نفرت خاندانی ورثے میں ملی تھی ان کے نانا شاہ حسن عسکری دہلوی وہ بزرگ تھے جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف محاذ قائم کیا۔ ان کا قلعہ دہلی میں بڑا اثر و رسوخ تھا

مولانا فخر الحسن آخر عمر میں کانپور تشریف لے گئے وہیں درس و تدریس اور طباعت کا سلسلہ رہا۔ کانپور کے بساطی حضرات ان کے بڑے معتقد تھے۔

بڑی مسرت اور خوشی کی بات ہے کہ ان کے پرنواسے جناب اشتیاق اظہر صاحب نے حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کی سوانح عمری مرحمت فرمائی ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں ان کو سخت جدوجہد کوشش بلیغ اور وافر محنت کرنی پڑتی ہے مواد کی فراہمی اور کتابوں کی دستیابی ایک بڑا مرحلہ تھا۔ مگر ان کے جذبۂ صادق نے اس مشکل مرحلہ کو کسی نہ کسی طرح طے کر لیا۔ اور ایک مفصل سوانح عمری مرتب کر دی ہے۔ اس سے اس دور کی علمی و تعلیمی اور ثقافتی حالات کی سچی تصویر نظر آجاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں

یہ کتاب بہ نظر استحسان دیکھی جائے گی

۱۸؍ رمضان المبارک
۱۰؍ جولائی ۱۹۸۲ء
ہفتہ

محمد ایوب
اے/۲/۱۷/ این بلاک
شمالی ناظم آباد۔ کراچی

عرضِ مُصنّف

فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہیؒ کے دینی تبلیغی اور علمی کارناموں کے بارے میں "حیات فخر العلماء" کی تصنیف کی طرف توجہ ہونے کی سب سے پہلی ترغیب تو مولانا مناظر احسن گیلانی کی مشہور تصنیف سوانح قاسمی کے مطالعہ سے ہوئی جنہوں نے حضرت فخر العلماء کے بارے میں واقعات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا عزم تو کیا تھا مگر جسے وہ علالت و رحلت کے سبب عملی جامہ نہ پہنا سکے "حیات فخر العلماء" کی تصنیف کی دوسری وجہ "دار العلوم" میں شائع ہونیوالے ایک اور مضمون کا مطالعہ بنی جس میں حضرت مولانا فخر العلماء محدث گنگوہی کو سب سے پہلے فخر العلماء کے نام سے یاد کیا گیا تھا مگر ان دونوں وجوہ سے بڑھ کر میرے مرشد حضرت مولانا زکریا کی اس خواہش نے مہمیز کا کام کیا کہ یہ تصنیف میری زندگی میں شائع ہو جائے تاکہ میں اسے پڑھ کر سن لوں۔

لیکن جب میں نے حیات فخر العلماء کے موضوع پر قلم اٹھایا تو مواد کی کمی اور واقف کار حضرات کی عدم دستیابی نے قدم

قدم پر مشکلات کھڑی کر دیں لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ آخر کار ان مشکلات پر قابو پانے کے بعد یہ تصنیف تکمیل کے مراحل سے بخیر و خوبی گزر گئی۔ حضرت فخر العلماء کا ۱۸۹۷ء میں وصال ہوا تھا اس لئے جب ان کی حیات اور کارناموں کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی تو ان کی رحلت کو تاسی ۸۵ سال گزر چکے تھے۔ اس لئے اگر ناظرین کو کتاب کے مطالعہ میں کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہو تو اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

حیات فخر العلماء کی ترتیب و تصنیف کے بعد اب اس کی کتابت و طباعت و اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا لیکن اس سلسلہ میں پیر زادہ حسن نسیم گنگوہی کی مالی معاونت سے کتابت کے جملہ مراحل طے پا گئے اور میرے عزیز ساتھی مولوی ریاض الدین اور اسرار احمد جونیئر نے بھی ان مراحل کو بہ آسانی طے کرانے میں مدد اور معاونت بہم پہنچائی۔ رہا اس کی اشاعت و طباعت کا مرحلہ تو اس کام میں میزان ادب کے ناظم اعلیٰ اکرم زیبائی نے حسب معمول مشکل کشائی فرمائی اور یہ سوانح جو دراصل دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی سالوں اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت قاسم العلوم کے علمی کارناموں کا بھی کما حقہ احاطہ کرتی ہے جنوبی ایشیا کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والوں کیلئے ایک مفید مطالعہ کا سامان مہیا کر سکتی ہے۔

لیکن اس موقعہ پر ایک بات کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ "حیات فخر العلماء" کی کتابت میں قصداً یا سہواً اتنی تاخیر کی گئی کہ حضرت مولانا ذکریا کاندھلوی مہاجر مدنی، حضرت مولانا محمد طیب اور ڈاکٹر ایوب قادری اس کے مطالعہ کے انتظار میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور حضرت فخر العلماء کی بھتیجی بیگم پیرزادہ ضیاء الحق اور پوتے وحید الحسن بھی اس دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد اس کے مطالعہ سے محروم رہ گئے اور یہ چیز مجھے ہمیشہ یاد رہیگی ۔ نیز اس سلسلے میں حضرت فخر العلماء کے ایک اور پر نواسے بریگیڈیئر ریٹائرڈ محمد رضیا پیرزادہ کی مالی معاونت کا بھی شکریہ ضروری ہے ۔

نیازمند
سید اشتیاق اظہر

کراچی

جنگ آزادی کی ناکامی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو مسلمانوں کے ذہین طبقہ نے اس انحطاط کو فوراً محسوس کیا اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جو اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت کے اواخر میں یعنی ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے حالات کی نزاکت کو خاص طور پر محسوس کیا۔ حضرت شاہ صاحب جوانی کے دور میں تھے کہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دلی پر حملہ کیا اور اس طرح مغلیہ سلطنت کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا۔

انہوں نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا کہ "ایران اور روما کی سابق تاریخ ہمارے لئے روشن مثال ہے اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو اس سے ایران اور روما کی حالت کا اندازہ کر لو۔ دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا۔ نئی نئی صنعتیں رونما ہوئیں۔ اور ملک اپنے اس دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا۔ لیکن بدقسمتی سے اہل ثروت اور حکمران طبقہ میں عیش، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں تفاخر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے سر پر سلطنت میں زیادہ جواہر لٹکے ہوئے ہیں ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلفات نباہنے کیلئے ہر ایک صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگے اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے انہوں نے غریب مزدوروں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب اس با اقتدار طبقہ کی تمام علمی اور فکری طاقتیں' ترقی ملک و دولت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات، نفع اندوزی اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں گھوڑوں کے مانند ہو گئی۔ زرکشی اور زراندوزی کے لئے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔ مزدور اور کسان طبقہ اگر ان سے سرتابی کرتا تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور رہتا۔ یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائشی انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقہ کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکر مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے لئے مخصوص ہو گئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔ اُدھر اقتصادی عدم تعاون اور طبقہ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ اور پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب، سرکار پرست، خوشامدیوں کا طبقہ تھا جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا، ان میں بہت سے صاحب فن و اہل علم بھی ہوتے تھے۔ وہ فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے، مگر ان کا مطمع نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار ان کی جدوجہد کا نصب العین ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا، کہ وہ فن سپہ گری کا ماہر ہے بہترین جنرل یا کمانڈر ہے۔ کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی۔ ایک جماعت فنون لطیفہ اور ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شان خسروانہ یہی ہے کہ فنون لطیفہ کے ماہرین کی قدر کی جائے، بادشاہ یا امیر کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمئ مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دیدیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب، درباری آداب،

ایک خاص فن بن گیا تھا اور ایک گروہ اسی طرح اس نام پر رقمیں وصول کرنے لگا تھا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدن مان لیا گیا تھا درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کے اغراض اور ان کی خوشنودی کے لئے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مخلوق دن بہ دن افلاس، فلاکت، تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی، یہاں تک کہ پورے ملک میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا، جس کو عاقبت کی فکر ہو۔ اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے۔"

شاہ ولی اللہ جانتے تھے کہ اقتصادی بدحالی دور کئے بغیر روحانی ترقی ناممکن ہے ان کا انقلاب اس لحاظ سے ان دوسرے تمام انقلابات سے مختلف تھا جو ان کی رحلت کے صدیوں برس بعد معرض وجود میں آئے۔ مولانا محمد میاں نے لکھا ہے کہ "درحقیقت یہ ہے کہ ان انقلابات میں ملوکیت اور سرمایہ داری بیشک ختم کی گئی لیکن وہ چیزیں جو انسانی دل و دماغ میں شاہ پرستی اور سرمایہ داری کے بیج بوتی ہیں ختم نہیں کی گئیں۔ بلکہ بسا اوقات خود انقلابی راہ نماؤں کا طرز عمل اس تخم کی آبیاری کرتا رہا۔ فکر و عمل کے اس تضاد کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ داری اور شاہ پرستی ختم ہونے پر بھی گوہر اطمینان مفقود اور جنسی اضطراب کی فراوانی روز افزوں ہے۔"

شاہ صاحب اصلاح احوال کے لئے ایک انقلاب کے خواہاں تھے، ایسا انقلاب جو جہاد کے ذریعہ لایا جائے شاہ صاحب کا عقیدہ تھا کہ "خود غرض انسانوں کی اغراض پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کر کے ملک کے امن و امان، باشندگان ملک کے اطمینان، آزاد کاروبار، خوشحالی، آزادیٔ رائے اور حقوق انسانیت اور حقوق شہریت پر ڈاکے ڈالنے لگے تو جبر و دست ظالم و جابر طاقت کا ختم کر دینا حق و صداقت کا تقاضا اور عدل و انصاف کا مطالبہ ہوگا۔" مگر شاہ صاحب چاہتے تھے کہ اس انقلاب کے لئے تعلیم و تربیت ضروری ہے اسلام کی تعلیم اور شاہ صاحب کے عقیدہ کے مطابق جہاد کا مقدس فرض پورے تقدس کے ساتھ وہی پارٹی انجام دے سکتی ہے جس کی تربیت خاص مقاصد کے لئے خاص طور پر کی گئی ہو۔ جس کا ہر فرد اپنے ذاتی اغراض ختم کر کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہو۔ اس لئے کہ جہاد کی اصل قوت ضبط نفس، صبر و استقامت، ذوق فنا اور وہ جذبہ ہے جو مصیبت کو راحت اور موت کو جام خوشگوار بنا دے۔

جناب سلیم صادق نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ کو یہ غم تھا کہ کہیں متاع دنیا کے ساتھ متاع ذہن بھی نہ لٹ جائے چنانچہ انہوں نے گہرے تفکر اور تدبر سے کام لیا فروعات سے اپنا دامن بچایا اور اصل کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا۔ سنت رسول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو کتاب حکمت یعنی قرآن مجید کی طرف از سر نو بلایا۔ قرآنی مضمون اور الہامی مضمون کو لوگوں پر براہ راست منکشف کرنے کے لئے ۱۷۳۷ء میں آپ نے قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ مجاہدۂ عظیم تھا جو شاہ ولی اللہ کے ہاتھوں سر ہوا۔ افق مذہب پر اصلاح احوال کا یہ پہلا سورج تھا جو سرزمین ہند سے ابھرا اور اس کی ضیا پاشیوں سے کشت امید میں نو بہار ناز کا آغاز ہوا۔ شاہ صاحب نے اور ان کے بعد ان کے سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے پورے جوش و انہماک سے مجاہدین کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ ان حضرات کی نگرانی میں دلی، رائے بریلی، لکھنؤ، نجیب آباد اور ٹھٹھہ میں مجاہدین کی تربیت کا سلسلہ جاری رہا اور مشکلات راہ کے باوجود یہ کام بڑھتا ہی رہا۔

یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز نے انگریزی اقتدار کے خطرہ کا احساس کرتے ہوئے فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جہاد کریں۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنے فتویٰ میں فرمایا کہ "چونکہ قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں، مذہب کا احترام ختم ہے اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے لہٰذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کرے اور جب تک اسے ملک بدر نہ کر دے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لئے حرام جانے۔"

شاہ عبدالعزیز جو درس و تدریس کے ذریعہ ولی اللّٰہی تحریک کے مقاصد کی تبلیغ اور تحریک کے ارکان کی

تربیت میں مشغول تھے اس عرصہ میں بھی خاموش نہ بیٹھے اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف نواب امیر علی خاں اور جسونت راؤ ہلکر کی مدد کی، ان کے تربیت یافتہ مجاہدین کا قافلہ شاہ عبدالعزیز کے مرید حضرت سید احمد شہید کی نگرانی میں ۱۸۱۸ء میں دلی سے روانہ ہوا تو اس کے ارکان کی تعداد پچاس تھی۔ روانگی کے وقت حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک دستار سیاہ اور ایک پیراہن سفید جو شاہ ولی اللہ کا استعمال شدہ تھا اپنے دست مبارک سے سید صاحب کو پہنا کر روانہ کیا۔ یہ حضرت سید احمد شہید کی عملی تربیت کا سفر تھا جنھیں شاہ عبدالعزیز نے اپنے مجاہدین کا امیر منتخب کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کے بعد حضرت سید احمد شہید کو ایک بار ہندوستان کے دورہ کی بھی ہدایت کی۔ اس دورہ میں انہوں نے لوگوں سے بیعت جہاد لی۔ دوسری بار شاہ صاحب نے حضرت سید احمد شہید کو مجاہدین کے ہمراہ حج پر جانے کا حکم دیا تاکہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہو جائے یہ دورہ ۱۸۲۶ء میں ہوا مولانا محمد میاں نے لکھا ہے کہ "اس دوسرے دورہ میں ۸سو افراد شریک و شامل تھے اور سفر کا مقصد تربیت جہاد تھی۔"

مولانا محمد میاں نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "تحریک کا اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ سیاسی انقلاب کے ساتھ سماجی انقلاب بھی برپا کیا جائے، تاکہ نظریہ "فک کل نظام" کی تکمیل ہو اور انقلاب کے بعد حکومت ایسے ہاتھوں میں پہنچے جو اصلاح یافتہ ترقی پذیر سماج کے کامیاب معمار ثابت ہوں یہ آٹھ سو ساتھیوں کے قافلے کا سفر محض سیاسی قسم کا تربیتی مظاہرہ نہیں تھا بلکہ درحقیقت اصلاح و تربیت کا نہایت کامیاب ذریعہ بھی تھی۔ یہ گویا چلتا پھرتا اصلاحی آشرم تھا جس کا ہر ممبر خود بھی تربیت پا رہا تھا اور اپنے دیکھنے والوں کو بھی متاثر کر رہا تھا۔

شاہ عبدالعزیز ۷ رمئی ۱۸۲۴ء میں انتقال کر گئے، ان کے بعد یہ تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حلقہ مجاہدین تھا جس کا سرگروہ حضرت سید احمد شہید اور ایک حلقہ تربیت جس کے سرگروہ مولانا شاہ محمد اسحاق تھے۔ سید صاحب ۱۸۲۶ء میں دلی سے آزاد قبائل روانہ ہوئے۔ جب وہ سندھ پہنچے تو ان کا استقبال پیر صبغۃ اللہ شاہ نے کیا وہاں سے آپ کوئٹہ قندھار، غزنی اور کابل کے راستہ پشاور پہنچے اور دس ماہ بعد چارسدہ میں قیام فرمایا۔ یہاں آتے ہی سکھوں سے ان کا تصادم ہوا اور ۱۰ رجنوری ۱۸۲۷ء کو عارضی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مگر اس سے پہلے ہی مقابلے شروع ہو چکے تھے۔ پہلا حملہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۱ء کو ہوا۔ مجاہدین نے آواخر ستمبر ۱۸۲۹ء میں پشاور فتح کیا اس موقع پر دلی کے مرکز کی امداد بھی پہنچنا شروع ہو گئی، پشاور پر مجاہدین کا قبضہ سولہ ماہ رہا لیکن سازشی روایتوں سے اکتا کر سید صاحب نے اس علاقہ سے کوچ کیا اور بالاکوٹ پہنچ گئے اور یہاں تاریخ حریت کا وہ دہشتناک حادثہ، مئی ۱۸۳۱ء میں پیش آیا جس میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔

یہ مجاہدین کس کیریکٹر کے لوگ تھے اس کا اعتراف ہنٹر نے ان الفاظ میں کیا ہے: "یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق بڑے ہی پاک طینت تھے۔ انہوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لئے نہیں لیا۔ سید صاحب کی زندگی کا درمیانی حصہ ایسا بھی تھا کہ جس میں ان کا دل برادران وطن کی نجات کے لئے ہر وقت بے قرار رہتا تھا۔ انہوں نے برادران وطن کی عملی زندگی پر وعظ کہنا شروع کیا اور ہر قسم کی اصولی بحثوں سے پرہیز کیا جس کے متعلق ان کے دشمن تو یہ کہتے ہیں کہ وہ اس قابل ہی نہ تھے اور ان کے مریدوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ ان کی برتری اور بزرگی کی شان کے خلاف تھا۔ ان کا سیاسی اور مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی امید و بیم کے عین مطابق تھا۔ ان میں ہزاروں اشخاص ایسے بھی موجود ہیں جو واقعی بہت بڑے متقی اور نفس کشی کو اپنا فرض اولین تصور کرتے ہیں" اور یہی اس پوری تحریک کا خلاصہ تھا۔

جنگ بالاکوٹ میں حضرت سید احمد اور شاہ اسمٰعیل کی شہادت کے بعد مجاہدین کی جماعت آزاد علاقہ میں منتقل ہو گئی۔ مگر دلی سے امداد و اعانت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور شاہ محمد اسحاق نے سید صاحب کے وصال کے بعد حضرت شاہ نصیر الدین کو جو ان کے داماد تھے اپریل ۱۸۳۵ء میں آزاد علاقہ روانہ کیا تاکہ وہ مجاہدین کی قیادت سنبھالیں مگر حضرت شاہ نصیر الدین جو حاجی امداد اللہ کے مرشد اول تھے ۱۸۴۰ء میں وصال پا گئے تو شاہ محمد اسحاق نے ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ کو اپنا مستقر بنایا مگر اپنے وصال سے قبل انہوں نے دلی میں تحریک کی تنظیم جدید کے لئے اولاً

مولانا مملوک علی کی قیادت میں اور بعد میں حاجی امداد اللہ کی قیادت میں علماء کا ایک بورڈ بنایا جس میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور شاہ عبد الغنی شامل تھے۔ اس بورڈ کے قیام کے بعد حضرت شاہ محمد اسحاق جنگ آزادی سے دس سال قبل ۱۸۴۷ء میں وفات پا گئے۔ دوسری طرف حضرت سید صاحب کی تحریک کے لوگوں کی امداد کے لئے ان کے خلیفہ مولانا ولایت علی کی قیادت میں ایک اور مرکز صادق پور پٹنہ میں قائم ہوا جس کے ذریعہ آزاد علاقہ کے مرکز کو امداد و کمک کا سلسلہ جاری ہوا۔ ادھر دلی کے مرکز نے حاجی امداد اللہ کی قیادت میں ولی اللہی تحریک کو از سر نو منظم کرنا شروع کیا اور اب مقصد انگریزوں سے براہ راست جنگ تھی۔ اس لئے کہ پہلے کے مقابلہ میں انگریزی خطرہ اور زیادہ واضح ہو گیا تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۳۱ء کے بعد جس تیزی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کیا اس کو محسوس کرتے ہوئے ان علماء نے فیصلہ کیا کہ ملوکیت کے خلاف تو جنگ بعد میں لڑی جائے گی پہلے انگریزوں کے نکالنے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ اس دوران میں انگریزوں نے جو مسلسل اہانت آمیز سلوک بے بس و لاچار مغل شہنشاہوں کے ساتھ روا رکھا اس کی وجہ سے خاندان مغلیہ میں بھی بے چینی کے آثار نمودار ہوئے۔ حد تو یہ ہو گئی کہ اس فیصلہ کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا کہ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد لال قلعہ مغل خاندان سے خالی کرا لیا جائے گا۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ کے مرکز دلی کے ارکان نے بہادر شاہ سے رابطہ قائم کیا اور حضرت شاہ حسن عسکری کے ذریعہ جو بادشاہ کے پیر تھے۔ بہادر شاہ کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ ولی اللہ کے بہت سے شاگردوں نے جو ملوکیت کے سخت خلاف تھے بہادر شاہ سے تعاون کو پسند نہیں کیا اور تحریک سے کنارہ کش ہو گئے اور صادق پور کے مرکز کے ارکان نے تو بہادر شاہ کی شمولیت کی باقاعدہ مخالفت بھی کی مگر مرکز دلی کے افراد کا کہنا تھا کہ انگریز خطرہ مغل خطرہ سے کہیں زیادہ ہے اس لئے اولیت انگریزوں کے اخراج کو ملنا چاہیئے۔ پھر ان لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ چونکہ تمام خرابیوں کے باوجود بہادر شاہ سے عوام کو بے پناہ عقیدت ہے اور ان کی وجہ سے تحریک آزادی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اس لئے بہادر شاہ سے تعاون مہنگا نہیں پڑیگا۔ یہ علماء یہ بھی سوچ رہے تھے کہ بہادر شاہ تمام کمزوریوں کے باوجود ملک کا آئینی قانونی اور باضابطہ حکمران ہے۔ اگر وہ انگریزوں کے خلاف کھڑا ہو گیا تو پھر بغاوت کا الزام انگریزوں ہی کے سر آئے گا۔ ان تمام وجوہ کی بناء پر تحریک کی از سر نو تنظیم شروع ہو گئی مگر قبل اس کے کہ سارے ملک کو تیار کیا جاتا اور بیک وقت سارے ملک میں جنگ آزادی کا آغاز کیا جاتا۔ ۱۰ مئی کو جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا اور میرٹھ کی ہندوستانی فوج بہادر شاہ کی قیادت میں لڑنے کے لئے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دلی پہنچ گئی۔ یہ اقدام حاجی امداد اللہ اور ان کے ساتھیوں کے لئے غیر متوقع تھا۔ چنانچہ تھانہ بھون سے حاجی رحمت اللہ کیرانوی کو دلی بھیجا گیا۔ بہرحال جب ۱۲ مئی کو بہادر شاہ جنگ آزادی میں شامل ہوا اور ۲ جولائی کو جنرل بخت خاں دلی پہنچا اور مولوی سرفراز علی ان کے ہمراہ گئے تو مجاہدین نے بھی جنگ آزادی میں شمولیت کی اور ۱۲ جولائی کو دلی کے ۳۴ علماء نے جہاد کا فتویٰ جاری کر دیا اور اس تاخیر کی وجہ سے بھی غالباً جنگ آزادی میں ناکامی ہوئی اس لئے کہ مئی اور جون کے مہینے ہندوستانیوں کے نقطۂ نگاہ سے لڑنے کے لئے بہترین تھے جو آپس کی بدنظمی اور بے ربطی کی نذر ہو گئے۔ بہرحال ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دلی پر انگریزوں نے قبضہ کر کے تحریک آزادی کو ناکام بنا دیا۔ اور اگرچہ مجاہدین نے نہایت سرفروشانہ انداز میں جنگ لڑی اور ہزاروں کی تعداد میں جام شہادت نوش کیا۔ مگر جو ناکامی مقدر ہو چکی تھی وہ آخرکار ہو کر رہی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے مگر مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم یہیں رہے۔ اور یہ بھی ایک پروگرام کے تحت ہوا تھا۔

اور یہ بات مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی زبانی تذکرۃ الرشید سے نقل کی جا رہی ہے۔ "اعلیٰ حضرت سے رخصت ہو کر امام ربانی گنگوہ واپس ہوئے مگر نہایت درجہ محزون و ملول۔ سب سے زیادہ اپنے روحانی باپ اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) کی مفارقت اور ہندوستان میں یتیم رہ جانے کا غم تھا۔ جو آپ کو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا۔ راتوں کو آپ کو اس رنج میں نیند نہ آتی تھی اور دنوں میں آپ اس دھن میں رہتے کہ کسی طرح اعلیٰ حضرت کی ایک دفعہ اور زیارت کر لوں مگر جائیں تو کہاں جائیں اور ملیں تو کس طرح ملیں نہ اعلیٰ حضرت کی کوئی جائے قیام معین

نہ بحالت روپوشی کسی جگہ کا تعین، آخر شدہ شدہ آپ کو پنج سالہ کا پتہ چلا اور بسم اللہ کہہ کر گنگوہ سے نکل کھڑے ہوئے، راتوں چلتے دنوں چھپتے، خار دار جنگل پیدل قطع کرتے تھکے پہنچے اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری کے مکان پر مقیم ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کو طفولیت میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) کی زیارت ہوئی اور آفتاب عالم کو اپنے گھر کا مہمان بنا دیکھا۔ حضرت مولانا نے نہایت شفقت کے ساتھ آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا پڑھ کر دم فرمائی۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مدظلہٗ کے والد ماجد راؤ اشرف علی خاں تگہری کے خوشحال زمیندار اور نہایت نیک خیال دیندار شخص تھے۔ راؤ صاحب کا حضرت مولانا سے کوئی تعارف نہ تھا مگر حسن اتفاق تھا کہ راؤ صاحب کو یہ انمول جواہرات گھر بیٹھے بلا طلب حاصل ہوئے۔ اس وقت حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کی عمر تین یا چار سال کی تھی۔ راؤ صاحب نے کچھ عجیب اخلاص کے ساتھ ساتھ حضرت گنگوہی کی مدارات کی اور شب کو بیعت کی درخواست کرنے لگے۔ حضرت مولانا نے انکار فرمایا اور کہا کہ اعلیٰ حضرت ابھی تشریف فرما ہیں۔ اگر یہ قصد ہے تو وقت کو غنیمت سمجھئے۔ غرض راؤ صاحب نے آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر رکھا اور ساتھ ہی چلنے کے متمنی و عازم ہوئے۔ حضرت مولانا نے اپنی بے سروسامانی اور اندیشہ ناک حالت ظاہر فرما کر سمجھایا کہ معیت قرین مصلحت نہیں۔ البتہ اگلے دن آپ آئیں، اعلیٰ حضرت سے سفارش کا میں ذمہ دار ہوں، چنانچہ ایک شب قیام کرنے کے بعد حضرت مولانا چل دیئے اور اعلیٰ حضرت کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اگلے دن راؤ صاحب بھی حاضر آستانہ ہوئے اور حضرت مولانا کی سفارش سے ایسی حالت میں بیعت ہوئے جس کو سراسیمگی اور چل چلاؤ کی حالت کہا جاتا ہے۔ حضرت امام ربانی نے ہر چند اصرار کیا کہ بندہ کو ہم رکاب لے چلیں مگر اعلیٰ حضرت نے نہ مانا اور یہ فرمایا کہ اسی طرح خدا کا حکم ہے۔ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا، آپ کو دہلی سے رخصت فرما دیا۔ حضرت مولانا بادل نخواستہ الفراق کہتے روانہ ہوئے اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اعلیٰ حضرت نے تسلی و تشفی دی اور فرمایا کہ میاں رشید احمد تم سے تو حق تعالیٰ کو ابھی بہت سے کام لینے ہیں، گھبراؤ مت، میں ہندوستان سے چلتے وقت تم سے ضرور مل کر جاؤں گا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور مراتب میں ترقی دے اس کے بعد دیر تک چھاتی سے لگائے رکھا اور آخر کار پدرانہ شفقت اور مربیانہ محبت کے انداز میں خود بھی چشم نم ہوئے اور مولانا کو بھی رلایا!" یہ سب تھا مگر حاجی صاحب کو مولانا کی طرف سے فکر بے حد تھی اور اس کے راوی مولانا ولایت حسین صاحب ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب فرماتے ہیں کہ "مولوی ولایت حسین صاحب کی روایت ہے کہ حکیم صاحب جو اعلیٰ حضرت کے مرید انبالہ کے رہنے والے ہیں بندہ کے ساتھ سفر حج میں شریک تھے۔ فرماتے تھے کہ جس زمانہ میں مولانا گنگوہی جیل خانہ میں تھے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ میاں کچھ سنا مولوی رشید احمد کی پھانسی کا حکم ہو گیا ہے۔ خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں ابھی تک تو کوئی خبر آئی نہیں۔ فرمایا ہاں حکم ہو گیا چلو یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور میں اور غالباً مولوی منظفر حسین کاندھلوی غرض تین آدمی چلے شہر سے نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا۔ خدائے تعالیٰ کو ان سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے۔"

تحریک دیوبند

اور یہ کام تحریک دیوبند کے آغاز کا تھا۔ اور یہی وہ کام تھا جس کا حاجی امداد اللہ نے ذکر فرمایا۔ یہ تحریک بھی شاہ ولی اللہ کے نظریات کی نشر و اشاعت اور جنگ آزادی کی ایک اہم کڑی تھی اور اس کا مقصد بھی مسلمانوں کو انگریزوں کے سیاسی، مذہبی اور اقتصادی تسلط سے نجات دلانا تھا، لیکن اس کا دائرہ عمل مختلف تھا۔ جس طرح سکھوں کے خلاف حضرت سید احمد شہید کے جہاد کا مطلب درحقیقت مجاہدین کی ایک جماعت تیار کر کے انگریزی غلبہ کا خاتمہ کرنا تھا اور جس طرح حضرت شاہ محمد آفاق کے علماء بورڈ کا مقصد ہندوستان سے فرنگی غلبہ کا خاتمہ تھا اور اس کے لئے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی اسی طرح دیوبندی تحریک کا قیام بھی انگریزوں کے خلاف جدوجہد تھی جس نے ایسے افراد تیار کئے جنہوں نے ایک طرف ردّ عیسائیت میں گراں قدر کام کیا دوسری جانب ریشمی رومال کی تحریک چلائی،

اور تیسری جانب مسلم لیگ اور کانگریس کے ذریعہ آخر ۱۹۴۷ء انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر دم لیا۔

ان سب تحریکوں کا دائرہ عمل مختلف تھا مگر مقصد ایک ہی تھا اور سب ایک ہی ولی اللہی تحریک کی مختلف کڑیاں تھیں۔ مولانا محمد میاں نے لکھا ہے کہ "تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء تک ہندوستانیوں کے دلوں میں مذہب کا احترام بہت زیادہ تھا۔" اور اس وجہ سے ارباب ملت اور علمائے اسلام کی بے حد اہمیت تھی۔ "چنانچہ سید احمد شہید کی تحریک کے سلسلہ میں ایک ایک مجاہد عالم کے مریدوں کی تعداد ۸۰،۸۰ ہزار تک پہنچی ہوئی تھی۔" احساس وطنیت فرقہ وارانہ جذبات پر حاوی تھا اور باہمی رواداری نے اقوام ہند کو ایک قوم بنا رکھا تھا۔ انگریزوں نے جنگ آزادی کے دوران اس اتحاد کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔ چنانچہ اسنے جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سب سے پہلے اسی اتحاد کو پارہ پارہ کرنا شروع کیا اور جنگ آزادی کو صرف مسلمانوں کی سازش قرار دیکر ایک طرف تو مسلمانوں کی سیاسی اقتصادی اور سماجی برتری کو ختم کرنا شروع کیا۔ اور دوسری جانب اسنے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت وحقارت کا بیج بونا شروع کر دیا۔ سر ہینری ایلیٹ جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کو مسخ کرکے اس کو تفرقہ انگیز مذہبی افسانوں کا گندہ ٹوکرہ بنا کر ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا اور جس کے تراجم اور اقتباسات اسکولوں میں داخل کراکر ہندوستانیوں کی ذہنیت کو برباد کیا گیا، اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "بڑا افسوس ہندو مصنفین پر ہوتا ہے جن سے ہمیں توقع ہوسکتی تھی کہ اس قوم کے احساسات، توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے۔ یہ لوگ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں اور اپنی تحریروں کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں۔" انہیں اس بات کی بھی شکایت تھی، کہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے رہتے ہیں۔"

انگریزوں کی اپنی اطلاعات کے مطابق" پرسنل گورنمنٹ کے اس سادہ نظام میں اہل ملک ایک نامعلوم زمانے سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ یہ فکر نہیں کرتے کہ بادشاہت ٹوٹ گئی یا منقسم ہوگئی جب تک ان کا گاؤں صحیح وسالم ہے انہیں پرواہ نہیں کہ وہ کس سلطنت میں داخل ہیں، یہ اتحاد واتفاق جس کا انگریز مورخین نے اتنا گلہ کیا ہے بے وجہ نہیں تھا۔ یہ اتحاد دراصل سلطنت مغلیہ کی اساس تھا اور اس کا ذکر بانی سلطنت مغلیہ بابر کی ایک وصیت سے ہے جو اس نے اپنے فرزند ارجمند ہمایوں سے کی تھی۔ بابر نے لکھا ہے کہ "اے پسر سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے۔ الحمد اللہ اس نے اسکی بادشاہی تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوح دل سے دھو ڈالو اور عدل وانصاف میں ہر مذہب وملت کے طریق کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کرسکتے۔ اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ سے مرہون ہوتی ہے۔ جو قوم و ملت قوانین حکومت کی مطیع اور فرمانبردار ہے اس کے مندر اور مزار برباد نہ کئے جائیں۔ عدل وانصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم وستم کی نسبت احسان ولطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ وسنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہوجائے گا جس طرح انسان کے جسم میں مل جل کر چار عناصر کام کر رہے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا کر رکھو اور ان میں اتحاد عمل پیدا کرو، تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ ومامون رہے۔ سرگذشت تیمور کو جو کہ اتحاد وانصاف کا مالک تھا ہر وقت اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم ونسق کے معاملہ میں پورا تجربہ ہو۔"

انگریزوں کو اسی اتحاد سے خوف تھا جس کی بنیاد بابر نے اپنی وصیت کے ذریعہ رکھ دی تھی اور جس پر تمام شاہان مغلیہ نے ہمایوں سے لیکر بہادر شاہ تک تواتر کے ساتھ عمل کیا۔ سر جان میلکم نے لکھا ہے کہ "اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو۔ اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں، فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوت کے استحکام کو متزلزل نہ کرسکے گی۔" مولانا محمد میاں نے لکھا ہے کہ "احترام مذہب، احساس وطنیت، احترام علماء اور باہمی رواداری جو ہندوستانیوں کے قدیمی امتیازات تھے۔ مسلمان بادشاہوں کی طرح انگریزوں کے لئے کبھی مفر نہ ہوتے اگر انگریزوں

کا مقصد ہندوستان میں حکومت کرنا ہو تا ہندوستان کو لوٹنا نہ ہوتا ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان بے کس اور بے حس مزدور کی حیثیت سے روپیہ کماتا رہے اور یورپ کے حوالہ کرتا رہے لہٰذا انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ

۱۔ ہندوستان میں احساس وطنیت ختم ہو۔
۲۔ جن باحمیت حریت پسند جماعتوں یا افراد کا عام ہندوستانیوں پر اقتدار ہے اس کو اٹھایا جائے۔
۳۔ چونکہ مذہبی جماعتوں کا عوام پر اثر تھا اس لئے یہ ضروری ہوا کہ یا تو عوام کو اپنا ہم مذہب کیا جائے یا کم از کم ان کو اپنے مذہب سے متنفر کیا جائے۔
۴۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کئے جائیں جن کی بناء پر وہ بھوکے اور قلاش ہو کر بھی انگریزوں کے وفادار رہیں۔
۵۔ ہندوستانیوں کو ایکدوسرے سے اتنا خائف کر دیا جائے کہ وہ انگریزوں کے وجود کو اپنی سلامتی کے لئے ضروری تصور کریں۔ اور
۶۔ انہیں انگریزی تعلیم دیکر ان کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو بقول لارڈ میکالے "ہم میں اور کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

لہٰذا جب دیوبند تحریک کے بانیوں نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو ان کے سامنے یہ چار مسائل تھے۔ اول یہ کہ حکومت مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے جاہل بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ دوئم ہندوؤں میں فرقہ ورانہ جذبات پھیلا کر انہیں مسلمانوں کے خلاف بنایا جا رہا تھا اور بطور رشوت انہیں ملازمت، تجارت اور سیاست میں غیر معمولی اہمیت دی جا رہی تھی۔ سوئم سرکاری سطح پر سرکاری روپیہ کی مدد اور سرکار کی سرپرستی میں عیسائی مذہب کی تبلیغ جاری تھی اور چہارم لوگوں میں مذہب کے احترام اور علماء کے اقتدار کے خاتمہ کے لئے بڑے پیمانہ پر جدوجہد (ہو رہی تھی۔"

مولانا محمد میاں لکھتے ہیں "دشمنان اسلام اگرچہ اسلام کو فنا کر دینے کا فیصلے کر چکے تھے۔ لیکن اسلام اپنے پاک بازوں کے ذریعے اپنا اعجاز دکھانا چاہ رہا تھا اور بلاشبہ وہ ایک جدید حیات کے لئے مچل رہا تھا۔ انہی پاکبازوں ربانیان تحریک دیوبند کی پیشانیاں سربسجود رہتیں۔ اوقات سحر میں قاضی الحاجات کی بارگاہ میں دست دعا بلند کئے گئے اور ان کی بناء پر لطف الٰہی کا ترشح سر زمین ہند کی طرف منعطف ہوا۔ اس کے بعد مولانا محمد میاں کہتے ہیں کہ "اس تاریک دور میں سیاست اور مذہب کا سب سے بڑا مطالبہ یہی تھا کہ ملت اسلامیہ کو ڈاکوؤں اور رہزنوں اور ایسے افراد سے بچایا جائے جو مار آستین ہوں اور ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعہ مسلمان مسلمان رہ سکے۔ یہی وقت کا اہم ترین فرض تھا۔ اگر مسلمان مسلمان ہوگا۔ اسلام اسلام ہوگا تو سیاست کے انقلابات میں بھی وہ بازی لے جائے گا۔

جناب ایوب قادری نے لکھا ہے کہ "خاندان ولی اللہی کے علمائے جو شاہ عبدالغنی مجددی، مفتی صدرالدین اور مولانا مملوک علی وغیرہ کے تلامذہ پر مشتمل تھی جب ملک کی سیاسی حالت پر نظر کی اور دیکھا کہ مسلمان جلد پنپ نہ سکیں گے اور سیاسی طور سے کوئی پروگرام بنانے کے قابل نہیں ہیں تو انہوں نے علمی و تدریسی پروگرام بنایا تاکہ مذہبی درسگاہ کی شکل میں اپنے نظریات و افکار و تصورات کو پھیلا کر میدان ہموار کریں۔ یوں تو خاندان ولی اللہی کے اثرات تمام ملک میں پھیلے مگر چونکہ اضلاع سہارنپور وغیرہ دلی سے قریب تھے اور اسی زمانہ میں مولانا مملوک علی نانوتوی بحیثیت مدرس اعلیٰ شعبہ شرقی دہلی کالج دہلی میں درس دیتے تھے لہٰذا ان کے علاقہ نانوتہ، دیوبند وغیرہ مقامات کے ذہین طلباء دلی پہنچے اور مولانا مملوک علی نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب کی بدولت تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا۔ ان طلباء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی نہایت ممتاز ہیں۔ ذہین طلبہ کی یہ جماعت شاہ عبدالغنی مجددی یا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھی۔ بعد میں اس جماعت کے مولانا محمد یعقوب اجمیر، مولانا محمد مظہر آگرہ، مولانا محمد احسن اور مولانا محمد منیر بنارس اور بریلی کے کالجوں میں علامہ مشرق

کے اساتذہ بنے، مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمٰن سب انسپکٹر مدارس بنے اور مولانا محمد قاسم صاحب اور
مولانا رشید احمد گنگوہی نے علوم اسلامیہ کی مختلف مقامات پر خدمات انجام دیں اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ درس و تدریس اور
تعلیم اور تعلم سے اس جماعت کا کس قدر گہرا تعلق تھا۔"
مفتی عزیز الرحمٰن نے تذکرۃ المشائخ دیوبند میں لکھا ہے کہ "انگریزوں کی برابر چال باز اور جہاندیدہ مکار
قوم دنیا میں دوسری نہیں ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں جس مکر و فریب سے اس نے اپنی حکومت قائم کی اس کی مثال گرگ
باراں سے کم نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریز یہ بھی جانتا تھا کہ ہندوستان میں جب تک مسلمان من حیث المسلمان موجود
ہیں، انگریزی اقتدار کو ہر وقت خطرہ ہے اس وجہ سے کہ دنیا میں اس کے نزدیک اگر اس کے اقتدار اعلیٰ کو پامال کرنے
والی قوم کوئی ہے تو وہ مسلمان ہے، لہٰذا مسلمانوں کو فنا کے گھاٹ اتارنا، ان کے مذہبی و دینی احساسات کو ختم
کرنا اور ان میں تفریق پیدا کرنا اس نے اپنا اولین فریضہ قرار دیا اور اس کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا۔
عوام کے عقائد خراب کرنے کیلئے عیسائی مشن مقرر ہوئے۔ دنیا پرست اور شیدائے زر طبقہ کیلئے انگریزی
تعلیم کو عام کیا گیا اور حصول اقتدار کے لئے انگریزی کو لازمی قرار دیا گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم سے
دور ہوتے گئے اور ان میں دینی احساسات کم ہونے لگے۔ مشائخ دیوبند جن کو اللہ تعالیٰ نے نور بصیرت سے
نوازا تھا اس سے غافل نہ تھے، وہ سب کچھ دیکھ چکے تھے اور دیکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہوا کس رخ پر چل
رہی ہے اور آئندہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی آگ جب سرد پڑی تو ان
حضرات نے مشورہ کیا آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے اور آئندہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی بقا کیلئے لائحہ عمل تجویز کیا۔

تجویز کردہ لائحہ عمل

جیسا کہ جناب ایوب قادری کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے
فیصلہ یہی ہوا کہ جگہ جگہ مدارس قائم کئے جائیں۔ مولانا محمد
میاں لکھتے ہیں کہ "سیاست کے نام پر کوئی تحریک انگریزی پالیٹکس میں حرام تھی، تنظیم قوم اول تو خود نہایت خطرناک
چیز تھی۔ پھر کسی مقصد کے بغیر تنظیم ناممکن، تنظیم بذات خود کبھی بھی کامیاب نہیں، ہاں کوئی مقصد خود بخود نظم پیدا کر دیا
کرتا ہے۔ محض وعظ و تبلیغ و فتویٰ نویسی موجودہ نسلوں کے لئے مفید ہو جاتی ہے۔ مگر آئندہ کے لئے ان چیزوں
میں تحفظ ملت کی کوئی قوت نہیں۔ ہاں ایک چیز اور صرف ایک چیز تھی جس کا نقشہ عہد رسالت میں صفہ کی صورت
میں نظر آیا تھا۔ اب اس کو مدرسہ کی شکل دیدی گئی۔ یعنی محض اللہ کے توکل پر مذہبی مدارس کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے
جو مسلمانوں کو مسلمان اور اسلام کو اپنی حقیقت کے ساتھ باقی رکھ سکے۔ انگریزی کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں
ایسے مدارس کا قیام نہایت دشوار تھا کیونکہ زمانہ کا انقلاب طبائع کا تغیر، انگریز کا اقتدار ایسے مدارس کو نفرت
و حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن ان مقدس اکابر نے تحفظ ملت اور بقائے اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی،
جفاکشی، فاقہ مستی اور ایثار کو منظور کیا اور محض اللہ پر بھروسہ کر کے خاندان ولی اللہی کے ان جانشینوں نے سرزمین
دیوبند، سہارنپور، مرادآباد، نگینہ، تھانہ بھون، دہلی، آنولہ، امروہہ، کانپور، مظفرنگر، رڑکی، خورجہ،
منگلور اور دہلی میں مدارس کی داغ بیل ڈالدی۔" مولانا محمد میاں نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ
ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند نے مرکزیت حاصل کر لی اور واقعہ تو یہ ہے کہ وہ عظمت حاصل کی جس کی نظیر
سے مسلمانوں کی تاریخ خالی ہے۔ بیشک ہندوستان میں گیارہ سو برس مسلمانوں کی شاندار حکومت قائم رہی مگر کیا
کوئی درسگاہ ایسی ملتی ہے "نہیں" اس اہتمام کے ساتھ حدیث و تفسیر کی تعلیم ہوتی ہو۔ بے شک مدارس لاکھوں تھے۔ چپہ
چپہ پر اسکول تھے مگر افسوس ہندوستان میں دارالحدیث یا دارالتصنیف ایک بھی نہ تھا۔ ہاں بے شک مصر و بغداد
میں بڑی بڑی درسگاہیں تھیں۔ جامعہ ازہر آج بھی اپنی جامعیت میں شہرۂ آفاق ہے۔ لیکن ان تمام کا قیام و بقا
حکومت کے خزانوں پر تھا۔ سوال تو یہ ہے کہ بے کس و بے درماں مفلس قوم کا مدرسہ جو اپنی خدمات میں جامعہ ازہر
جامعہ نظامیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے بازی لے جائے کیا اسلامی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں وجود میں
آیا ہے بلاشبہ یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے جو سرزمین ہند میں ظاہر ہوا اور جس نے تمام عالم اسلامی کو اپنی طرف
متوجہ کر لیا۔

روحانی پس منظر

دارالعلوم دیوبند کا قیام اگر معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے۔ مولانا میاں میاں نے لکھا ہے اور اس کی تائید پروفیسر انوار الحسن نے بھی کی ہے کہ قیام دارالعلوم دیوبند کے بعد اسی جماعت کے رکن (ولی اللہی تحریک) شاہ رفیع الدین جو دارالعلوم دیوبند کے پہلے مہتمم تھے جب حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو وہاں حضرت حاجی امداد اللہ سے عرض کیا کہ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کیلئے دعا فرمایئے تو حضرت حاجی صاحب نے دلچسپ انداز میں فرمایا۔ "سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجدہ ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں قدر کو یہ سرزمین لے اڑی"۔ جناب ایوب قادری نے لکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تحریک دراصل حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک کا ایک تتمہ اور تکملہ ہے جس کی نگرانی اور سرپرستی شاہ ولی اللہ کے دو اجل شیوخ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حجاز میں بیٹھ کر رہے تھے۔ حضرت حاجی صاحب ہر وقت مدرسہ کے حالات سے باخبر رہتے تھے اور اس کی ترقی و فلاح کے لئے کوشش و سعی فرماتے تھے"۔ مولانا محمد میاں نے اس سلسلہ میں حضرت مولانا قاضی محمد اسمٰعیل منگلوری کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو اکابر اولیاء میں گزرے ہیں۔ حضرت قاضی صاحب کے خلیفہ مولانا غالب علی نے مولانا محمد میاں سے کہا کہ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مراد آباد اور مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ آجکل کے مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں۔ حضرت پیر و مرشد (مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب) نے فرمایا تھا کہ یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کئے گئے ہیں۔ مولانا محمد میاں نے اس ضمن میں حضرت حاجی رفیع الدین خلیفۂ خاص حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدنی کا ایک اور واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "آپ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک مدرسہ قائم فرمایا ہے۔ اس مدرسہ میں ایک طالب علم سے شاہ رفیع الدین صاحب کی ملاقات ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد جب دارالعلوم دیوبند قائم ہو چکا اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب مہتمم بنائے گئے تو آپ نے ایک روز ایک طالب علم کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ وہی طالب علم ہیں جن کو میں نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مدرسہ میں دیکھا تھا۔

دارالعلوم کی خصوصیات

دارالعلوم کے دو مقاصد تھے۔ ایک مقصد تو تعلیم و تعلم کا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ایسے کارکنوں کی تربیت کی جائے جو ہندوستان میں فرنگی نظام کے خاتمہ اور عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کریں اس سلسلہ میں جناب ایوب قادری نے ان الفاظ میں نشاندہی کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "دارالعلوم کا مقصد واضح طور پر یہ تھا کہ مسلمانوں میں علوم اسلامیہ کی اشاعت کی جائے اور یہ کام ہر زمانہ میں اہم رہا ہے۔ لیکن اس وقت اس کی اہمیت (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) کئی وجوہ سے بڑھ گئی تھی۔ اول یہ کہ انگریزوں نے مسلمانوں کا سابق نظام درہم برہم کر دیا تھا، اور مالی وسائل برباد ہو جانے کی وجہ سے دو چار کے سوا ملک کے وہ تمام مدرسے بند ہو گئے تھے جن میں دینی تعلیم ہوتی تھی۔ دوئم یہ کہ حکومت کی اعانت سے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ جس کا انسداد ضروری تھا۔ سوئم یہ کہ حکومت نے خود ایک قسم کی تعلیم جاری کر دی تھی اور (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر خیالات، تصورات اور طرز فکر کے اعتبار سے انگریز ہو اور ہندوستانیوں میں حکومت کی ترجمانی کرے (اس صورتحال کا بھی مقابلہ کرنا تھا) چوتھے یہ کہ اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد ملک میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور فکری تنظیم کا کوئی مرکز نہیں رہا تھا۔ اس کا حل پیدا کرنا بھی ضروری تھا۔ اور یہ بدل مدرسوں کی تنظیم کے سلسلہ میں ضروری تھا اور یہی وہ چیز تھی جس کا تعلق دارالعلوم دیوبند کے مقصد ثانی سے تھا یعنی ہندوستان

دارالعلوم کے ذہن میں تھا جن کا اوپر سے انگریزی فوج کا خاتمہ اور یہی وہ بنیادی مقصد تھا جو
اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اور جس کا واضح الفاظ میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے مضمون احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن کی سترھویں قسط میں جو دارالعلوم کی اشاعت جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ میں شائع ہوئی تذکرہ فرمایا مولانا نے اس مضمون میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ اس بات کا مکمل ثبوت ہیں کہ دارالعلوم تعلیم و تربیت کے لئے نہیں بلکہ فرنگی اقتدار کے خاتمہ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور یہی وہ مقصد تھا جو شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، حضرت سید احمد شہید، شاہ محمد اسحاق، شاہ عبدالغنی، مولانا مملوک علی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور سب سے آخر میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ذہن میں تھا۔" مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ "دوسری بات جسے اس سلسلہ کی کڑی سمجھنا چاہیئے یعنی مولانا عبیداللہ سندھی اور ارباب مدرسہ کی کشیدگی پھر کبھی باقی رہی اور یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا چلا گیا کہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عبیداللہ (سندھی) دونوں کا زاویۂ خیال مدرسہ کے ارباب بست و کشاد سے جدا ہوتا چلا جاتا تھا۔ تبلیغ والا مسئلہ تو خیر ایک علمی مسئلہ تھا۔ درحقیقت ان دونوں صفوں میں حقیقی اختلاف سیاسی طریقۂ عمل کے متعلق تھا۔ اب پوری بات تو یاد نہ رہی لیکن ایک دن کچھ ایسا ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (نائب مہتمم) نے فقیر کو یاد کیا۔ اور کہا کہ تم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مل کر دریافت کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والد کا سیاسی مسلک کیا ہے، میں تو حیران ہوں کہ اتنے اہم مسئلہ کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مجھ جیسے کمسن آدمی کا کیوں انتخاب فرمایا، لیکن اب کیا کیجئے کہ واقعہ یوں ہی پیش آیا۔ شاید ظہر کی نماز کے بعد کا واقعہ ہے کہ مسجد کے احاطہ میں ایک کمرہ تھا جسے اس زمانہ میں دارالتصنیف کا نام دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں حضرت شیخ الہند اپنی زندگی کے آخری مشغلہ یعنی ترجمہ قرآن مجید کا کام کچھ دیر کیا کرتے تھے۔ فقیر تو اسی احاطہ کا باشندہ ہی تھا۔ نماز کے بعد حضرت اس کمرے میں تشریف لے گئے، تنہا تھے، موقع پا کر فقیر بھی پیچھے سے حاضر ہو کر عرض رسا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے، جیسا کہ قاعدہ تھا، خندہ جبینی کے ساتھ فرمایا گیا کہ آؤ کیا کہنا چاہتے ہو۔ بیٹھ گیا اور جو پیغام میرے سپرد کیا گیا تھا اسے پہنچا دیا گیا، سنتے رہے اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے، اور اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند جن کو وہ حضرت الاستاذ کے لفظ سے یاد کرتے تھے، انہی کا نام لیکر فرمایا کہ حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا، مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہو جائے۔ چالیس سال پہلے کی بات ہے، روایت بلفظہ کی توقع تو فضول ہے۔ حضرت والا کی تقریر سے دل میں جو اثر اس وقت قائم ہوا تھا، اس اثر کے نتائج کی تعبیر اپنے الفاظ میں کر دی ہے۔ تقریر کی مدت کافی تھی لیکن حاصل یہی تھا، آخر میں ارشاد ہوا کہ تعلیم و تعلم، تدرس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے۔ جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا، اس کے بعد دو راہیں مختلف ہو گئیں، ایک راہ تعلیم و تعلم و دینی نشر و اشاعت کی تھی، اور دوسری راہ وہی تھی جسے بالآخر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمائی اور اسی مسلک کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔ خیال آتا ہے کہ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا ادا کرتا رہا، اب آخری کام یہی رہ گیا ہے جسے اپنی حد تک تو میں کر گزروں گا اور اسی کو وہ کر گزرے۔" مولانا ایوب قادری نے لکھا ہے کہ "دارالعلوم دیوبند کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن سے اس کے مقاصد و اغراض پر بہت صاف روشنی پڑتی ہے۔ اس دور میں محض بادشاہوں اور امراء کی امداد سے مدرسے چلتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جو تاسیسی اصول متعین فرمائے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سرکاری اور امراء کی مدد مدرسے کیلئے مضر ہو گی۔ یہ اصول خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ اگر محض دینیات کی کتابی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند قائم ہوا ہوتا تو نہ امراء کی مالی اعانت اس کے لئے مضر ہو سکتی

تھی اور نہ حکومت کی امداد۔ دارالعلوم کو ہر قسم سرکاری سے آزاد رکھنے کے لئے سرکاری امداد قبول کرنے سے احتراز کیا گیا اور امراء کی امداد سے بھی اسی لئے گریز کیا گیا کہ وہ لازماً حکومت کے زیر اثر رہیں گے۔ مدرسہ کے اخراجات کی کفالت کے لئے ان لوگوں کے تھوڑے تھوڑے چندے کو پسند کیا گیا جو ناموری نہ چاہتے ہوں۔ اس قسم کے عام چندوں سے مدرسوں اور قومی اداروں کو چلانا اس وقت بالکل نئی بات تھی پھر اس کو بھی منع کیا گیا کہ مدرسہ کے لئے جاگیریں، کارخانے یا اوقاف حاصل کر کے اس کی آمدنی مستقل کی جائے۔ غالباً مقصود یہ تھا کہ عام چندے کی سعی کے لئے سفرائے مدرسہ عام لوگوں سے تعلق پیدا کریں تاکہ جن سے چندہ وصول ہو وہ ان کے خیالات سے بھی متاثر ہوں اور اس طرح دارالعلوم کو عمومی اور عوامی تائید حاصل ہوتی رہے۔ اس وقت کے حالات میں کوئی سیاسی تحریک جاری نہیں ہو سکتی تھی۔ ان علماء نے دارالعلوم دیوبند ہی کو ایک تحریک بنا کر جاری کر دیا۔ جس پر عرصۂ دراز تک کسی کو تحریک کا شبہ نہ ہوا۔ مدرسے کے انتظامات کی بنیاد شوریٰ پر رکھی گئی۔ اور اس غرض کے لئے ایک مستقل مجلس شوریٰ قائم کی گئی اور مہتمم مدرسہ کو اس کا پابند کر دیا گیا کہ وہ اکثریت کی رائے کے مطابق کام کرے۔ اس وقت تک ہندوستان میں دینی مدارس کے انتظامات شخصی اور خاندانی ہوتے تھے۔ اس نئی تدبیر سے ایک تو دارالعلوم دیوبند کی بڑی وسعت کے ساتھ بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔ دوسرے اس کے انتظامات میں جمہوری انداز بھی پیدا ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنے تحریری اصولوں میں یہ بھی ہدایت فرمائی کہ جو وارد و صادر علم و عقل رکھتے ہیں اور مدرسے کے خیر اندیش ہوں ان سے بھی مشورہ کیا جائے مولانا کی یہ تجویز بھی بہت ہی دلچسپ اور مفید ہے وہ زمانہ اخبارات کا عوامی جلسوں کا اور اخباری بیانات کا نہیں تھا۔ اس لئے کسی معاملہ میں رائے عامہ کے متعلق علم حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہ تھی، اور نقد و تبصرہ کی بھی نہیں۔ لہٰذا مولانا نے مشورے کے دائرے کو تمام ملک کے صاحب عقل و رائے کی حد تک وسعت دے کر اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اور پھر جب غیر رکن صاحب عقل و عمل کی رائے کی یہ وقعت ہو تو پھر حالات کی تفتیش اور تنقید و نکتہ چینی سے بھی ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اس تجویز سے تعمیری نکتہ چینی کی راہ کھل گئی۔ جو ہر ادارے کی ترقی اور اس کے ہمدردوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔"

جناب عزیز احمد قاسمی نے بھی یہ لکھا ہے کہ "اس وقت کے برطانوی ہند میں فاتح قوم (انگریز) کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دل و دماغ کو یورپین سانچوں میں کس طرح ڈھالا جائے جس سے برطانویت اس ملک میں جڑ پکڑ سکے۔" اس ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ' نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے فیصلے سے یہ نعرہ بلند کیا کہ "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں، جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے لحاظ سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔ اس کا ایک ثمرہ یہ بھی نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور بات یک طرفہ نہ رہی۔ بلکہ ایک طرف اگر تربیت شعار افراد نے جنم لینا شروع کیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز طبقہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہو گیا جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے ملک کو بہا کر لے جائے گا۔ بلکہ اگر اس کی رو کا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے جائیں گے جو اسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند صفحہ ۱۹)

تاسیسی اصول

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جن تاسیسی اصولوں کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے وہ رسالہ القاسم کے دارالعلوم نمبر مجریہ ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ اصول آٹھ نکات پر مشتمل ہیں جو درج ذیل ہیں اور ان کی سرخی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے لئے ہیں بلکہ ان تمام مدارس کے لئے بھی ہیں جو تحریک ولی اللہی کے کارکنوں نے اس وقت سارے ملک میں قائم کئے تھے۔

۱۔ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

۲۔ بقار طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔
۳۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی نوعیت خوبی اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوعیت آئے گی کہ اہل شوریٰ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ ہو۔ سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہو۔ سامعین اس کو بہ نیت نیک سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہوں بدل و جان قبول کریں گے اور نیز اس وجہ سے (یعنی اپنی بات کی پچ نہ ہو بلکہ مفاد مدرسہ پیش نظر ہو) ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل شورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا۔ نہ وہ پھر اہل مشورہ سے معترض ہو سکتا ہے۔
۴۔ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔
۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز جو مشورہ سے ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔
۶۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں۔ جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ یا کسی امیر المحکم العدل وغیرہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا یا رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے گی۔
۷۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔
۸۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے۔ جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا موجب معلوم ہوتا ہے۔

اعتماد خداوندی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا منشا یہ تھا کہ دارالعلوم کے منتظمین کی نظر وسائل اور ذرائع کی بجائے ہمیشہ خالق کائنات کے فضل و کرم پر مرکوز رہے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب جو دارالعلوم کی تاسیس کے زمانہ سے اس کے شریک کار تھے اسی خصوصیت کی نسبت فرماتے ہیں "اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لئے کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا، پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ، یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیاء ہو جائے گا۔ جناب سید محبوب رضوی نے اپنے مضمون "دارالعلوم دیوبند کا اعتماد خداوندی" شائع شدہ رسالہ دارالعلوم اگست ۱۹۵۶ء میں لکھا ہے کہ "عام طور پر کسی ادارے کے کاموں میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے آمد میں صرف کی کوئی حد معین ہو۔ مگر دارالعلوم کا آغاز بہ ظاہر جس بے سروسامانی کے ساتھ محض اللہ کے توکل پر عمل میں آیا تھا جو آج تک اس کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی مستقل دوامی آمدنی کے میارہ کے مقرر کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔ یہی اعتماد خداوندی ہی دراصل دارالعلوم دیوبند کا سب سے بڑا سرمایۂ اعزاز ہے۔ اور دراصل یہی وہ سرمایہ توکل ہے جس کے اعتماد

اور بھروسہ پر بڑے بڑے کام دارالعلوم میں شروع کر دیئے گئے۔ اور وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورے ہو گئے۔ دارالعلوم کے خزانہ میں کسی وقت بھی اتنی رقم نہیں رہتی کہ دو تین ماہ کے مصارف کی کفالت کر سکے۔ دارالعلوم کے آمد و صرف کی بنیاد ہمیشہ توکل اللہ سے حسن ظن، اعتماد اور توقع پر قائم رہی ہے۔ دارالعلوم کی زندگی کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے کہ اس میں آمدنی کی قلت و کثرت پر کبھی نظر نہیں رکھی گئی۔ جس کام کے اضافہ یا جس کام کے اجراء کی ضرورت محسوس ہوئی اس کو شروع کر دیا اور یہ قدرت خداوندی کا کرشمہ ہے کہ دارالعلوم کو کبھی اپنے متوقع تخمینے کو پورا کرنے اور اپنے مقاصد و عزائم کی تکمیل میں شرمندہ تعبیر اور مایوس و ناکام نہیں ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں ہمیشہ اکابر دارالعلوم کی یہی رائے رہی ہے کہ دارالعلوم کی سالانہ آمدنی حقیقتاً بقدر مصارف ہوتی ہے جس قدر مناسب اور ضروری اخراجات میں اضافہ ہوتا ہے اسی مناسبت سے آمدنی بڑھ جاتی ہے" (دارالعلوم کا اعتماد خداوندی۔ صفحہ ۳۰ رسالہ دارالعلوم۔ اگست ۱۹۵۶ء) دارالعلوم کے مہتمم اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے مولانا حافظ محمد احمد نے ۱۳۱۶ھ کی مجلس شوریٰ کے سامنے رپورٹ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "کاروبار مدرسہ میں ابتدا سے اسباب ظاہر پر نظر نہیں تھی بلکہ اللہ کے فضل اور بھروسہ پر نظر رہتی تھی، ہمیشہ مدرسہ کے حسابات و ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا۔ بمقتضائے ضرورت و استحقاق مدرسین کی ترقیات ہوتی تھیں۔ موافق دستور قدیم اب بھی یہی طرز اختیار کرنا چاہیے کیونکہ بحمد اللہ ہمارے آمدنی ہمارے اخراجات کے تابع رہی ہے۔ جس قدر اخراجات ضروریہ حسب ضرورت مدرسہ اختیار کئے گئے۔ اسی قدر آمدنی میں ترقی ہو کر آمدنی خرچ کے لئے مکتفی ہوتی رہی ہے۔ ہمارے اخراجات تابع آمدنی نہیں بنائے گئے۔ پس جبکہ عادت اللہ ہمارے مدرسہ کے لئے اسی طرح قائم ہو چکی ہے جس کا تجربہ اور مشاہدہ ہے تو اس حالت میں اہل مدرسہ کو اپنی عادت بدل کر ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم بن جانا مناسب شان عباد نہیں"۔ جناب محبوب رضوی آگے چل کر اپنے اسی مضمون میں جس کا اس ضمن میں تذکرہ ہو رہا ہے لکھا ہے کہ ۱۳۶۳ھ کا حالیہ واقعہ لوگوں کی نظر میں ہے جس کا دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے کی وجہ سے ملازمین دارالعلوم کی ضرورتوں کے پیش نظر گرانی الاؤنس کا دیا جانا تجویز ہوا۔ جس کی مقدار بارہ ہزار روپیہ سالانہ تھی، تو کارساز حقیقی نے بمبئی سے جس نے اب تک دارالعلوم کی اعانت میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا چودہ ہزار روپیہ کا انتظام فرما دیا۔ گویا دارالعلوم کو بارہ ہزار روپے دیکر بھی دو ہزار بچ گئے۔ اسی سن میں طلبہ کے وظائف میں بھی اضافہ ہوا تو آمدنی بھی اسی تناسب سے بڑھ گئی، ۱۳۶۳ھ کے بجٹ میں مصارف کا اندازہ ۷۷ ہزار روپیہ کیا گیا تھا مگر غیر معمولی گرانی کے سبب سے جب مصارف میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوا تو آمدنی بھی ڈھائی لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے قبل دارالعلوم کو کبھی اتنی آمدنی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب امداد غیبی نہیں تو اور کیا ہے۔

بانی دارالعلوم کے پوتے حضرت مولانا محمد طیب نے ۱۳۶۶ھ میں جلسہ تقسیم انعام میں غیبی امداد کا جس طرح تذکرہ فرمایا۔ وہ روئیداد جلسہ میں موجود ہے۔ الفاظ یہ ہیں "مجھے اپنے ۲۵، ۲۶ برس کے زمانہ اہتمام کا جو تجربہ ہے اس میں یہ چیز شدت کے ساتھ محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارے کو چلا رہی ہے اور اس کا دار و مدار ظاہری جد و جہد سے بالاتر کوئی غیبی قوت ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے گو ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے۔ عدم اعتنا دین کے اس دور میں جب کہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے اس دارالعلوم کا نہ صرف قائم رہنا بلکہ ترقی کرتے رہنا بلاشبہ اس کی علامت ہے کہ یہ من جانب اللہ قائم ہے چنانچہ جب کبھی مخالفین کی وجہ سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال میں چندہ نسبتاً زیادہ ہی رہا۔ اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور پر فتن میں دارالعلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد و اعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے، غالباً ۱۳۴۹ھ کا واقعہ ہے اور یہ میرے اہتمام کا پہلا سال تھا کہ مولوی گل محمد خان صاحب جو خزانہ کے تحویل دار تھے اور تنخواہ کی تقسیم کا کام انہی سے متعلق تھا، رجب کی آخری تاریخ میں میرے

پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی بھی نہیں ہے اور پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کا تقسیم کرنا ہے میں نے کہا کہ اس میں فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا۔ ان کو رخصت کر کے میں نے حضرات مدرسین کو بلا کر دریافت کیا کہ آپ دارالعلوم میں کیوں پڑھاتے ہیں اور کیا مقصد ہے۔ آیا دین کی خدمت مقصود ہے یا تنخواہ حاصل کرنا۔ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے حاشا وکلا تنخواہ پر ہماری کبھی نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے جواب دیا کہ فاقے کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ آپ مطمئن رہیں دارالعلوم بھی ان شاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہ بھی ملتی رہے گی، خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ دعا کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے میں اللہ ہمیں رسوائی سے بچائے سب نے مل کر خضوع وخشوع کے ساتھ دعا کی جس کا اگلے دن ہی یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کی تقسیم کا وقت بھی نہیں آیا تھا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیجدیئے۔ دو ہزار روپیہ کلکتہ کے ایک تاجر نے بیمہ کے ذریعہ بھیجے تھے اور پانچ سو روپیہ میرٹھ کے ایک مشہور آرمی کنٹریکٹر خان صاحب رشید احمد خاں صاحب نے خود دارالعلوم میں تشریف لا کر عطا فرمائے۔ غرض کہ دارالعلوم کی بنا بھی غیبی امداد پر ہے اور کاموں کا انصرام بھی من جانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اسی طرح دارالعلوم اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے۔"

(دارالعلوم کا اعتماد خداوندی۔ رسالہ دارالعلوم اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۲، ۳۳) جناب محبوب رضوی کے تذکرہ والا مضمون کا یہ حصہ بھی قابل غور ہے جس میں دارالعلوم کے تاسیسی اصولوں کی دفعہ ۶ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب رضوی تحریر فرماتے ہیں کہ "سچ تو یہ ہے کہ خود اکابر دارالعلوم کی ذات مقدسہ کا تقاضہ بھی تھا کہ نظر مادی اسباب ووسائل کی بجائے قادر مطلق وتوانا کے فضل وکرم اور کارساز حقیقی کے توکل پر ہو جس کا دستور العمل کی دفعہ ۶ (مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بات صاف طور پر محسوس ہوتی ہے کہ دارالعلوم کی پوری زندگی میں حق تعالیٰ شانہ کا اس کے ساتھ ایک خاص طرح کا معاملہ رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں جب غلہ کی دستیابی کے مسئلہ نے پیچیدہ شکل اختیار کی تو دارالعلوم کی سال بھر کی غذائی ضروریات کے لئے ریاست بھاولپور سے ہر سال پانچ ہزار من غلہ آنا شروع ہو گیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان و پاکستان کی کرنسی میں تفاوت پیدا ہوا تو بھاولپور سے جو پاکستان میں واقع ہے غلہ کی آمد میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ مگر فوراً ہی اس کا یہ حل نکل آیا کہ قرب وجوار کے اضلاع سے غلہ کی فراہمی شروع ہو گئی اور اب بحمد اللہ ہر سال اتنا غلہ دارالعلوم کو فراہم ہونے لگا کہ جو زراعت کے ساتھ اس کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہوتا ہے۔ زراعت پیشہ طبقے میں دارالعلوم کی امداد واعانت ایک ایسی سعادت سمجھی جاتی ہے جس کے حصول کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں پائی جاتی ضرور رہی ہے۔ یہ واقعات بتلاتے ہیں کہ مشیت الٰہی ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کی تائید واعانت کرتی رہی ہے۔ اور وہ اتنی طاقتور ہے کہ اسباب وذرائع کی محتاج نہیں بلکہ ان پر متصرف ہے۔"

دارالعلوم کی بنیاد کے بعض گمنام گوشے

دارالعلوم کی بنیاد کے چند غیر معروف گوشے کے تحت جناب مناظر احسن گیلانی کا جو مضمون "دارالعلوم" کی اشاعت جون ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اس میں بعض دلچسپ باتوں کا اظہار ہوا ہے منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ دارالعلوم کے چندہ دہندگان میں ہندو بھی شامل تھے۔ جناب گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ "سب سے پہلے یہ چیز سامنے آئی کہ چندہ کے سلسلہ میں چند ضوابط کا تذکرہ ہر جلسہ روداد (ن) میں کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک قاعدہ جس کا ذکر سب سے پہلے التزاماً کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیت ملت ومذہب ۱۸۸۳ء کی پہلی روداد ہی سے مسلسل یہ درج ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہر سال کی روداد میں اس کا التزاماً اعادہ کیا گیا ہے چنانچہ جب چندہ دینے والوں کی فہرست کو دیکھنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوگئی کہ اتفاقاً بطور وقتی عطیہ کے نہیں بلکہ باضابطہ چندہ دہندوں میں ہندوؤں کے نام بھی اس فہرست میں نظر آ رہے ہیں۔ سرسری طور پر تلسی رام، پنڈت سری رام، لالہ بیج ناتھ، رام سہائے، لالہ الیشری پرشاد، رام لعل کے نام درج ہیں۔ توجہ کے ساتھ چندہ دہندوں

کی طویل فہرستوں کا اگر مطالعہ کر لیا جائے تو مزید اضافہ کی توقع ہے۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لینے والوں نے بھی کسی مذہب و ملت کی قید نہیں رکھی۔ اور دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی امداد میں اور کوئی نہیں تو کم از کم ملک کے ہندو باشندے شروع ہی سے شریک تھے حیرت ہے کہ اس پندرہ سال کے عرصہ میں ایک حبہ بھی حکومت کی طرف سے نہ مدرسہ والوں نے قبول کیا اور نہ ہی حکومت کو اس کی توفیق ہوئی۔ مگر ہندوؤں کی مالی امداد نہ رد کی گئی اور ان لوگوں نے بھی بخوشی و بہ رضا امداد دی۔" (یہ وہ دور تھا جب ہمارے اکابر کی نظر میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن انگریز تھے)

دوئم "اس سلسلہ میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کتابوں کی ضرورت مدرسہ کی طرف سے جب بھی پیش کی گئی، اور بتدریج ایک رواج یہ ہو گیا کہ اپنے اپنے مطابع میں چھپنے والی کتابوں کے ایک دو نسخوں کا پیش کرنا بعض ارباب خیر نے بطور التزامی قاعدے کے ضروری قرار دیا تو آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس باب میں پیش قدمی کی سعادت مشہور ناشر منشی نولکشور کو ہوئی۔ ان روداد میں ان کی کتابی امداد کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور یہ بڑا نیک فال ثابت ہوا۔ بعد کو مسلسل ہر سال مطابع میں چھپنے والی کتابیں مدرسہ میں داخل ہوتی رہیں۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ آج دارالعلوم میں ہزارہا ہزار کتابوں کا غیر معمولی ذخیرہ جو جمع ہو گیا ہے کہ ستر ستر، اسی اسی طالب علم بھی کسی جماعت میں اگر شریک ہیں تو ہر ایک کے لئے کتاب کا نظم مدرسہ ہی کی طرف آج باسانی جو ممکن ہو گیا ہے، اس کا ابتدائی نمونہ نیک دل ہندو منشی نولکشور ہی نے پیش کیا تھا۔"

سوئم یہ کہ منشی نولکشور نے کتابوں ہی سے امداد نہیں کی بلکہ اپنا اخبار "اودھ اخبار" بھی دارالعلوم کے نام جاری کیا ان کے علاوہ اور بھی ہندوستانی اخبارات دارالعلوم کے نام آتے جن میں بڈھانہ کے اخبار سفیر اور اس کے مالک راؤ امر سنگھ بھی قابل ذکر ہیں۔ دارالعلوم کی سنہ ۱۲۹۴ھ کی روداد میں ان دونوں کا التزام کے ساتھ شکریہ ادا کیا گیا۔ الفاظ یہ ہیں "جناب منشی نول کشور مالک اودھ اخبار لکھنؤ اور جناب راؤ امر سنگھ مالک اخبار سفیر بڈھانہ کا بالخصوص شکریہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں مگر آفریں صد آفریں ان کی سخاوت و عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں۔ جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور سب صاحبوں کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو دم بدم ترقی عطا فرمائے اور ان کی قوت و آزادی (جو اس وقت سخت خطرہ میں تھی) کو قائم رکھے۔ اور آئندہ بھی حضرات موصوف سے امید کی جاتی ہے کہ ایسی ہی عنایات سے مدرسہ کو ممنون و مشکور فرماتے رہیں اور جملہ کارکنان مدرسہ ہذا کو اپنا دعاگو اور خیر خواہ سمجھیں۔"

چہارم یہ کہ دارالعلوم میں جو ایک خالص اسلامی ادارہ تھا ہندو بھی تعلیم پاتے تھے۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے اپنے مذکرہ بالا مضمون میں آگے چل کر اختتام فرمایا کہ "اور اس سے بھی عجیب تر انکشاف یہ ہے کہ یعنی علاوہ مذکورہ بالا معلومات کے سنہ ۱۲۹۴ھ کی روئیداد میں منجملہ اور باتوں کے یہ اطلاع بھی دی گئی کہ "مسلمانوں کے ساتھ اسی دارالعلوم دیوبند میں بعض بعض ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں" گویا مالی امداد کے سلسلہ میں کسی مذہب و ملت کی خصوصیت نہیں رکھی گئی تھی۔ اس طرح دارالعلوم کی تعلیمی صفیں بھی ہندوستان کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ مختص نہیں تھیں یہ صحیح ہے کہ مذہبی تعلیم ہی دارالعلوم کا سب سے بڑا نصب العین ہے اور یہیں سے جنگ آزادی کے کارکنوں کی تربیت کا سلسلہ جاری رہا لیکن چھوٹے درجوں میں جہاں اردو، فارسی اور ریاضی کی تعلیم ہوتی تھی ہندو بچوں کو بھی تعلیم دی گئی۔"

دارالعلوم کی شاخیں

جناب مولانا محمد میاں کے حوالہ سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا لیکن ان تمام مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ خود مدرسہ دیوبند کے اکابر بھی یہی چاہتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کو ہندوستان کے علمی مدارس میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے عزیز شاگرد حضرت مولانا فخر الحسن کی خورجہ سے جدائی اس لئے

منظور فرمائی کہ وہ مدرسہ نگینہ کے صدر مدرس ہو کر اسے دارالعلوم دیوبند کا ایک ذیلی ادارہ بنا دیں۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے اپنے مضمون "دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کے چند غیر معروف گوشے" میں ان کوششوں کا ذکر کیا، جو اس ضمن میں کی گئیں اور ان مقامات کی نشاندہی کی جہاں دارالعلوم دیوبند کے تعاون سے اور اس کی زیر نگرانی دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ جناب گیلانی نے اپنے اس مضمون میں جو دارالعلوم کی اشاعت مورخہ جون ۱۹۵۳ء کے صفحہ ۲۰ سے ۲۸ پر پھیلا ہوا ہے۔ لکھا ہے کہ "دوسری بات جس کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے ارباب بست و کشاد نے ہمیشہ اپنی توجہ رکھی اور جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی یہ تمنا تھی کہ دارالعلوم دیوبند بجائے کسی مقامی مدرسہ کے ایک مستقل ملک گیر جامعہ اسلامیہ کا قالب اختیار کرے۔ مدرسہ کے تیسرے سال ہی کی روداد کے آخر میں یہ اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ "نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں اس امر پر کہ اکثر باہمت اشخاص نے اجراء مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بہ مقامات مختلفہ دہلی، میرٹھ، خورجہ، بلند شہر، سہارنپور، دکنی، وغیرہ جاری فرمائے ہیں اور دوسری جگہ مثلاً علی گڑھ وغیرہ میں اس کار کی تجویزیں ہو رہی ہیں"، مذکورہ بالا ہند گیر تحریک کی طرف ان الفاظ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ "اور امید کرتے ہیں کہ ہم کو بھی وہاں کے حالات و حساب و کتاب سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے مہتمم کرتے ہیں مطلع فرماتے رہیں تاکہ جو عمدہ انتظام ان مدارس میں تجویز ہو یہاں بھی جاری کئے جایا کریں اور یہاں سے وہاں"، اور آخر میں ہے" اور نتیجہ اس نیک تدبیر کا یہ ہوگا کہ انتظام سب جگہوں کے قریب یکساں ہو جائیں گے" (روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۵ھ) اگرچہ دل کی اس آرزو کا اظہار زمانہ کے خاص حالات کے بنا پر جتنی بلند امنگوں کے ساتھ چاہئے تھا نہیں کیا گیا (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ لیکن آئندہ کی رودادوں میں التزاماً مختلف الفاظ میں اس تنظیم عام کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بالآخر ۱۲۸۹ھ کی روداد میں یہ خبر دی گئی کہ "مولوی قاری عبدالعلی صاحب نے کیفیت مدرسہ اسلامیہ امرتسر مدرسہ ہذا میں بھیجی جس کو دیکھنے سے دل کو فرحت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور اس کے استقلال میں برکت فرمائے۔ آمین ثم آمین"۔ قیام مدرسہ کے ساتویں سال گویا امرتسر پنجاب کے ایک مدرسہ سے گونہ ربط پیدا ہوا۔

اور اس کے بعد ۱۲۹۱ کی روداد میں قصبہ تھانہ بھون میں مدرسہ کے قیام کی اطلاع دیتے ہوئے یہ خبر دی گئی کہ "سال گذشتہ سے اس مدرسہ کا انتظام زیر نگرانی حسب ارشاد حافظ صاحب موصوف (بانی مدرسہ جن کا نام حافظ عبدالرزاق تھا) سپرد مدرسہ دیوبند کیا گیا اور دیوبند کے ارباب جملہ انتظامیہ نے بخوشی خاطر اس کی نگرانی قبول فرما کر مدرسہ تھانہ بھون کو شاخ مدرسہ قرار دیا اور نگرانی اس کی سپرد بندہ مہتمم فرمائی" اور اس کے بعد بطور ضمیمہ کے دارالعلوم دیوبند کی روداد کے ساتھ تھانہ بھون کے اس مدرسہ کی روداد بھی التزاماً شائع ہونے لگی۔ پھر ۱۲۹۲ھ کی روداد میں علاوہ تھانہ بھون کے دوسرے مقامات کے مدرسوں کے الحاق کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا "اس مدرسہ کی چند شاخیں بھی بعض اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں، منجملہ ان سے ایک انبیٹھہ پیرزادگان ضلع سہارنپور میں اور دو تھانہ بھون و مظفر نگر کا ضلع مظفر نگر میں اور ایک گلاؤٹھی ضلع بلند شہر (صفحہ ۳۵ روداد ۱۲۹۳ھ) اور ۱۲۹۴ھ کی روداد میں اعلان کیا گیا کہ "بفضلہ تعالیٰ سال گذشتہ میں اس مدرسہ کی چار شاخیں تھیں اور سال حال پانچویں ایک شاخ قصبہ کرانہ کی بیٹھائی ہوگئی" اسی روداد میں ذکر ہے کہ ان شاخوں میں تھانہ بھون کے مدرسہ کی تقسیم تنخواہ وغیرہ تک کا تعلق دارالعلوم ہی سے ہے اور باقی شاخوں میں "مثل تقرر مدرس وغیرہ سپرد مدرسہ ہذا ہے"۔ اور یوں آئندہ بالالتزام دارالعلوم کی روداد کے ساتھ ان الحاقی مدارس کی سالانہ رودادیں بھی شائع ہونے لگیں۔ اور بعد کی رودادوں میں مسلسل اس کی اطلاعیں ملتی ہیں کہ ان الحاقی مدارس کے امتحان اور انتظام وغیرہ کی نگرانی کے لئے دارالعلوم سے نمائندے بھیجے گئے۔

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے اپنی مشہور تصنیف انوار قاسمی صفحہ [illegible] پر تحریر فرمایا کہ مولانا نانوتوی کی سب سے بڑی علمی شان کا مظہر تو دارالعلوم دیوبند ہے لیکن آپ ہی کی برکت سے ہندوستان کے دوسرے حصوں اور شہروں میں بھی عربی مدارس قائم کئے گئے اور ان سب کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب تھے کیونکہ آپ ہی کے نقش قدم پر دوسروں نے چلنا شروع کیا۔

دارالعلوم کے بعد سہارنپور میں مظاہر العلوم کو مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے یکم رجب

۱۲۸۳ھ میں محلہ قاضی میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی صاحب انبیٹھوی پہلے مدرس ہوئے۔ سب سے پہلے طالب علم مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین ہوئے۔ پھر مولانا احمد علی محدث نے مدرسہ کی مدد فرمائی۔ شوال ۱۲۸۳ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی صدر مدرس ہوئے۔ مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے نام پر شاہی مسجد مراد آباد میں جاری ہوا۔ پھر گلاؤٹھی میں آپ ہی کی کوشش سے (اوپر بھی ذکر ہو چکا ہے) مدرسہ اسلامیہ کا آغاز ہوا۔ اور اس میں آپ کے مشہور شاگرد مولانا احمد حسن امروہوی صدر مدرس تھے۔ ادھر نگینہ ضلع بجنور کی جامع مسجد میں ایک دینی مدرسہ کھول دیا گیا۔ راقم الحروف نے بھی اس میں ایک سال تعلیم پائی اور میاں جی سراج الدین صاحب سیوہاروی سے مصدر فیوض پند نامہ، رقعات عالمگیری پڑھی۔ ابتدا میں یہاں مولانا فخر الحسن گنگوہی شاگرد مولانا نانوتوی تعلیم دیتے رہے۔ ان مدارس کی نگرانی اور رہنمائی کا احساس ارباب دیوبند کو اتنا تھا کہ انہوں نے ۱۲۹۳ھ کی سالانہ رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ "ارباب مشورت مدرسہ دیوبند کے نزدیک جن کے سپرد اب ان مدارس کا امتحان رکھا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر مہتممان شاخ ہائے مذکور اپنے اپنے مدارس کے چندے سے تھوڑی تھوڑی سی امداد فرمائیں تو ان مدارس کے امتحان اور نگرانی تعلیم کے لئے ایک گروہ اور مقرر کیا جائے جو ہر سال یا دوسرے مہینے جیسا کہ اتفاق پڑے ان مدارس کا امتحان لیا کرے اور جو کسی قسم کی ابتری یا خرابی دیکھا کرے تو اس کے دور کرنے کی حسب رائے مہتممان تدابیر کیا کرے (صفحہ ۳۴) کیرانہ ضلع مظفر نگر میں بھی (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) جہاں کی مشہور ہستی مولانا رحمت اللہ کیرانوی تھے مدرسہ عربی جاری کیا گیا اور علاوہ عام چندہ کے یہ تجویز بھی کی گئی کہ چونکہ یہاں کے اکثر رئیس بہ کثرت ہیں اگر فی ماہ ایک من غلہ مقرر کیا جائے تو بہتر ہے چنانچہ اس پر اکثر اصحاب راضی ہو گئے" روداد دار العلوم دیوبند ۱۲۹۴ھ صفحہ ۶۰) اور ان الحاق شدہ مدارس کی نگرانی کی ذمہ داری ارباب دار العلوم نے جس شدت کے ساتھ محسوس کی اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ خود دار العلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ان مدارس کا دورہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ایک دورہ کا ذکر دار العلوم کی سالانہ رپورٹ ۱۲۹۳ھ کے صفحہ ۴۲ پر یوں موجود ہے "مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول نے بہ ہمراہی مہتمم مدرسہ دیوبند اس مدرسہ (گلاؤٹھی) کا امتحان لیا" حضرت شیخ الہند کے والد جناب مولانا ذوالفقار علی صاحب نے اپنے رسالہ "ہدیۂ سنیہ" میں دار العلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اور کتنے ہی مدارس دار العلوم دیوبند کی طرح جاری کئے گئے اور اس کی طرز پر بنائے گئے اور یہ سب مولانا قاسم کے انفاس کی برکتوں کا نتیجہ ہیں" حضرت مولانا رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں "اس مدرسہ دیوبند کو کیونکہ اس چشمۂ فیض کے منبع اور اس آب حیات کے مصدر و مورد اس آفتاب عالم تاب کے مظہر آپ ہی تھے۔ اللہ اللہ اس کار خیر کی ترقی میں کیسی کیسی کوششیں لگائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شمس الاسلام (مولانا محمد قاسم صاحب) ہی کے حسن سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ ملک ہند میں بہ ایں مہم منتہائے اسلام و اسلامیان علم دین کو کس زور و شور سے پھیلایا کہ باید و شاید (انوار قاسمی صفحہ ۱۴۴) دار العلوم کے اکابر کی خواہشات کے باوجود دار العلوم کو ملک گیر یونیورسٹی بنانے میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ انگریز حکومت دار العلوم کے وجود کو اپنے لئے خطرناک تصور کرتی تھی اس لئے ارباب دار العلوم کو بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے کام کو آگے بڑھانا تھا لیکن بقول مولانا مناظر احسن گیلانی روہیل کھنڈ کے بعض شہروں اور قصبوں کے مدارس کا تعلق دار العلوم سے قائم ہے" ہاں جب حالات نے اجازت دی تو دار العلوم کے ہمہ گیر اور ملک گیر اثرات کو پائیدار بنانے میں پوری پوری سعی کی گئی اور یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مدارس قائم ہوئے تو مدرسین کی ضرورت کے سلسلہ میں برابر دار العلوم سے رجوع کیا گیا۔ جناب گیلانی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے لکھا ہے کہ "تعلیمی مرکز تو نہ کھلے ہاں دار العلوم کو علمی مرکز خیال کر کے ملک کے اطراف و جوانب سے درخواستیں چلی آتی ہیں کہ اپنے یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے کسی کو بھیجئے جس کا سلسلہ بحمد اللہ اس وقت تک جاری ہے اس زمانہ میں حال یہ تھا کہ قریب کے علاقوں ہی میں نہیں بلکہ لکھا ہے کہ ریاست بھاولپور ملک پنجاب اور راجپوتانہ ملک اور ملک گجرات سے مدرسہ ہذا میں تقرریوں کی خواہش کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔" (صفحہ ۱۲۔ روداد ۱۲۹۴ھ) اور اب جبکہ پاکستان اور ہندوستان آزاد ہیں تو دار العلوم کی

شاخوں اور زیر اثر مدارس کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مصنف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۸۷ پر "ملک میں دارالعلوم کی شاخیں اور زیر اثر مدارس کے تحت جو سطور قلمبند کی ہیں وہ یہ ہیں" دارالعلوم کے فیضان نے ایک طرف تو ایسی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل امت اور مستقل جماعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف ملک میں مدارس دینیہ کا سلسلہ قائم کر کے شخصیتیں اور کردار بنانے کی مشینیں نصب کر دیں۔ اور ان مدارس اور انجمنوں کے ذریعہ اپنے غیر معمولی فیضان کا سلسلہ ہمہ گیر انداز میں پھیلا دیا۔ دارالعلوم کی تاسیس کے بعد تقریباً ایک ہزار مدارس عربیہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوئے۔ ان میں سے بہت سے مدارس ایسے ہیں جن کے انتظامات اور کارکردگی اور کارگزاری کی نگرانی بھی دارالعلوم کے ذمہ ہے مگر وہ خود اپنے اثر کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جیسے جامع ملیہ نواکھالی (تقسیم کے بعد اس کی نگرانی ختم ہو گئی) یا مدرسہ گلاؤٹھی یا مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد یا مدرسہ جامع مسجد امروہہ۔ اگر ان متعلقہ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ بھی دارالعلوم کے فیض یافتہ حضرات میں شامل کئے جائیں جیسا کہ بالواسطہ وہ یقیناً شامل ہیں تو ہندوستان کا کوئی علمی حلقہ ایسا نظر نہیں آئے گا جہاں دارالعلوم کی ظاہری اور معنوی برکات کام نہ کر رہی ہوں۔ پھر اگر ان تمام مدارس متعلقہ مکاتب اور اجتماعی اداروں کے حلقہ ہائے اثر کو بھی دیکھا جائے تو بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان خواہ وہ کسی حصہ کا رہنے والا ہو۔ دارالعلوم کے سلسلہ توسل و انتساب سے بے تعلق نہیں ہو سکتا جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس تخم سعادت کا شجرہ طیبہ کہاں کہاں تک پھیلا اور اس کے شیریں ثمرات نے کتنوں کو حیات لازوال بخشی۔"

دارالعلوم کا فیضان

دارالعلوم کی صد سالہ زندگی میں فضلائے دیوبند کی تعداد جنھوں نے دیوبند میں تعلیم پائی ان میں سے ہندوستانیوں کی تعداد ۴۲۹۵ ہے اور پاکستانیوں کی تعداد ۲۶۹۱ ہے یعنی برصغیر کے ۶۹۸۶ افراد نے علمائے دیوبند سے اکتساب فیض کیا۔ اور عالم قرار پائے۔ ان کے علاوہ بیرونی ممالک کے ۴۳۱ افراد نے دیوبند سے سند فضیلت لی یہ کل تعداد ۷۴۱۷ بنتی ہے۔ فضلائے دیوبند کے علاوہ دارالعلوم سے استفادہ کرنے والے طلباء کی مجموعی تعداد ۱۳۰۵۸ ہے۔ اس کے علاوہ اس عرصہ میں دارالعلوم دیوبند نے ۵۶۲ مشائخ طریقت ۵۸۸۸ مدرسین، ۱۱۶۴ مصنفین، ۱۷۸۴ مفتی، ۴۵۰ مناظر، ۴۹۴ صحافی، ۱۸۸۲ خطیب و مبلغ اور ۲۸۸ طبیب تیار کئے۔ ۴۸، فضلاء نے صنعت و حرفت اور تجارت کے ساتھ دینی خدمات انجام دیں۔ مذکورہ بالا خدمات میں جن حضرات نے اونچے درجہ کا مقام حاصل کیا۔ ان کی تعداد درج ذیل ہے۔ اعلیٰ درجہ کے معلمین و مدرسین ۸۴۴، اعلیٰ درجہ کے مصنفین ۱۲۷، اعلیٰ درجہ کے مفتی ۱۶۴، اعلیٰ درجہ کے مناظر ۱۱۲، اعلیٰ درجہ کے صحافی ۱۰۸، اعلیٰ درجہ کے خطیب اور مبلغ ۲۸۸، اور اعلیٰ درجہ کے طبیب ۱۶۴ ہیں۔

دارالعلوم کی ابتدائی آزمائشی دور

خداوند تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے دارالعلوم دیوبند کی قدم قدم پر نگہداشت اور سرپرستی فرمائی جس کی بناء پر اس نے اپنے اکابر کی خواہشات کے مطابق خدمات انجام دیں لیکن اس کا ابتدائی زمانہ بڑا پرخطر تھا اور انگریز حکام اس کی جانب سے غیر مطمئن تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس ادارہ کو اپنے لئے سخت خطرناک سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں اگر ارباب دارالعلوم پھونک پھونک کر قدم نہ رکھتے اور اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اس کا وجود کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ دارالعلوم کے اکابر اسے کن بنیادوں پر منظم کرنا چاہتے تھے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن اگر اس سلسلہ میں احتیاط سے کام نہ لیا جاتا تو خود دیوبند تحریک کو سخت نقصان پہنچتا۔ اخبار انجمن پنجاب لاہور میں گورنر یوپی کے ایک معتمد خصوصی کی رپورٹ ۱۹ر فروری ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی جس سے اس وقت کے صحیح حالات کا اندازہ ہوتا ہے اور ارباب دیوبند کی احتیاط، ہوشمندی اور ضبط و نظم کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔

یہ رپورٹ جان پامر کلارک کیمپ موہن گارڈ ضلع سہارنپور کی تحریر کردہ ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

"بندہ بوجہ خدمت ہمراہ لشکر ظفر پیکر نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی (یو۔ پی کا پرانا نام) دورہ میں تھا۔ ۳۰ جنوری ۱۸۷۵ء کو دیوبند ضلع سہارنپور میں قیام ہوا۔ اور ۳۱ کو بوجہ یکشنبہ (اتوار) قیام رہا جب اتوار گزر جانے سے فراغت پا چکا تو میرے آقائے نعمت نے مجھے الگ لیجا کر فرمایا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں مولویوں نے ایک مدرسہ اسلامی خلاف سرکار جاری کیا ہے۔ تو اجنبیانہ مدرسہ میں جاکر حال تو دریافت کر کہ کیا کیا تعلیم ہوتی ہے اور مسلمان لوگ کس ذکر و فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ میں فوراً آبادی میں گیا۔ ایک قصبہ پایا نہایت صاف، باشندے بے حد خلیق، نیک مگر غریب زدہ حال۔ پوچھتے پوچھتے مدرسہ میں گیا۔ اول تو ایک بہت بڑے کمرے میں دیکھا کہ چٹائیوں کے فرش پر چھوٹے چھوٹے لڑکے کئی درجن کتابیں رکھے ہوئے بیٹھے ہیں اور ایک بڑا لڑکا ان کے درمیان میں بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اے بھائی تمہارا استاد کون ہے۔ ایک نے اشارے سے بتایا کہ معلوم ہوا کہ جو درمیان میں بیٹھا ہے وہی استاد ہے۔ مجھ کو تعجب آیا کہ یہ کیا استاد ہوگا۔ میں نے اس کو سلام کیا۔ اس نے مجھ کو مسلمان سمجھ کر وعلیکم سلام کہا۔ میں نے پوچھا کہ استاد صاحب آپ کے لڑکے کیا کیا پڑھتے ہیں۔ جواب دیا کہ جملہ کتب فارسیہ، بعدہ میں اندر مکان گیا تو دیکھا کہ ایک دالان میں ایک مولوی صاحب میانہ قد نہایت خوبصورت بیٹھے ہیں اور ان کے سامنے ایک قطار بڑے بڑے طالب علموں کی بیٹھی ہے اول مجھ کو دیکھ کر ہنسی آئی مگر کان جو لگائے تو علم مثلث کی بحث ہو رہی ہے۔ پھر تو میں نہ رہ سکا اور آگے بڑھا، اور منتظر رہا کہ میری اجنبی صورت اور اجنبی لباس دیکھ کر یہ لوگ چونکیں گے مگر اصلاً کسی کو خبر نہ ہوئی اور کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ پھر تو میں بیٹھ گیا۔ اللہ مولوی صاحب کی جو تقریر سنی تو عجیب عجیب قاعدے مثلث کے بیان کر رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرینگر پرنسپل مرحوم (دہلی کالج) اور ماسٹر رام چندر (مدرس دہلی کالج) سے بھی نہ سنے تھے۔ وہاں سے اٹھ کر دوسرے دالان میں گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم میلے میلے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ مگر آواز نہیں آتی۔ میں اس نظر سے اور بھی آگے بڑھا کہ آیا کچھ بولتے ہیں یا نہیں۔ رفتہ رفتہ میں ایک کونہ میں جانے لگا تو وہاں ایک عجیب کیفیت تھی کہ مجسطی مقالہ کی دوسری شکل کے اختلاف بیان ہو رہے تھے اور ایسے بے تکلف بیان کر رہے تھے کہ گویا اقلیدس کی روح ان میں آگئی ہے۔ میں منہ تکتا رہ گیا اس کے بعد جبر و مقابلہ میں ایک ایسا مشکل سوال طلبا سے پوچھا کہ مجھ کو اپنی حساب دانی اور ایم۔ اے پر بڑا گھمنڈ تھا مگر میں حیران رہ گیا۔ بعض نے جواب صحیح نکالا۔ وہاں سے اٹھ کر میں تیسرے دالان میں گیا تو ایک مولوی صاحب حدیث کی ایک موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے۔ اور طالب علم ہنس ہنس کر تقریر کر رہے تھے۔ وہاں سے میں ایک زینہ پر چڑھ کر بالاخانہ گیا تو اس کے تین طرف مکان مختلف تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھی میں دو اندھے بیٹھے گردان رہے تھے۔ میں دبے پاؤں ان کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کر رہے ہیں۔ اتنے میں ایک اندھے نے دوسرے اندھے سے کہا کہ بھائی کل کے سبق میں شکل عروسی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر تیری سمجھ میں آگئی ہو تو بتلا دے۔ دوسرے اندھے نے دعویٰ بیان کیا اور اس کی تفصیل پر لکیریں کھینچ کر ثبوت شروع کیا اور پھر جو آپس میں بحث شروع ہوئی تو میں دنگ رہ گیا۔ مسٹر اسپرینگر مرحوم پرنسپل کی تقریر کا سارا روپ میری آنکھوں میں سما گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ایک پنج درہ میں گیا تو وہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں صرف و نحو کی کتابیں کمال ادب سے استاد کے سامنے بیٹھ کر پڑھ رہی ہیں۔ پھر تیسرے درجہ میں گیا، وہاں علم معقول کا درس ہو رہا تھا۔ وہاں سے دوسرے زینہ سے اتر آیا۔ باہر مدرسہ کے آیا تو ایک سے پوچھا کہ بس مدرسہ اسی مکان میں ہے وہ بولا نہیں صاحب قرآن شریف اور مکان میں پڑھایا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں ہے۔ وہ مجھ کو ساتھ لے گیا۔ ایک مسجد کے گوشہ میں دالان ہے۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ اور ایک حافظ نابینا ایک کونے میں بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا۔ اخباروں میں پڑھا تھا کہ سال گذشتہ میں چار طالب علموں کی دستار بندی ہوئی تھی (دارالعلوم کی پہلی دستار بندی) بھلا کوئی ان میں سے ہے، وہ بولا کہ ہاں ایک ہیں۔ تم کو ملا لاؤں۔ ایک مکان میں لے گئے۔ جہاں ایک نوجوان شخص بیٹھا ہے اور سامنے ایک موٹی سی کتاب کھلی رکھی ہے اور ایک طرف دو بندوقیں نالی دار اور ایک طرف دس بارہ طالب علم بیٹھے پڑھ رہے ہیں (غالباً مولانا

محمود الحسن)۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے کمال اخلاق سے میرا سلام لیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ ہی کے دستار فضیلت بندھی ہے۔ بنہایت ادب سے کہا کہ ہاں استادوں کی عنایت ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کونسی کتاب ہے۔ کہا کہ عربی کی بڑے فن میں ہے۔ ایک مہتمم مطبع نے واسطے ترجمہ کے بھیجی ہے۔ اور اس کی اجرت ایک ہزار روپیہ ٹھہری ہے جس کو ترجمہ کرنے میں مصروف ہوں تین ثلث ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ باقی ایک مہینہ میں پورا ہو جائے گا۔ پھر میں نے پوچھا کہ صاحب بندوق کیسی ہے۔ کہا کہ مجھ کو شکار کا شوق ہے۔ سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں۔ اور گیارہ بجے سے ایک بجے تک شکار کھیلتا ہوں۔ اور دو بجے سے چار بجے تک ترجمہ کرتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نوکری کیوں نہیں کرتے۔ کہا کہ حضرت گھر بیٹھے بٹھائے خدا دو ڈھائی سو روپیہ ماہانہ دیتا ہے، پھر کس واسطے نوکری کروں۔ میں نے وہاں سے اٹھ کر ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی مدرسہ کا کتب خانہ بھی ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں اس طرف چلے جاؤ۔ میں وہاں پہنچ گیا دیکھا کہ ایک مختصر سا مکان ہے۔ سارا سر سے پاؤں تک الماریوں سے بھرا ہوا ہے اور کتابیں اٹا اٹ بھری ہوئی ہیں اور ایک منشی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے مجھ کو بوڑھا کچھ کر بڑی آؤ بھگت کی اور ایک فہرست کتب خانہ کی آگے رکھ دی۔ اس کے دیکھنے سے میری آنکھیں کھلیں۔ کہ کوئی فن ایسا نہیں ہے جس کی کتاب موجود نہ ہو۔ پھر دوسری کتاب میرے آگے سرکائی۔ وہ رجسٹر حاضری طلبا کا تھا۔ کمال خوشخط اور صاف، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ منجملہ دو سو دس طلبا کے آج ایک سو آٹھ طلبا حاضر ہیں، بعدہ ایک سبز رنگ آدمی آئے (غالباً شاہ رفیع الدین تھے) اور السلام وعلیک کر کے بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا، آپ کی تعریف۔ کہا میں مہتمم ہوں۔ اور اسی وقت بتا بڑے بڑے رجسٹر میرے سامنے رکھ کر کہا کہ یہ اس سال کے جمع و خرچ کا حساب ہے۔ ملاحظہ کرو۔ میں نے جو ایک کتاب کھول کر دیکھی تو اس میں نہایت صحت کے ساتھ تاریخ وار حساب لکھا تھا اور گوشوارہ سے ثابت ہوا کہ آخر سال پر بعد خرچ کے بہت کچھ روپیہ باقی رہا۔ طبیعت نے چاہا کہ بعض کتب کی سیر کروں مگر وقت تنگ۔ شام ہونے کو تھی میں وہاں سے نکل کر لشکر میں آیا کہ دیکھا کہ آقائے ولی نعمت منتظر تھے (گورنر صاحب بہادر) دور سے دیکھ کر مسکرائے اور بولے ویل پامر خبر۔ میں بولا خیر کیا اخبار۔ کرسی لو اور بیٹھو سنو۔ میں بولا صاحب کیفیت تو کیا عرض کروں بہت طول طویل ہے مگر خلاصہ یہ ہے کہ جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو پرنسپل ہزاروں روپیہ تنخواہ لیکر کرتا ہے۔ وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ میں کر رہا ہے (مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی) یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں ہے بلکہ موافق سرکار ہے یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد، نیک چلن، سلیم الطبع ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں ہے جو یہاں نہ تعلیم ہوتا ہو۔ صاحب مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پا وے تو خالی نفع سے نہیں ہے۔ اے صاحب سنا کرتے تھے کہ ولایت انگلستان میں اندھوں کا ایک مدرسہ ہے یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے فن اقلیدس کی شکلیں کف دست پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید۔ صاحب بولے کہ ہیں یہ سچ ہے۔ میں بولا، کہ ہاں یہ سچ ہے۔ اور اگر جناب میور سابق لیفٹننٹ گورنر آج ہوتے تو کمال ذوق و شوق سے اس مدرسہ کو دیکھتے اور طلبہ کو خوب انعام دیتے۔ صاحب بہادر بولے پامر ہماری بڑی غلطی تھی کہ ایسے اچھے مدرسہ کو ہم خلاف سرکار سمجھ رہے تھے۔ میں نے کہا ہاں صاحب بے شک آپ کو کسی اہل غرض نے بڑے بھاری دھوکہ میں ڈالا۔"

اس رپورٹ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دار العلوم کا ابتدائی دور کتنا نازک تھا اور حکومت کے ذمہ دار افراد یہاں تک کہ صوبہ کا لیفٹننٹ گورنر تک اس بارے میں کیا سوچتا تھا اور ارباب دار العلوم کس قدر احتیاط سے اپنے مقاصد کو پورا کر رہے تھے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے اپنی کتاب انوار قاسمی (صفحہ ۲۷۰، ۲۷۱) میں تحریر فرمایا ہے کہ "یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاد حریت کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے وارنٹ جاری ہوئے، آپ روپوش رہے پھر حج پر چلے گئے، واپسی سے پہلے عام معافی کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس لئے دار العلوم کی تحریک اور اس کی ترقی و سرپرستی میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود حضرت مولانا اپنے آپ کو

نام میں آگے نہ رکھتے تھے گو کام میں سب سے آگے تھے۔ جہاد و دارالعلوم کو کوئی گزند پہنچے مگر پھر بھی بعض لوگوں نے حکومت سے شکایت کر دی۔ شکایت کیا تھی، حسب ذیل پختہ روایت پڑھیے جو استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے والد ماجد مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرماتے ہیں۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بعض مفسدہ پرداز (یعنی اعداء دین) نے جن میں رام پور (منہیاران) کا ایک خاندان بھی شامل تھا جس کو حضرت حکیم ضیاء الدین کے خاندان سے پشتینی عداوت تھی۔ حکومت میں یہ درخواست پیش کی کہ مولانا محمد قاسم نے دیوبند میں ایک مدرسہ حکومت کے مقابلہ میں کھولا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہو جائے یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو تلوار جنگ کی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کروانے کے لیے کابل کو تیار کر رہا ہے۔ ہم گورنمنٹ کو خیر خواہانہ اطلاع دیتے ہیں کہ وہ بیدار رہے اور ہم بھی ہر قسم کی سراغ رسانی اور تفتیش حالات کے لئے گورنمنٹ کو مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ حکومت کے یہاں تفتیشی حالات کے لئے احکام جاری ہوئے اور تفتیش کے مراکز گنگوہ، نانوتہ، رام پور (منہیاران) اور جلال آباد قرار پائے۔ اور ان کا صدر مقام دیوبند بنا دیا گیا۔ حکام نے دورے کئے اور بعض حضرات نے نانوتہ پہنچ کر حضرت نانوتوی کی زیارت کے لئے مسجد نانوتہ میں آنا چاہا اور مسجد میں آنے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے اجازت دی اور کہلوایا کہ جوتا نکال کر آئیں، حاکم آیا، بیٹھا نہیں بلکہ کھڑا رہا۔ ادب سے چپ چاپ حضرت کے سامنے کھڑا رہا۔ واپس ہو کر اس نے حکومت ہند کو رپورٹ دی کہ جو لوگ ایسی مقدس صورتوں پر نقص امن اور غدر و فساد کا الزام لگاتے ہیں وہ خود مفسد ہیں اور یہ محض چند مفسدوں کی شرارت ہے
اس واقعہ کے بعد حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اپنی ردائے مبارک میں مجھے ڈھانپ کر کبھی اندر لاتے ہیں اور کبھی باہر لے جاتے ہیں۔ سوتے اور جاگتے اکثر اوقات یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے کہ حضور ردائے مبارک میں لئے رہتے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۱-۲۵۲)۔

مولانا محمد طیب نے جناب مناظر احسن گیلانی کی مشہور تصنیف سوانح قاسمی کے صفحہ ۲۴۶-۲۴۷ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان خطرات کا ذکر کیا ہے جس سے دارالعلوم کو اپنے ابتدائی ایام ہی میں گزرنا پڑا۔ اور جن کی بنا پر مولانا محمد قاسم نانوتوی کو دارالعلوم سے اپنے تعلق کو پردہ اخفا میں رکھنا پڑا۔ جناب قاری محمد طیب صاحب نے بطور وضاحت ان صفحات پر یہ حاشیہ لکھا ہے کہ "احقر کے خیال ناقص میں بسلسلہ تاسیس دارالعلوم حضرت والا (مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کے کھل کر سامنے نہ آنے کو وقت کی سیاسی مصالح پر محمول کر لیا جانا بھی کوئی ایسی بے سروپا توجیہ نہیں کہ اسے خود تراشیدہ مفروضہ کہہ کر کلیتاً نظر انداز کر دیا جائے (جناب گیلانی کے الفاظ کی روشنی میں) اس وقت کے نازک حالات، حضرت والا کا وارنٹ، روپوشی، سرکاری دشمنوں کا پیچھے پیچھے لگا رہنا۔ پھر حضرت والا کے ان جذبات و نظریات کا ماضی سے زیادہ مستقبل کے لئے ہونا جو اسی وقت اپنے مدرسہ کی روح اور آج ایک مستقل مکتب خیال اور ملت کی تاریخ بنے ہوئے ہیں۔ جن کی رو سے یہ مدرسہ تعلیمی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں نہ تھیں جو کلیتاً پردۂ خفا میں ہوں، یا کم از کم بحیثیت مجموعی حکومت وقت کی نگاہوں سے اوجھل ہوں۔ (جس کی تصدیق پامر کی رپورٹ سے ہوتی ہے) جس سے حریت پرور مقاصد بروئے کار نہ آسکتے جن کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی۔
ان حالات میں حضرت والا کا کسی رسمی ذمہ داری کی صورت سے سامنے نہ آنا اور مدرسہ کے حق میں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونے کو نمایاں رکھنا ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت ہو جاتی ہے۔ راہنمایان یا متہمین کی فہرست میں حضرت والا کا نام شائع ہو جانا ان کی کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا۔ اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی اور وہ بھی اعزازی جس کا کسی اہم ترین منصب سے تعلق نہیں ہوتا۔ پھر جس میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو تارک الدنیا اور مسجد نشین بزرگ تھے جنھیں سیاسیات سے تو بجائے خود عام شہری معاملات سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا اور یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور رسالے

پنشنرز تھے (حاجی عابد حسین، مولوی مہتاب علی، مولوی ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمٰن، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد) جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ایسے ملے جلے ناموں میں قدرتاً کسی خاص شخصیت پر نگاہ عادتاً نہیں پڑسکتی۔ اس پر بھی مخالفین مدرسہ نے حضرت ہی کے تعلق کو بنیاد بنا کر مدرسہ کو حکومت وقت کی نگاہوں میں مشتبہ کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بغاوت کے الزامات بھی لگائے اور غیر ممالک سے سازش کی تہمت بھی تراشی۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کو تحقیقات کرانی پڑی۔ اس وقت یہی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اعتماد کو سامنے رکھ کر مدرسہ کی طرف سے صفائی پیش کی، جو کارگر ہوئی ورنہ اگر شخصی طور پر عہدیدارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت والا آگے آتے ہوتے تو ظاہر ہے کہ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگوں کی یہ صفائی اور یقین دہانی کبھی بھی کارگر نہیں ہوسکتی۔ گویا حضرت والا کا پس پردہ رہنا جس مصلحت سے تھا عملاً اس کا خوشگوار نتیجہ ظاہر بھی ہوا۔ اس لئے حضرت والا کی یہ حکمت عملی کی مدرسہ کے سب کچھ ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہ ہونا دکھانا چاہتے تھے اور نہ صرف تاسیس مدرسہ ہی کی حد تک بلکہ آخر تک اسی کو نبایا گیا۔ بلاشبہ وقتی مصالح کے لحاظ سے ایک حکیمانہ روش تھی۔ جس کو سیاسی مصلحت کے سوا اور کیا نام دیا جا سکے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس اخفا اور ستر میں حضرت والا کی قلبی افتاد اور رودادانی کسر نفسی اور تواضع کو بھی کافی دخل تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح وہ امامت، خطابت، قیادت، مشیخت افتا اور تمام امتیازی مواقع سے گھبراتے تھے اسی طرح کارہائے مدرسہ کی قیادت سے بھی یقیناً گریز فرماتے رہے جیسا کہ حضرت مصنف دام مجدہٗ یعنی (مولانا مناظر احسن گیلانی) کا نظریہ ہے۔ اور واقعہ بھی ہے لیکن ان دونوں باتوں یعنی سیاسی مصلحت اور قلبی تواضع میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اگر قلبی افتاد کے ساتھ عقل کی انگیز بھی شامل ہوجائے تو اہل اللہ کے لئے یہ جمع اضداد کچھ مشکل نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلب سلیم کی مقاماتی ترقی میں عقل معین ہوتی ہے اور عقل کے اونچے نظریات میں قلب کی سلامتی مددگار ہوتی ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ قلب نے اپنے راستے سے اور دماغ نے اپنے طریقے سے حضرت والا کو اس باہم وبے ہمہ حکمت عملی پر قائم کیا ہو۔ بادی النظر میں ہم اسے اعلیٰ ترین تواضع بھی کہہ سکتے ہیں اور بہترین سیاسی مصلحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔" قاری محمد طیب کے ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات یقینی ہے کہ دارالعلوم کا ابتدائی دور حیات بڑا پر خطر تھا۔ اور صرف ارباب دارالعلوم اور اس کے بانی کی کمال درجہ احتیاط اور سیاسی مصلحت نے اسے نقصان پہنچانے سے باز رکھا۔

دیوبند کا انتخاب

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ دیوبند کے ساتھ دوسرے مقامات پر بھی مدارس قائم ہوئے مگر دیوبند کو جو مرکزیت اور اولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ بھی الہامی معلوم ہوتی ہے۔ مفتی عزیز الرحمٰن نے لکھا ہے کہ جس جگہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا وہ جگہ ابتدا میں شہر کی کوڑا پانی تھی (یعنی جس جگہ شہر کا کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا تھا) مگر روایت ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کا جب ادھر سے گزر ہوا تو فرمایا کہ اس جگہ سے بوئے علم آتی ہے۔" مولانا محمد میاں نے بھی اسی قسم کی ایک روایت حضرت سید احمد شہید کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب "حضرت سید احمد شہید اس طرف سے گزرے تو فرمایا کہ یہاں سے علم کی بو آتی ہے۔ دوسرے یہ شہر دوآبہ کا مشہور شہر ہونے کی حیثیت سے اکابرین مشائخ کی قیام گاہ بھی رہ چکا ہے۔ مفتی عزیز الرحمٰن نے لکھا ہے کہ حضرت سید احمد شہید نے اس شہر میں کافی مدت قیام کیا اور ان کے تقریباً آٹھ رفیق یہاں کے رہنے والے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں: ۱۔ مولانا سید مقبول احمد، ۲۔ مولوی شمس الدین ۳۔ شیخ رجب علی، ۴۔ شیخ منور علی ۵۔ مولوی بشیر اللہ، ۶۔ مولوی فرید الدین ۷۔ شیخ عبدالرزاق ۸۔ شیخ حفیظ اللہ، ان لوگوں کے قیام سے بھی دیوبند کو ایک علمی اور روحانی حیثیت حاصل تھی۔ سید محبوب رضوی نے دارالعلوم کی اشاعت جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۷۴ھ میں ان میں سے کچھ حضرات کے مختصر حالات پیش کئے ہیں انہوں نے اسی ترتیب سے ان حضرات کا تذکرہ فرمایا ہے۔

۱۔ سید معقول احمد، ان کا صحیح نام حافظ سید معقول عالم ہے۔ مگر عام طور پر تذکرہ نگاروں نے سید معقول احمد لکھا ہے۔ دیوبند کے خاندان سادات سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ حضرت سید محمد ابراہیم قدس سرہ جہانگیر کے عہد سلطنت میں دیوبند تشریف لائے۔ ان کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اطراف و جوانب کی اکثر قومیں شرف اسلام سے بہرہ اندوز ہوئیں۔ ان کا سلسلہ ۲۹ واسطوں سے شہید کربلا حضرت امام حسین تک پہنچتا ہے۔

۲۔ مولوی شمس الدین، مولانا عبدالخالق صاحب جنھوں نے دیوبند کی عظیم الشان جامع مسجد کی تعمیر میں زبردست خدمات انجام دی ہیں ان کے والد بزرگوار تھے۔ جامع مسجد دیوبند کی امامت و خطابت ان ہی کی اولاد میں اب تک چلی آرہی ہے۔ دیوبند کے مشہور بزرگ حضرت شاہ ولایت صاحب کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔ فقہی مسائل میں ایک رسالہ شریعت کا منجھا ان ہی کی تصنیف ہے۔ ان کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ مولوی شمس الدین صاحب ابتدا میں بدعات کی جانب مائل تھے حضرت سید صاحب کے ورود کی خبر سن کر مخالفت کے جوش میں ایک ہجو لکھی جو اس وقت بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گئی۔ سید صاحب کے دوران قیام میں ایک مرتبہ سید صاحب کو دیکھنے کے لئے قاضی مسجد میں آئے اور مجمع میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے فوراً متوجہ ہو کر فرمایا کہ آپ ہی نے ہماری ہجو میں یہ اشعار لکھے ہیں، الفاظ کچھ اس انداز میں فرمائے کہ مولوی صاحب تڑپ گئے۔ اور حضرت صاحب کے پیر پکڑ لئے اور عرض کیا کہ حضرت اس گستاخی پر میں بہت شرمندہ ہوں۔ خدارا معاف کیجئے اور حلقہ بیعت میں شامل فرما لیجئے اور حضرت سید صاحب نے بیعت کر لیا۔

۳۔ شیخ رجب علی، ان کے والد کا نام شیخ خرمند تھا۔ دیوان لطف اللہ جو امرائے شاہجہانی میں سے تھے، ان کی اولاد میں سے ہیں۔ دیوان لطف اللہ کا سلسلہ نسب ۲۴ پشتوں سے حضرت عثمان غنی رضی سے مل جاتا ہے۔ دیوان لطف اللہ کے شاندار محل کا بوسیدہ اور شکستہ دروازہ آج بھی اپنی عظمت رفتہ کی شہادت دے رہا ہے۔ دیوبند کی عیدگاہ کے موجودہ خطیب مولانا محمد مبین (ناظم آباد کراچی کی عیدگاہ کے پہلے امام مولانا محمد متین خطیب کے والد) انہی شیخ رجب علی کے پوتے ہیں۔ مولانا موصوف شیخ الہند کی انقلابی پارٹی کے مخصوص اراکین میں سے تھے۔ پارٹی کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا کام ان ہی سے متعلق تھا۔

۴۔ منور علی صاحب۔ سید صاحب کے تذکرہ نگاروں نے ان کی ولدیت رجب علی بیان کی ہے مگر یہ صحیح نہیں، ان کے والد کا نام سید فضل علی ہے۔ خاندان سادات دیوبند میں سے تھے۔ قاضی مسجد کے متصل جہاں حضرت سید احمد شہید فروکش ہوئے تھے ان کا مکان ہے۔

۵۔ مولوی بشیر اللہ، ان کے والد کا نام شیخ غریب اللہ تھا۔ دیوبند کے مشہور طبیب حکیم صفت اللہ صاحب کے پر دادا تھے۔ یہ بھی دیوان لطف اللہ کی اولاد میں سے ہیں۔

۶۔ مولوی فرید الدین صاحب۔ والد کا نام شیخ محمد بخش ہے۔ دیوان لطف اللہ کی اولاد میں سے ہیں۔ دارالعلوم کے دوسرے مہتمم شاہ رفیع الدین کے والد ماجد ہیں۔ دارالعلوم کے شمالی دروازہ کے میدان میں ان کی قبر ہے۔ مشہور ہے کہ رات میں اکثر لوگوں نے قبر سے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنی ہے۔ علمائے بخارا سے تحصیل علم کی تھی۔ قصبہ راجوپور میں جو دیوبند سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ پڑھانے کا مشغلہ تھا۔ اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ تھے۔ ان کے چار بھائی اور تھے محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی اور سید احمد ہی کی روایت کے مطابق ان میں سے تین افراد بالاکوٹ کے معرکہ میں شہید ہوئے۔ ان تینوں بھائیوں کی نسبت یہ روایت خاندان میں مشہور ہے کہ جب مولانا فرید الدین کا انتقال ہوا تو یہ تینوں شہید بھائی ان کے جنازے میں شریک دیکھے گئے اور تدفین کے معاً بعد غائب ہو گئے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سے جب ان

لوگوں کا حلیہ بیان کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تینوں میرے شہید چچا تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اسی موقع پر یہ تینوں بھائی اپنے والد شیخ محمود بخش صاحب سے بھی ملے تھے۔ حال یہ تھا کہ بدن زخموں سے چور اور خون جاری تھا گویا کہ یہ ابھی زخمی ہوئے ہیں۔

قیام و تعمیر

دارالعلوم دیوبند ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء بروز پنجشنبہ قائم ہوا۔ مولانا محمد میاں نے لکھا ہے کہ تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا مجمع ہوا۔ چندہ جمع کیا گیا اور مسجد چھتہ کے فرش پر درخت انار کی ٹہنیوں کے سایہ میں مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ چندہ کے لئے رومال پھیلانے والا اور سب سے زیادہ چندہ دینے والا عابد (مولانا حاجی سید عابد حسین) سب سے پہلا معلم محمود (جناب مولانا محمود عرف ملا محمود) اور سب سے پہلے متعلم بھی محمود (شیخ الہند مولانا محمود حسن) تھے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے لکھا ہے کہ "یہ مدرسہ جیسا کہ مدرسہ کی روداد وں اور دیگر دستاویزات سے پتہ چلتا ہے ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء (جنگ آزادی کی ناکامی کے ٹھیک دس سال بعد) جمعرات کے روز چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے جاری ہوا۔ اور ملا محمود دیوبندی کے سامنے جو دارالعلوم کے سب سے پہلے مدرس تھے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا نے تعلیم کا آغاز کیا۔ جناب انوار الحسن صاحب نے انوار قاسمی کے صفحہ ۳۵۲ میں تحریر فرمایا ہے کہ "دارالعلوم دیوبند کے چار خاص عناصر میں یعنی محرک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ ہیں۔ اور حاجی محمد عابد صاحب، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا فضل الرحمان صاحب رحیم اللہ علیہم اجمعین ان کی تحریک پر عمل کرنے والے اور بقیہ سب حضرات رفقائے مجلس"۔

پس منظر

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے لکھا ہے کہ دارالعلوم کی بناء کے بارے میں حضرت مولانا محمد طیب کی تحریک پر دیوبند کے اسی سالہ بزرگ منشی محمد لائق صاحب محلہ خانقاہ دیوبند کا ایک بیان الفرقان بابت جمادی الآخر ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا ہے۔ یہ بیان دراصل ۱۴ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ کو دیا گیا تھا۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ مولانا محمد قاسم صاحب دارالعلوم دیوبند کے قیام کے محرک اول ہیں بیان درج ذیل ہے "دارالعلوم کے افتتاح و آغاز کا واقعہ اس طرح ہے کہ مولوی عبدالرب صاحب واعظ دہلوی نے اہل دیوبند کو اپنے ایک وعظ میں ترغیب دی کہ وہ دیوبند میں جامع مسجد تعمیر کریں۔ اور اپنے پراثر بیان سے چندہ کی تحریک بھی کر دی چنانچہ مجلس وعظ ہی میں سات آٹھ سو روپیہ چندہ ہو گیا۔ اور تقریباً اسی رقم کے مزید وعدے بھی ہو گئے۔ اس وقت یہ رقم بطور امانت رکھی گئی اور یہ طے پایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی جب نانوتہ سے دیوبند تشریف لائیں تو جامع مسجد کی جگہ کا انتخاب حضرت کے مشورے سے کیا جائے۔ تین چار ماہ کے بعد حضرت کی تشریف آوری ہوئی تو شیخ کرم نبی وغیرہ دس بارہ عمائد شہر چھتہ کی مسجد میں جمع ہوئے۔ میں خود بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ لوگوں نے واقعہ عرض کیا اور رقم سامنے رکھ دی فرمایا کہ بھائی تمہارے قبضہ میں سو سے زیادہ مسجدیں ہیں، اگر اب جامع مسجد نہ ہو بھی تو کوئی گناہ تھوڑا ہے۔ اس پر لوگوں کو کچھ مایوسی ہو گئی کہ شاید حضرت کا منشا جامع مسجد بنوانے کا نہیں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حضرت منشائے مبارک کو ذرا اور واضح فرمایئے پھر یہی فرمایا کہ اگر جامع مسجد شہر میں نہ ہو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ پھر لوگوں نے کہا کہ حضرت جو منشائے مبارک ہو صاف ارشاد فرمایئے۔ ہم سب خدام تعمیل کے لئے موجود ہیں، فرمایا کہ بھائی دیوبند میں بہتیری مسجدیں ہیں، اگر ایک مسجد اور بڑھائی تو کیا ہوا؟ کوشش کرو کہ احکام الٰہی بتانے والے بن سکیں جن سے مسجد کی آبادی بھی ہے اور دین کی بقا بھی ہے اور میرا مطلب یہ ہے کہ مسجد تو خیر بناؤ یا نہ بناؤ لیکن آج سب سے بڑی ضرورت مدرسہ بنانے کی ہے کہ دین کے مبلغ پیدا ہوں۔ اس پر سب نے عرض کی کہ سبحان اللہ اس سے بہتر کیا بات ہے۔ پھر حضرت اس کو قائم فرما دیجئے ہم سب ارشاد کی تعمیل کریں گے۔ قضا و قدر سے اس روز ملا محمود

صاحب جو غالباً میرٹھ میں ملازم تھے اور پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، رخصت یا تعطیل پر دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے بلائے گئے اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ملا صاحب آپ کو وہاں کیا تنخواہ ملتی ہے فرمایا کہ پندرہ روپیہ۔ فرمایا کہ اگر ہم یہاں ہی آپ کو پندرہ روپیہ دیں تو فرمانے لگے کہ حضرت یہاں کے تو دس بھی مجھے کافی ہیں۔ فرمایا کہ بس آج سے آپ کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار ہے۔ آپ پڑھانا شروع کر دیں اور چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے اسی دن سے مدرسہ کا آغاز کر دیا گیا اور جب ہی سے مدرسہ کے لئے مکان موجودہ منشی رفیق احمد جھکی والے کا انتخاب کر لیا گیا۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے انوار قاسمی صفحہ ۲۵۶ میں تحریر فرمایا ہے کہ "منشی محمد فائق کے بیان سے یہ تو معلوم ہو چکا کہ دوران قیام دیوبند میں (۱۸۵۷ء) جہاد آزادی کی ناکامی کے بعد حضرت قاسم العلوم کے دماغ میں اسلامی مدرسہ کا تخیل اندر ہی اندر پک رہا تھا (اور اس وقت کے اکابر دین کے ذہنوں میں بھی یہی خیال پرورش پا رہا تھا جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے) چنانچہ اس کام کے لئے دیوبند میں حضرت قاسم العلوم کی نظر حاجی محمد عابد پر پڑی اور ان کو قیام مدرسہ کے لئے آمادہ کیا منشی فضل الحق صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تحریر کے مطابق "ایک دن بوقت اشراق سفید رومال کی جھولی میں تین روپیہ اپنے پاس سے ڈال چھتے کی مسجد سے تن تنہا (حاجی محمد عابد صاحب) مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم کے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپیہ عنایت کئے۔ اور دعا کی، اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب (علامہ شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی کے والد) اور چھ روپیہ اس مسکین (یعنی منشی فضل حق دیوبندی) نے دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی فضل الرحمٰن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں، فوراً بارہ روپیہ دیئے اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی دیوبندی (مولوی ممتاز علی رسالہ تہذیب نسواں کے بانی اور سید امتیاز علی تاج کے دادا) بھی وہاں موجود تھے، ان کی طرف سے بھی بارہ روپیہ عنایت کئے گئے۔ وہاں سے اٹھ کر یہ درویش صفت محلہ ابوالبرکات میں پہنچے۔ اور وہاں بھی دوسو روپیہ جمع ہو گئے اور شام تک تین سو روپیہ۔ پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہے۔ یہ قصہ بروز جمعہ ذیقعد ۱۲۸۲ھ میں ہوا اور مدرسہ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا۔ (بحوالہ سوانح قاسمی جلد دوم ۲۵۹ صفحہ) حاجی نذیر احمد مصنف تذکرۃ العابدین لکھتے ہیں کہ "اگلے روز حاجی عابد حسین مرحوم نے مولوی قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آیئے۔ فقیر نے یہ صورت (فراہمی چندہ) اختیار کی ہے (تذکرۃ العابدین صفحہ ۶۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی) لیکن اس خط میں صرف یہی الفاظ نہیں تھے۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی لکھتے ہیں کہ اس خط میں مذکورہ بلادعوت کے ساتھ ساتھ حسب ذیل مضمون بھی تھا۔ جس کو حضرت الاستاد مولانا محمد ابراہیم بلیاوی مدظلہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے قلم بند کیا تھا۔ حضرت بلیاوی فرماتے ہیں کہ حاجی عابد حسین کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد کے پاس بچشم خود دیکھا ہے اور مجھے اس کا مضمون قریب قریب اس کے الفاظ میں پوری طرح یاد ہے۔ اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا (نانوتوی) مرحوم کو لکھا تھا کہ وہ جو آپ کے اور ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہیئے کیونکہ ایک ایک سوال پوچھنے کے لئے سہارنپور آدمی بھیجنا پڑتا ہے۔ فقیر کے دل میں ایک دم خیال آگیا اور چندہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپیہ ہو گئے۔ اب آپ تشریف لے آیئے۔ (بحوالہ سوانح قاسمی، جلد دوم، صفحہ ۲۷۵) خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدرسہ کے لئے حاجی محمد عابد صاحب نے چندہ تو کر لیا ہے مگر مدرسہ کا ابھی افتتاح نہیں ہوا۔ لیکن مدرسہ کا انتظام حاجی صاحب سے مشورہ کئے بغیر مولانا محمد قاسم نے خود کر دیا اور ملا محمود صاحب دیوبندی کو جو اس زمانہ میں میرٹھ میں تھے دیوبند بھیجا اور مدرسہ کی ترقی وسعی و کوشش کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر رکھی، آپ نے (مولانا نانوتوی) جو خط جواب میں ارقام فرمایا اس میں تحریر ہے کہ "میں بہت خوش ہوا، خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپیہ ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں، وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی

رہوں گا۔ اس کے بعد صاحب تذکرۃ العابدین ہی کے الفاظ میں "ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کردی۔" گویا دارالعلوم کا باقاعدہ افتتاح ہوگیا۔ تاریخ افتتاح ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء ہے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

بہر حال قیام مدرسہ کی اطلاع تمام اکابر کو دی گئی اور حضرت حاجی امداد اللہ کو مکہ میں اطلاع ہوئی۔ تو انہوں نے مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب کو ایک خط میں جو مرقومات امدادیہ ضمیمہ امداد مشتاق صفحہ ۲۸۴ پر ہے) مبارک دی۔ یہ اصلی خط فارسی میں ہے، اس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ "آپ عزیزوں اور عزیزم حافظ عابد حسین کی کوشش سے دینی مدرسہ کے اجراء سے بہت ہی زیادہ خوشیاں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ اللہ اس کار خیر کو ہمیشہ جاری رکھے گا اور کوشش کرنے والوں اور جو اس مدرسہ کے باعث ہیں ان کو جزائے خیر عطا فرمائے" دارالعلوم کے قیام کے سلسلہ میں آخری بیان حضرت شیخ الہند کے والد ماجد جناب مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کا ان کی تصنیف ہدیہ سنیہ سے نقل ہے "پھر اللہ پاک نے علوم کو زندہ کرنے اور مدرسہ کو مستحکم کرنے کے لئے شیخ اکبر و ازہر و اطہر شیخ عارف ولی ابو الہاشم مولانا مولوی محمد قاسم صاحب کو مقدور فرمایا۔ انہوں نے شیخ بزرگ سید محمد عابد صاحب کو پر دبال عنایت کئے اور کتنے ہی مدارس اور مدرسہ دیوبند جیسے جاری کئے گئے اور اسی کے طریقہ پر قائم کئے گئے۔ یہ سب مولانا قاسم الخیر کے انفاس طیبہ کی برکتوں کا سبب ہوئے اور جس نے اسلام میں سنت حسنہ جاری کی تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اور جس نے اس پر عمل کیا اس کا بھی اجر ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں ثواب اور نیکی کی امید پر آپ کے رب کے نزدیک بہتر ہے" لیکن درحقیقت دارالعلوم دیوبند کے قیام کا سہرا دیوبند کے عوام کے سر ہے جس کا خود حضرت مولانا نانوتوی نے اعتراف کیا ہے۔ آپ کی تقریر دہ ٹکڑا جو اہل دیوبند کی تعریف سے متعلق ہے اور جو آپ نے ۹ رجنوری ۱۸۷۴ کو دیوبند کی جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ میں فرمائی درج ذیل ہے"۔ مگر سب دور و نزدیک کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسہ کی بناء (جس کی پیشن گوئیاں اوپر بیان کی جاچکی ہیں) دیوبند والوں نے ڈالی۔ اس امر میں وہ سب کے امام ہیں (بیشک) ہر چند اور باہر کے صاحب اس کار خیر میں شریک ہوتے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں کا طفیل ہے اور اسی وجہ سے اگر یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کار خیر کا ثواب ملے گا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو بھی قولِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوگا۔"

روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۰)

اکابرین دین کی توجہ

مدرسہ قائم ہوگیا تو اس کے لئے اکابر دین کی دعاؤں اور توجہ کا سلسلہ اور تیز ہوگیا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے اپنے مشترکہ خط میں جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے لکھا کہ "اللہ اس کار خیر کو ہمیشہ جاری رکھے گا"۔ آپ نے صرف اس پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک حکم نامہ کے ذریعہ اپنے تمام معتقدین کو ہدایت فرمائی کہ وہ ہر طرح سے دارالعلوم دیوبند کے مددگار و معاون ہوں۔ آپ کے والا نامہ کے الفاظ جو انوار قاسمی کے صفحہ ۳۹۵ میں شائع ہوا ہے حسب ذیل ہیں" بعد حمد و صلوٰۃ فقیر امداد اللہ کی خدمت میں جو صاحب اس فقیر سے علاقہ محبت اور ارادت اور قرابت رکھتے ہیں خواہ قرابت جسمانی ہو عرض ہے کہ مدرسہ دیوبند عربیہ جو اس وقت میں اپنی خوبی سے نہایت رونق اور شہرت پر ہے فقیر کو اس سے ایک علاقہ خاص ہے۔ بلکہ یہ مدرسہ اپنا ہی مدرسہ سمجھیں اور جو کچھ اعانت اس مدرسہ کی اپنی ذات سے ہوسکے یا سعی اور سفارش سے ممکن ہو اس میں ہمیشہ ساعی رہیں اور نگرانی اس مدرسہ کی اپنے ذمہ ضروری سمجھیں کیونکہ اس آخری زمانہ میں جو مقبولیت بارگاہ الٰہی میں کارخانۂ علم کو ہے اور کسی امر کو نہیں اور سب صاحب اس مدرسہ کے باب میں بلکہ سارے امر میں متفق و یک دل و یک جہت ہو کر ہمت فرمائیں کیونکہ اتفاق اللہ جل شانہ کے نزدیک نہایت مقبول اور ہر کام میں موجب انجام نیک ہے۔"

حاجی امداد اللہ کو دار العلوم دیوبند سے جو تعلق اور لگاؤ تھا اس کا ذکر نہ صرف متذکرہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس سے پہلے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب کے نام مشترکہ خط سے اور بالمشافہ شاہ رفیع الدین سے گفتگو میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ہو سکتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے خلیفہ اول حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کو آپ نے ہدایت فرمائی کہ وہ دار العلوم دیوبند کی نگرانی اور سرپرستی فرماتے ہیں جس کا اعتراف حضرت مولانا گنگوہی نے اپنے ایک خط میں جو آپ نے حکیم عبد العزیز خاں صاحب کو ارقام فرمایا کیا ہے۔ یہ خط مکاتیب رشیدیہ کے صفحہ ۱۰۶ پر ہے۔ یہ خط ان خطوط میں ترتیب وار ۴۹ نمبر پر ہے۔ جس میں عزیز الطاف الرحمٰن کی تقریب نکاح میں شرکت سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ "ایک سفر دیوبند کا کہ حسب حکم مرشدنا (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) اختیار کیا ہے۔ بہت بندہ کو کلفت ہے اور حرج ہے مگر اس سے گویا مجبور ہیں۔ ایک دفعہ ایک سال میں جانا پڑتا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس سے بھی نجات ملے۔"

حضرت حاجی صاحب کا حکم بلا وجہ نہیں تھا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے اس سلسلہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے متعلق ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے جس میں اکابر دین کی دار العلوم دیوبند سے محبت، اور تائید ایزدی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی لکھتے ہیں کہ "خواہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت تو آنکھوں کے سامنے ایسی وضاحت کے ساتھ آگئی ہے کہ دار العلوم دیوبند کا وجود بھی مشیت ایزدی کا نتیجہ اور عنایت ربانی کا منشا نظر آتا ہے (قیام دار العلوم سے متعلق تائید ربانی کا تفصیلی ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے) کسی چیز کی نشو و نما اور خصوصی مقبولیت میں خدا کی قدرت ضرور کارفرما ہوتی ہے۔ دار العلوم بھی اسی منشا کا پرتو نظر آتا ہے جس سے علوم شریعت اور قرآن و سنت کے چشمے ابل ابل کر دنیائے اسلام کے لئے آب حیات کا کام کر گئے۔ (اور برصغیر کی سیاست میں خاص طور پر تینوں ملکوں بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کی جدوجہد آزادی میں اس ادارہ کے تربیت یافتہ افراد نے جس سرگرمی سے حصہ لیا ہے وہ ہماری تحریک آزادی کا ایک نمایاں اور درخشندہ باب ہے) اسی طرح دنیائے اسلام میں دار العلوم دیوبند کی نوعیت کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ اسی حقیقت کی تائید میں جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے ایک تاریخی واقعہ تذکرۃ الرشید حصہ دوم صفحہ ۲۱۵ سے نقل کیا ہے، واقعہ یہ ہے "مولوی عبد السبحان صاحب انسپکٹر پولیس ضلع گوالیار فرماتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار ایک بار پریشانی میں مبتلا ہوئے اور ریاست کی طرف سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی یہ خبر پا کر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گنج مراد آباد پہنچے۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادی نے وطن دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ دیوبند۔ تعجب کے ساتھ فرمایا کہ گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں (مولانا رشید احمد گنگوہی) قریب تر کیوں نہیں گئے۔ اتنا دراز سفر کیوں اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضرت یہاں عقیدت کھینچ لائی ہے۔ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ تم گنگوہ جاؤ۔ تمہاری مشکل کشائی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی دعا پر موقوف ہے۔ اور تمام روئے زمین کے اولیاء بھی اگر مل کر دعا کریں گے تو نفع نہ ہو گا۔ چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیلہ حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے سفارش کی تو حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی نے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے میرا کوئی قصور نہیں کیا۔ یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے سو قصوروار بھی اللہ پاک کے ہوئے۔ حق تعالیٰ سے توبہ کریں۔ بندہ بھی دعا کرے گا۔ چنانچہ اس بار انہوں نے توبہ کی اور ادھر مطالبہ سے برأت کا کمشنر صاحب کے پاس حکم آگیا۔"

تائید ربانی کے دو اور واقعات

جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۲۰۹ کے فٹ نوٹ میں انگریزوں کی دشمنی اور تائید ربانی کا ایک اور واقعہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ جناب گیلانی فرماتے ہیں کہ "یہ روایت تو شاید دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور خاکسار (جناب گیلانی) نے بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سے سنا تھا کہ صوبجات متحدہ کے گورنر میکڈانلڈ جنھوں نے اردو ہندی کا قصہ اس علاقہ میں کھڑا کیا تھا۔ یہی میکڈانلڈ ایک دفعہ شملہ جاتے ہوئے دیوبند کے اسٹیشن سے گزر رہا تھا۔ اسٹاف میں گورنر صاحب کے ایک مسلمان افسر بھی تھے ان سے اسٹیشن کا نام پوچھا اور یہ معلوم کرکے کہ یہی دیوبند ہے مسلمان افسر بیان کرتے ہیں کہ چہرہ میکڈانلڈ کا متغیر ہوگیا۔ اور غصہ میں بولنے لگا کہ ساری شرارتوں کا مرکز یہی مقام ہے۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں دیوبند اور یہاں کے مدرسہ کا معائنہ کروں گا تاریخ معائنہ بھی مقرر ہوگئی اور مدرسہ والوں کے پاس باضابطہ سرکاری اطلاع بھی پہنچ گئی۔ اندرونی طور پر میکڈونلڈ کے فاسد ارادے کا علم بھی مدرسہ والوں کو مختلف ذرائع سے ہوتا رہا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بیان کرتے ہیں کہ مدرسہ کے لئے بڑا نازک وقت تھا۔ ہم لوگ اس زمانہ میں جوان تھے سیدھے حضرت گنگوہی کی خدمت میں گنگوہ پہنچے اور لاٹ صاحب کی نیت سے مولانا کو مطلع کیا۔ یہ مشہور ہے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی غالباً کہتے تھے کہ حضرت والا مراقب ہوگئے، پھر سر اٹھایا کہ جوش کے عالم میں یہ فقرہ حضرت کی زبان سے جاری ہوا کہ لاٹ آئے نہ لوٹی، حکم دیا کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ، مدرسہ کا کام کرو۔ لاٹ صاحب کے آنے کی تاریخ کے کچھ دن باقی تھے کہ اچانک دیوبند اور اطراف دیوبند میں کالرے کی وبا پھوٹ پڑی۔ لاٹ صاحب نے ارادہ ملتوی کردیا۔ اسی کے بعد ان کی مدت بھی ختم ہوگئی۔

دوسرے واقعہ کا تذکرہ حضرت مولانا ابوالحسن ندوی کے والد ماجد مولانا عبدالحئی نے اپنے سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف میں کیا ہے۔ یہ واقعہ انہوں نے خود مولانا محمود حسن دیوبندی سے سنا۔ مولانا عبدالحئی حضرت شیخ الہند کے حوالہ سے اپنے سفرنامہ کے صفحہ ۹۸ میں فرماتے تھے کہ دیوبند میں ایک تنازعہ مدرسہ کے بابت پیدا ہوگیا تھا۔ مختصر یہ کہ اس تنازعہ کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی جس وقت مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بانی مدرسہ جناب مولانا محمد قاسم مرحوم نے مدرسہ کے جو اصول اس وقت قائم کئے تھے اور جن پر اب تک (۱۳۱۲) تک عمل درآمد جاری ہے۔ ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ارباب مشورہ میں ہمیشہ صالحین اور علماء منتخب کئے جایا کریں۔ ارباب وجاہت کو اس میں ہرگز دخل نہ دیا جائے اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ ان کو ہمیشہ اپنی بات کی پچ پڑ جاتی ہے اور اختلاف رائے بیش از بیش ہوتا ہے۔ گو مدرسہ کی بدخواہی ہی کیوں نہ مقصود رہو۔

دیوبند میں اس زمانہ میں اکثر ارباب وجاہت موجود تھے جن کو ارباب مشورہ میں منتخب نہیں کیا گیا۔ باوجودیکہ وہ کبیر السن تھے، ان کو اس بات پر بہت ملال تھا لیکن وہ تجربہ کار اور پختہ کار تھے اس واسطے انہوں نے صریحاً مخالفت کی جرأت نہیں کی، جب ان لوگوں کا انتقال ہوگیا اور ان لوگوں نے اپنے بعد ناتجربہ کار وارث چھوڑے تو ان لوگوں نے اپنی خام خیالی سے کھلم کھلا مخالفت کرنا شروع کردی۔ لیکن خدا کی قدرت سے اب تک انہیں کوئی موقع نہیں ملا جس سے ان کی مطلب براری ہوتی، اب سوئے اتفاق سے ایک موقع بھی ان کو مل گیا وہ یہ ہے کہ حاجی محمد عابد صاحب سابق مہتمم مدرسہ کے سفر حج کے بعد منشی فضل حق صاحب مہتمم مدرسہ کئے گئے، ان سے دو چار نازیبا حرکتیں ایسی ہوئیں کہ چار و ناچار ان کی اطلاع ارباب مشورہ کو دینی پڑی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب سرپرست مدرسہ نے حکم دیا کہ یہ موقوف کردیئے جائیں، ان سے ارباب مشورہ نے عرض کیا کہ ان کے موقوف ہونے سے کوتاہ اندیشوں کو دراز دستی کا موقع ملے گا۔ کیونکہ اکثر مخالفین ان کے عزیز ہیں۔ اور خود ان کو بھی اس توہین کا رنج ہوگا۔ مولانا نے مکرر ارشاد فرمایا کہ یہ موقوف کردیئے جائیں، گویا تمام عالم مخالف ہو جائے جب تک مدرسہ کا تعلق ہم لوگوں سے ہے اس کے ہم ذمہ دار ہیں کسی بے جا کارروائی کو ہم چھپا نہیں سکتے پھر مکرر عرض کیا گیا کہ جو نزاع پیدا ہوگی اس سے مدرسہ کو مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہے کیا عجب ہے کہ مدرسہ ٹوٹ جائے۔" مولانا نے فرمایا کہ مدرسہ خدا کی رضامندی کے واسطے

قائم کیا گیا ہے اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسی کے واسطے ہے، اگر اسی کے گناہ گار ہو کر اس کو انجام دیں تو کون سے ثواب کی بات ہے، جب تک اس کی رضامندی کے موافق کام ہوگا اس وقت تک کریں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔ جب باوجود اصرار کے مولانا اس پر مصر رہے تو سب چپ ہو گئے لیکن اس بارے میں سب تزلزل آلائے تھے مولانا نے فرمایا کہ تم سے نہیں ہو سکتا تو ان کو ہمارے پاس بھیجدو ہم سمجھا دیں گے۔ لوگوں نے بھی اس کو مناسب سمجھا اور خود منشی فضل حق نے بھی جب اس قسم کے تذکرے سنے تو لوگوں سے رائے پوچھی۔ سب نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ حضرت مولوی رشید احمد سے مل لیجئے جیسا ان کا خیال ہے اس پر عمل کرنا بہتر ہے۔ وہ بھی مولانا کے معتقد تھے، گنگوہ چلے گئے۔ مولانا نے ان سے فرمایا کہ تمہاری نسبت لوگوں کے ایسے خیالات ہیں، بہتر ہے کہ تم استعفیٰ دیدو، کیونکہ اسی میں مدرسہ کی خیر خواہی ہے۔ انہوں نے ملازمت کی طرف سے پس و پیش کیا لیکن مولانا نے فرمایا کہ نوکری کا کچھ پس و پیش نہ کرو تمہاری نوکری ہو جائے گی اس کے بعد مولانا نے نصیحت کی، بعد استعفیٰ دینے کے تم اور کچھ خیال نہ کرنا جیسا اب تک ہوا خواہ رہے ویسے ہی ہمیشہ خیر خواہ رہنا۔ اس میں تمہارے واسطے بہتری ہے۔ وہ یہ سب سن کر وہاں سے آئے اور طوعاً و کرہاً استعفیٰ پیش کر دیا اور استعفیٰ منظور بھی ہو گیا، اس کے بعد ان مخالفین کوتاہ اندیشوں نے ان کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا۔ آخر الامر ان لوگوں نے اس کو فساد قرار دیکر جو باتیں نہ کرنی تھیں وہ بھی شروع کر دیں۔ خط پر خط مولانا کی خدمت میں نہایت سخت و سست الفاظ کے لکھ لکھ کر روانہ کئے اور بہت ڈرایا دھمکایا، لیکن مولانا نے ان سب خطوں کا صرف یہ جواب دیا کہ تم ہم سے جرح کرنے کے مجاز نہیں ہو، ہم چندہ دینے والوں کے وکیل ہیں۔ اگر ان کو ہم سے پوچھنا ہو تو ہم اس کے جوابدہ ہیں۔ تمہارا جی چاہے ان سے کہو، وہ ہم سے پوچھیں گے تو ہم اس کا جواب شافی دیں گے۔ جب انہوں نے یہ تدبیر کارگر ہوتی نہ دیکھی تو ایک اشتہار چھپوایا جس میں نہایت صاف صاف ارباب مشورہ کی نسبت سخت و سست الفاظ لکھے تھے اور مولانا سلیم اللہ کو منہ بھر کر گالیاں دی تھیں جن کو دیکھنے اور سننے کے ارادت مند متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور جو کچھ بد دیانتی اور بے ضابطگی ان کے زعم باطل میں تھیں وہ سب لکھ کر دیں اور ایک تاریخ مقرر کی جس میں چندہ دینے والے آ کر مدرسہ کا جائزہ لیں اور اپنے مدرسہ کی حقیقت حال کو سمجھیں۔ اس کی پانچ سو کاپیاں چھپوا کر تمام چندہ دینے والوں کے پاس بھیج دیں، جس سے تمام متعلقین مدرسہ میں نہایت اضطراب پیدا ہوا۔ اس کی بھی اطلاع مکرر حضرت مدظلہٗ کی خدمت میں کی گئی۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کی خاک اڑانے سے کچھ نہیں ہونے کا۔ اول تو وہ لوگ نہیں آئیں گے، اگر آئیں تو بسم اللہ جیسم ما روشن دل ما شاد اپنے مدرسہ کا حساب کتاب سمجھیں، جب تک تمہارا تعلق ہے اس وقت تک تم اپنے فرض منصبی کو نہایت اطمینان سے پورا کرتے رہو، اس میں غفلت نہ ہونے پائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کوئی نہیں آیا، وہ لوگ کئی روز تک برابر اسٹیشن استقبال کے لئے جایا کرتے اور جو آتے بھی وہ سیدھے مدرسہ میں آتے۔ وہ چار دن رہ کر دیکھ بھال کر کے چلے گئے جب اس سے بھی عاجز ہوئے تو انہوں نے گورنمنٹ کی خدمت میں استدعا کی کہ یہ مدرسہ نہایت خراب اصول پر چل رہا ہے، ان لوگوں کے خیالات بغاوت آمیز ہیں، اسی واسطے مدرسہ میں ولایتی (پٹھان) کثرت سے رکھے گئے ہیں اور ایک زمانہ میں مولوی رشید احمد نے تھانہ بھون کی بغاوت میں شرکت کی تھی، یہ ہمیشہ کے باغی ہیں، ان کی نسل نکالی جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس مدرسہ کو گورنمنٹ اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو حاجی محمد عابد صاحب اس کے سرپرست مقرر کئے جائیں۔ جن کو جشن جوبلی میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس اشتہار کے چھپنے پر بہی خواہان حضرت مولانا سلیم اللہ کو نہایت تشویش پیدا ہوئی۔ لیکن مولانا گنگوہی نے کمال استقلال کے ساتھ تسلی دی کہ اب ہمارا پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا ہے اگر منظور الٰہی یہی ہے تو بہتر ہے۔ ہم کیوں مرتے مرتے اس ذمہ داری کے کام کا مواخذہ لے جائیں، اور اصل تو یہ ہے کہ ان کے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جب خدا نے اس وقت ہمیں محفوظ رکھا تو اب بھی محفوظ رہے گا۔ اسی طرح وہ لوگ خاک اڑا رہے ہیں۔ اب بھی ایک شخص دہلی دوسرے مضمون کا اشتہار چھپوانے گیا ہے اور خدا کی عنایت ہے کہ کسی مسلمان نے ایسے از سرتاپا فتنہ انگیز اشتہار کا چھاپنا پسند نہیں کیا۔ ایک ہندو مینجر مطبع نے چھاپا ہے

اس ہفتہ میں کلکٹر ضلع مدرسہ کے معائنہ کے لئے آیا اور اس نے مدرسہ کے ہر ہر مکان کو ملاحظہ کیا، طالب علموں سے ان کی سکونت دریافت کی سبھوں نے اپنے اپنے مکان بیان کئے۔ چلتے وقت معائنہ کی کتاب میں مدرسہ کی نہایت تعریف لکھی جس کی امید نہ تھی۔ بہر حال بفضل خدا، مدرسہ کی ترقی روزافزوں ہے اور ان لوگوں کی حالت بھی ترقی پذیر ہے۔"

مولانا عبد الحئی نے یہ سفرنامہ ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں تحریر کیا تھا اور دیوبند کے اس واقعہ سے متعلق ان کی یہ تحریر شعبان کے مہینے کی ہے۔ ان دونوں واقعات سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا قیام اور اس کی ترقی میں خداوند قدوس کی مرضی اور منشا کو دخل ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مدرسہ کسی سرکاری امداد اور گرانٹ کے بغیر ۱۱۱ سال سے مسلسل اللہ کے توکل پر زندہ اور موجود ہے۔

مولانا نانوتوی کے ساتھی

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے دارالعلوم کے عناصر اربعہ میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے علاوہ حاجی عابد حسین، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا خاص فضل و کرم کیا اور ان کو اپنی مہربانیوں سے نوازا، یہ انعامات بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ بقول مولانا رشید احمد گنگوہی یہ مدرسہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کو اپنے بندے بے حد عزیز تھے جو اس مدرسہ کے قیام کا باعث بنے۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا ایک نوٹ جو سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۲۶۰ اور ۲۶۱ پر محیط ہے ان حضرات پر خداوند قدوس کی مہربانیوں اور نوازشوں کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ حضرت مولانا محمد طیب کے الفاظ یہ ہیں " چھتہ کی مسجد کی مجلس انس کے یہی بیتح اساطین جنھوں نے حضرت نانوتوی کے ذہنی تصورات کو سب سے پہلے عملی صورت دی اور جن کا ذکر حضرت مصنف امام (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) نے مجوزین کے نام سے کیا ہے یعنی حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب نور اللہ مرقدہم، ان ہی کو دیکھئے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی براہ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں علم و دین کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، اسی زمانہ میں مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب مد فیوضہم جو ان ہی مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے ہیں مسلمانوں کی دینی اور روحانی تربیت جس وسیع پیمانے پر کر رہے ہیں یقیناً اس کو بھی دارالعلوم کے فیوض و برکات میں شمار کرنا چاہیئے۔ اسی طرح حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ تو ہند کے شیخ الکل ہی بن کر رہے اور ہند ہی کیا، کون گن سکتا ہے کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد ایشیا اور افریقہ کے کن کن علاقوں میں پھیلے ہوئے علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے اور ہیں۔ علمی اور دینی پہلوؤں کے سوا ملک کے سیاسی انقلاب میں آپ کا جو حصہ ہے کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ یقیناً آج جن قربانیوں، جاں فروشیوں کی قیمت ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، کیا واقعہ نہیں کہ اس میں کافی اور معقول سرمایہ شیخ الہند کی غیر معمولی اور اولو العزمانہ قربانیوں کا بھی شریک ہے۔ حضرت شیخ الہند کے حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی دارالعلوم کی علمی خدمات کے ساتھ اس کے شعبہ طب کی ہمہ وقت خدمت میں صرف ہوئی اور اساتذہ دارالعلوم میں اپنی خصوصیات کے ساتھ علمی میدان میں ان کی شخصیت نمایاں رہی، شیخ الہند کے داماد مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کو آج دارالعلوم کے شعبۂ افتاء کی خدمات میں زندگی کھپا دینے کی توفیق ملی ہوئی ہے۔ مجلس انس کے تیسرے اور نمایاں رکن جن کی عقیدت و عظمت کے سامنے سابق ہر دور کن جھکے ہوئے تھے یعنی حضرت اقدس حاجی سید محمد عابد صاحب قدس سرہ کے متعلق یہ کیا کم ہے کہ مرکزی جمعیت العلمائے ہند کے ناظم مولانا میاں محمد صاحب سلمہٗ دیوبند کے اسی خانوادہ

سادات کے چشم و چراغ ہیں جن کے ایک رکن حضرت حاجی صاحب بھی تھے۔ اپنے اس تعلق کا اظہار مولانا موصوف نے اپنی مشہور کتاب "علمائے ہند کے شاندار ماضی" میں کیا ہے۔ علاوہ براہ راست اولاد کے ان حضرات کے دو ختر وابستگان کو دارالعلوم کی برکات ظاہری و باطنی سے مستفید ہونے کے جو مواقع میسر آئے، ان کی فہرست بھی طویل ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پوتے یعنی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ادارہ "ندوۃ المصنفین" اور مجلہ "برہان" کے ذریعہ جو علمی مہمات انجام دے رہے ہیں وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاری حافظ جلیل الرحمٰن صاحب دارالعلوم کے شعبہ تجوید کی قابل قدر خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے نواسے مولانا محمد عثمان صاحب دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ ملک کی سیاسی خدمات اور شہری معاملات کی تنظیم کے سلسلہ میں کافی متعارف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے دوسرے نواسے یعنی مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد ہارون صاحب بھی دارالعلوم دیوبند کے دائرہ تدریس میں کام کر رہے ہیں اور انہیں علمی لائن کی خدمات کی اہلیت نصیب ہو گئی ہے۔ اور پھر ان تمام علمی قابلیتوں کی روح رواں یعنی حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہ جن کے ملک رس جذبات کے آتشداں سے نکل نکل کر یہ گرمی اس سارے ماحول کو تپائے ہوئے تھی اور آج تک یہ تپش (حضرت مولانا قاری محمد طیب کے روپ میں) اپنے کام میں مصروف ہے ان کی روحانی و معنوی ذریت کے ساتھ بھرپور عالم اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے نسبی سبط کو دیکھا جائے تو براہ راست ان کے خلف اکبر حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے جو پھل پھول اس چمنستان قاسمی کو لگے آج ان کا کون انکار کر سکتا ہے ان کا چالیس سالہ دور اہتمام دارالعلوم کا تابناک اور یادگار زمانہ شمار کیا جاتا ہے جس میں دارالعلوم ہمہ جہتی ترقیات کے مدارج طے کئے اور مدرسہ کو ایک بڑے دارالعلوم کے قالب میں ڈھالا، تعمیری ترقیات ہوئیں۔ مالی حیثیت اونچی ہوتی چلی گئی۔ حلقہ اثر وسیع سے وسیع تر ہوا۔ اور بالآخر وہ مرکزیت جو اس ادارہ کی بنیاد میں چھپی ہوئی تھی، اس دور میں شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوئی، پھر ان کی درسی خدمات ان ہمہ گیر خدمات کے علاوہ ہیں، آگے کی اولاد میں (اپنا ذکر نہیں فرمایا) حضرت والد کے نواسے ابو حامد مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ مہاجر کابل و رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ احاطہ دارالعلوم سے علم و سیاست کے میدان میں کام کرتے ہوئے کابل پہنچے تو انہوں نے دارالعلوم کے بنیادی مقاصد کو وہاں کی حکومت اور پبلک میں روشناس کرایا اور وہاں کے لوگوں کو تقریر و تصنیف کے ذریعہ ان مقاصد سے ہم آہنگ بنانے میں تیس برس تک جو کردار ادا کیا اس سے عوام اگر زیادہ واقف نہ ہوں تو خواص سے ان کی جانبازانہ مساعی مخفی نہیں (حضرت منصور غازی کی حیثیت سے ریشمی رومال کی تحریک میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا) جو اسی دارالعلوم کے فیوض و برکات کا ثمرہ تھیں۔ حضرت نانوتوی کے پڑپوتے اور مولانا حافظ محمد احمد کے پوتے حافظ قاری محمد سالم سلمہ بھی بحمد اللہ دارالعلوم دیوبند میں فرائض درس و تدریس انجام دے رہے ہیں۔ تصنیف میں بھی ان کا قلم تیز گام ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں تقریر و خطابت بھی امید افزا سامنے آ رہی ہے پھر عام افادیت کی لائن پر "ادارہ تاج المعارف" قائم کر کے اشاعت دین کی جو قابل قدر خدمت وہ انجام دے رہے ہیں وہ بلاشبہ اسی احاطۂ قاسمی کا فیض اور ان کی جدی نسبت کا مظاہرہ ہے۔ قاری طیب نے اپنے اس طویل نوٹ میں ایک تو اپنا تذکرہ نہیں کیا دوسرے حضرت مولانا محمد میاں مہاجر کابل کے والد اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد اور بھانجے حضرت مولانا عبداللہ صاحب انصاری کا ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ یہ بھی خاندان قاسمی کے ایک اہم فرد تھے۔ ان دونوں حضرات کا ذکر تاریخ دارالعلوم دیوبند سے دیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کا ذکر صفحہ ۵۱۵ پر ہے۔ الفاظ یہ ہیں :- "آپ حضرت بانی دارالعلوم دیوبند کے داماد تھے۔ حضرت کے تلامذہ میں بھی تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ مجاز تھے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت

حاجی امداداللہ کے پاس عرصہ تک قیام رہا۔ سرسید نے آپ کو بلا کر مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات کے عہدہ پر فائز کیا۔ سرسید اس بات پر اظہار مسرت کرتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی نسبت سے خالی نہیں ہے۔ (آپ کے دو صاحبزادے تھے۔ پہلے صاحبزادہ کا نام حضرت مولانا محمد میاں مہاجر کابل تھا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دوسرے صاحبزادے کا نام مولانا احمد میاں تھا۔ جو اپنے والد ماجد کی طرح علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ رہے اور ۱۹۴۸ء میں انتقال فرمایا۔ مولانا محمد طیب صاحب "بانی دارالعلوم دیوبند کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد مہتمم خامس دارالعلوم کے صاحبزادے ہیں۔ آپ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں آپ نے ۱۳۳۷ھ میں علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اور دارالعلوم میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۸ھ تک آپ دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے اور ۱۳۴۸ھ سے اب تک یعنی ۱۳۹۹ھ تک آپ بدستور مہتمم ہیں۔ اس وقت تک پورے ہندوستان میں آپ بہترین خطیب سمجھے جاتے ہیں (خطابت میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی شان خطابت کی جھلک آپ میں پائی جاتی ہے۔) آپ نے ابتدا میں حضرت شیخ الہند سے بیعت کی تھی۔ اور بعد میں حضرت تھانوی سے بیعت ہوئے اور ان ہی کے خلیفہ مجاز ہیں، آپ کی بیعت و ارشاد کا سلسلہ ہند اور بیرون ہند میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور ایک مستقل ادارہ آپ کی تصانیف کو شائع کر رہا ہے۔ (آپ نے برصغیر کی جدوجہد آزادی کے دوران مسلم لیگ کی امداد و اعانت فرمائی اور میرٹھ کے مشہور الیکشن میں جو نوابزادہ لیاقت علی خان اور محمد احمد کاظمی کے درمیان ہوا تھا کھل کر نوابزادہ صاحب کی حمایت کی تھی۔ ویسے آپ سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر حصہ نہیں لیتے۔) آپ کے زمانہ میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی۔ تعلیمی اور تعمیری سلسلہ کافی بڑھا کاموں اور شعبوں میں اضافہ ہوا۔ اساتذہ، طلبہ اور عملہ کی تعداد بہت بڑھ گئی اور دارالعلوم کی آمدنی میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا یہاں تک دارالعلوم کا جشن صد سالہ جو ۲۱، ۲۲ اور ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو منعقد ہوا، آپ کے دور مہتمی کا سب سے نمایاں واقعہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا پہلا سال

مفتی عزیزالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے سال یعنی ۱۲۸۳ھ کے اختتام پر مدرسہ مذکور میں مندرجہ ذیل کتابیں پڑھائی گئیں۔ شرح جامی، شرح وقایہ، قطبی، اصول الشاشی اور سراجی۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ پہلے سال کی روداد ان الفاظ سے شروع ہوئی۔ الحمدللہ کہ ۱۲۸۳ھ بخیریت تمام ہوا۔ اور اس کے آگے یہ اطلاع دی گئی کہ "یہ وہ مبارک سال ہے جس میں بنا مدرسہ عربی کی دیوبند میں قائم ہوئی۔" اس کے بعد جناب گیلانی نے لکھا کہ "نام ہی نہیں، امتحانی کتابوں کی فہرست بھی ہمیں جب ملتی ہے تو "مدرسہ عربی" کے پہلے سال کے کاموں کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس فہرست میں متذکرہ بالا کتابوں کے علاوہ شرح مُلّا اور میبذی کا نام بھی درج ہے۔ اسی روداد میں آگے چل کر درج ہے کہ "فقط قصبات سہارنپور و اضلاع ممالک مغربی ہی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ پنجاب و کابل و سندرسن تک کے لوگ جمع ہو گئے تھے" یہی نہیں بلکہ جب طلبہ کی فہرست کا جائزہ لیا گیا تو اس میں بہار کے بھی طالب علم نظر آئے ہیں جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے لکھا ہے کہ دارالعلوم کی رودادوں کے مطابق پہلے ہی سال کے اختتام تک ۷۸، طلبہ جمع ہو گئے جن میں دیوبند کے اطراف و جوانب کے علاوہ بنارس، پنجاب، اور افغانستان کے ۵۸ طلبہ تھے اور کل آمدنی چھ سو پچاس روپیہ چار آنہ تھی، مگر اس آمدنی میں بھی اتنی گنجائش تھی، کہ کافی رقم بچ گئی۔ ۱۲۸۳ھ کی روداد میں بقول جناب مناظر احسن گیلانی "حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اس محدود مدت میں (یعنی ایک سال) کے اندر ضلع سہارنپور کے ایک غیر معروف قصبہ کا مقامی مدرسہ جس کے پہلے سال کی آمدنی کل ۹۴۷ روپے ۴ آنہ تھی جس میں امداد طلبہ کی مد کو نکال دینے کے بعد اصل مدرسہ کی آمدنی درحقیقت کل ۴۰۱ روپیہ ہوئی۔ کل دو مدرس یعنی ایک عربی اور ایک فارسی و ریاضی کے مقرر ہوئے تھے۔ کل بیس طالب علم شروع میں شریک ہوئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے مصارف کے بعد بھی ۲۵۵ خرچ ہونے سے بچ گئے۔" اس چندہ میں کون کون شریک تھے اس کا بھی اندازہ جناب مناظر احسن گیلانی کی تصنیف سوانح

قاسمی سے لگائیے۔ جناب گیلانی لکھتے ہیں کہ" اس طرح مالی امداد کے سلسلہ میں ذرا ملاحظہ فرمائیے اور پہلی سال کی اسی روداد کا اور جائزہ لیجئے ان ناموں اور مقاموں کو جن سے ضلع سہارنپور کی گمنام آبادی دیوبند میں چندے آنے لگے تھے میری تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب چندہ کے خانہ میں ایک طرف راجپوتانہ کی پہارہ ریاست ٹونک سے حکیم عبدالمجید نامی کے چندہ کا اور دوسری طرف سینکڑوں میل دور دانا پور (بہار) کے باشندوں کے نام سے بھی پچاس روپیہ کی رقم کا ذکر کیا گیا۔ اسی روداد سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال کا جو امتحان ہوا اس کے ممتحنین میں مولانا قاسم صاحب بھی شامل تھے۔ جناب گیلانی نے لکھا ہے کہ اس روداد میں امتحان سالانہ کے تحت یہ لکھا ہے کہ" ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی نے بشمول مولوی مہتاب علی و مولوی ذوالفقار علی نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا اور معقول پروفیسر انوار الحسن پہلا سالانہ انعامی جلسہ ہوا جس میں ۲۱ روپے کی کتابیں طلبہ کو انعام میں دی گئیں۔ اسی روداد میں نام مہتمان کے تحت سال رواں میں یعنی ۱۲۸۳ھ) جناب حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی مولوی ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق اور شیخ نہال احمد کے نام درج ہیں۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند شائع کردہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند کے صفحہ ۱۲ پر سال اول کی جو کارروائی "دارالعلوم کی قدیم رودادوں کو باستیاب دیکھنے" کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان نے یکم ربیع الاول ۱۳۶۷ھ کو درج کی وہ درج ذیل ہے۔ عنوان ہے ابتدائے دارالعلوم دیوبند ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ اس مرکز علوم کی ابتدا نہایت سادگی سے حضرات ذیل کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ ۱ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ ۲ شیخ وقت حاجی عابد حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ۳ حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی والد ماجد حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ ۴ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب دیوبندی والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب و حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب و حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مدفیوضہم (شیخ الاسلام) ۵ جناب مولانا مہتاب علی دیوبندی ۶ جناب منشی فضل حق صاحب، دیوبندی اور ۷ جناب شیخ نہال احمد رئیس دیوبند۔ مدرسہ کے خزانچی اور مہتمم اعلیٰ حضرت حاجی عابد حسین صاحب اور مہتمم دوم منشی فضل حق صاحب مقرر ہوئے۔ کل مصارف دارالعلوم کے ۲۹۲ روپیہ ہوئے ایک سال کے بعد کل ماہوار خرچ پچاس روپیہ ہوگیا۔ کل طلبہ ۷۸ اور مدرسین دو تھے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ و حضرت مولانا ملا محمود صاحب دیوبندی، سال اول کے مخصوص طلبہ شیخ الہند حضرت مولانا سیدی محمود الحسن صاحب نور اللہ قدہ و مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی شمولیت

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ" طلبہ کی امداد کے پیش نظر حضرت مولانا محمد یعقوب کو حضرت قاسم العلوم نے صدر مدرس کے فرائض انجام دینے کے لئے ۲۵ روپیہ پر مقرر فرمایا جو اس زمانہ میں میرٹھ کے مطبع میں منشی ممتاز علی کے یہاں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے۔ حیات یعقوب و مملوک میں پروفیسر صاحب نے ذرا تفصیل کے ساتھ مولانا محمد یعقوب کی دارالعلوم سے وابستگی کی اطلاع دی ہے۔

آپ اپنی متذکرہ بالا تصنیف کے صفحہ ۵۹ میں فرماتے ہیں کہ" جب دیوبند میں عربی مدرسہ قائم ہوا تو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی مدرس کے طور پر ملا محمود صاحب دیوبندی کو مدرس مقرر فرمایا۔ انکی تنخواہ پندرہ روپیہ مقرر کی گئی جیسا کہ دارالعلوم کی رپورٹ سے ظاہر ہے لیکن پہلے ہی سال میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی، اس لئے مولانا قاسم العلوم و الخیرات نے پہلے ہی سال ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷-۶۸ء میں مولانا محمد یعقوب صاحب کو دارالعلوم کا صدر مدرس تجویز کرکے میرٹھ سے بلایا اس زمانہ میں آپ تصحیح کتب پر مطبع ہاشمی میں کام کررہے تھے۔ آپ کی وہاں تنخواہ کے بارے میں حکیم امیر احمد عشرتی لکھتے ہیں کہ حسب ارشاد جناب مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم وغیرہ مدرسہ عربیہ دیوبند میں صرف چالیس روپیہ (چالیس روپیہ بعد میں تنخواہ ہوئی لہذا

عشرتی صاحب نے بعد کی ترقی یافتہ تنخواہ لکھ دی۔ ہر چند کہ چند مقامات سے بڑی بڑی تنخواہ پر انہیں بلایا گیا۔ مگر کچھ التفات نہ فرمایا۔" (دیباچہ مکتوبات یعقوبی۔ صفحہ ۵) مولانا کا یہ تقرر طلبہ کی کثرت کے باعث عمل میں لایا گیا۔ القاسم کے دارالعلوم نمبر میں ۱۲۸۳ھ سال اجرائے دارالعلوم کے متعلق یہ عبارت ملتی ہے "پہلے ہی سال میں دور دور سے طالب علم آنے لگے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اعلان کے منتظر ہی بیٹھے ہوتے تھے۔ لیکن یہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب امداد اللہ کے بزرگ رفقاء کا اخلاص تھا جو علم کے طالب علموں کو دور دور سے کھینچے لئے چلا آرہا تھا۔ وقت اجرار مدرسہ طلبہ کی تعداد ۶۰ سے زیادہ نہیں تھی لیکن آخری ذالحجہ ۱۲۸۳ھ تک طلبہ کی تعداد ۷۸ ہو گئی تھی جن میں ۵۸ بیرونجات مثلاً پنجاب، بنارس وغیرہ کے تھے باقی دیوبند کے تھے (اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان میں قرب وجوار کے قصبات کے بھی تھے) (القاسم دارالعلوم نمبر ۴، ۱۳۷۷ھ۔ ۵۷۔۱۹۵۸ء) القاسم کے دارالعلوم نمبر کے مرتب اور اسی نمبر میں تاریخ دارالعلوم کے مضمون نگار مولانا محمد طاہر صاحب جو حضرت مولانا محمد قاسم کے پوتے اور مولانا محمد طیب کے چھوٹے بھائی ۱۲۸۲ھ دارالعلوم کے سال اول کی رپورٹوں سے تاریخی حالات بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دارالعلوم میں تقرری اور تنخواہ اور ان کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں "محرم ۱۲۸۳ھ میں جب مدرسہ جاری ہوا تو صرف ایک مدرس (ملا محمود صاحب) تھے۔ اس کے بعد اثنائے سال میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کو اسی سال صرف مبلغ پچیس روپیہ ماہوار پر صدر مدرس کرکے بلایا گیا اور حضرت مرحوم نے جو کمال محنت مدرسہ کی خدمت فرمائی۔ حضرت مرحوم کے حالات عجیب وغریب ہیں وہ تو اپنے موقع پر ظاہر کئے جائیں گے لیکن یہاں صرف اسی قدر عرض کیا جاتا ہے کہ وہ علم اور معلومات میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے ثانی تھے۔ حق تعالیٰ شانہ نے انہیں نہایت ہی عجیب ذہن رسا عطا فرمایا تھا اور بہت ہی عظیم الشان جمعیت کی شان بخشی تھی۔ سب سے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ہی مقرر ہوئے تھے۔" (القاسم العلوم دارالعلوم نمبر صفحہ ۵۸) جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے آگے چل کر بیان کیا ہے کہ "تحقیق کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ رجب ۱۲۸۳ھ سے پہلے غالباً جمادی الاول یا جمادی الآخر ۱۲۸۳ھ میں مولانا کا دارالعلوم میں تقرر ہوا۔ کیونکہ رجب میں مولانا دارالعلوم میں صدر رہتے تھے۔ منشی محمد قاسم نیانگری مکتوبات یعقوبی میں لکھتے ہیں کہ "آخر الامر مجھے حضرت مولانا صاحب مرشدی مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اعلیٰ مدرسہ عربی اسلامی دیوبند ضلع سہارنپور کی خدمت میں فیض درجت میں بتوسط رسائل عرائض اور مطالعہ فوائد جوابات ان کے تاریخ یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ سے نیاز حاصل ہوا (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۳) اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کا تقرر رجب ۱۲۸۳ھ سے قبل کا ہے۔ ان خطوں میں سے ایک میں یکم رجب ۱۲۸۳ھ کی تاریخ اور مسجد چھتہ دیوبند کا پتہ دیا گیا ہے لہٰذا ہمارا قیاس کہ محرم ۱۲۸۳ھ اور یکم رجب ۱۲۸۳ھ کے درمیان غالباً جمادی الآخر میں تقرر ہوا درست ہے۔" حکیم امیر احمد مرحوم نے تنخواہ چالیس روپیہ اور مولانا محمد طاہر نے ۲۵ روپیہ لکھا ہے اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں کہ "انہوں نے (مولانا محمد یعقوب صاحب) اس درسگاہ کی مدرسی صرف تیس روپیہ ماہوار پر قبول کر لی" جناب قادری نے "دارالعلوم دیوبند سے تعلق" کے عنوان سے مولانا محمد یعقوب کی مدرسہ دیوبند میں شمولیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "جب ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند قائم ہوا تو مولانا محمد یعقوب صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس وقت مولانا محمد یعقوب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے چھاپے خانہ میں ملازم تھے۔ مولانا محمد یعقوب خود لکھتے ہیں کہ "منشی ممتاز علی نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ قائم کیا۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلا لیا وہی تصحیح کی خدمت تھی، یہ کام برائے نام تھا، مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا۔ احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانہ میں نوکر ہو گیا،" انہوں نے (مولانا محمد یعقوب صاحب) اس اسلامی درسگاہ کی مدرسی صرف تیس روپیہ ماہوار روپیہ پر قبول کر لی (حیات محمد احسن نانوتوی صفحہ ۱۹۲-۱۹۳) جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے تنخواہ کے بارے میں تین مختلف آرار کی یوں تطبیق کی ہے "مولانا محمد طاہر، امیر احمد عشرتی اور محمد ایوب صاحب قادری پروفیسر کے اقوال میں تطبیق کی شکل یہ ہے کہ بیس روپے سے آغاز ہوا۔ اور پھر بڑھتے بڑھتے

تیس اور چالیس وغیرہ تک یہ تنخواہ پہنچی اور اس کے بعد آپ نے تنخواہ لینی چھوڑ دی۔"

سال اول کے طلبہ

جناب مناظر احسن گیلانی اور جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے دونوں نے اپنی تصانیف سوانح قاسمی اور انوار قاسمی میں لکھا ہے کہ دار العلوم کے پہلے متعلم شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب تھے منشی فضل حق سابق مہتمم دار العلوم نے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۲۶۲ یہ لکھا کہ "سب سے پہلے اس مدرسہ کے مدرس ملاں محمود صاحب اور جائے مدرسہ فرش مسجد چھتہ طالب علم مولوی عبد العزیز صاحب ہیں" جناب گیلانی نے اس سلسلہ میں متعدد دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عام روایت کہ مدرسہ کے پہلے معلم ملا محمود اور پہلے متعلم محمود حسن ہیں۔" اور اس ضمن میں دار العلوم کے جلسہ دستار بندی منعقدہ ۱۳۲۸ھ میں جناب مولانا حافظ محمد احمد کے تحریری بیان کا یہ حصہ نقل کیا جو شیخ الہند مولانا محمد احسن کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں "مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند جیسی گمنام بستی میں چھتہ کی مسجد کے اندر انار کے درخت کے نیچے ہوا جناب مولانا علامہ محمود صاحب دیوبندی مدرس تھے اور مولانا محمود الحسن صاحب پہلے طالب علم تھے جنہوں نے کتاب کھولی، اور مدرسہ دیوبند نے اس سادگی کے ساتھ زندگی میں قدم رکھا" مگر اس سلسلہ میں قاری محمد طیب کی ایک تحریر جو سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۲۶۴ پر قابل توجہ ہے آپ نے ان دو مختلف النوع روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "یہ حد سے زیادہ بودی اور دور از کار نکتہ نوازی ہوگی کہ اول طالب مولوی عبد العزیز کو قرار دیا جائے جیسا کہ سوانح مخطوط (منشی فضل حق کی تصنیف) کی روایت کا منشا ہے لیکن اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے کتابیں مولوی عبد العزیز کے پاس نہیں ہوں گی۔ کتاب لانے والوں اور استاد کے آگے اس کو کھول کر پڑھنے والوں میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سب سے پہلے طالب علم تھے اور یوں ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت پیدا کر دی جائے۔ میرے خیال میں تو کتاب کھولی کے الفاظ طالب علم ہونے کی یہ عام تعبیر ہے۔ اس عام اور اتفاقی تعبیر سے خواہ مخواہ ناجائز نفع اٹھانے کے مولویانہ کرتب کے سوا یہ اور کچھ نہیں۔" بہر حال سال اول کے ان دو طلبہ کے علاوہ ایک اور طالب علم مولوی بدر الدین عظیم آبادی کا بھی ذکر ہے۔ اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے سال اول کے طلبہ میں مولوی منفعت علی دیوبندی کا بھی نام لیا ہے۔

دار العلوم کا نصاب

قبل اس کے کہ دار العلوم کے سال دوم کے واقعات بیان کئے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دار العلوم کے نصاب کا تذکرہ کر دیا جائے۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں ارقام فرمایا ہے کہ ابتدا میں مدرسہ کا نصاب دس سالہ تھا مگر اس کے بعد کل مدت طالب علمی چھ سال کر دی گئی۔ جناب گیلانی لکھتے ہیں کہ "میں کیا عرض کروں۔ دار العلوم کی رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شروع میں مدرسہ کی تعلیمی مدت معلوم ہوتا ہے کہ دس سالہ مقرر کی گئی تھی لیکن دو سال گزرنے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں ہم دیکھتے ہیں کہ نصاب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کیلئے ایک مجلس مقرر کی گئی جس نے منجملہ دوسری تجویزوں کے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ "کل میعاد مدت تمام کتب اسباق ثلاثہ کے چھ سال مقرر کی جائے۔ اسباق ثلاثہ سے مراد یہ ہے کہ ایک وقت میں تین کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی کسی طالب علم کو اجازت نہیں دی گئی۔ چھ سال کی محدود مدت میں اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ کہ خالص دینیات یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانہ میں تھا اور جن کو پڑھ لینے کے بعد دینی علوم کے متعلق مزید کتابی تعلیم کو سمجھا جاتا تھا۔ کہ ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس میں مشکاۃ کے ساتھ حدیث میں ہم صحاح ستہ کو بھی پاتے ہیں۔ فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں توضیح ، تفسیر میں بیضاوی تک اس میں شریک ہے۔ ادب عربی کے لئے شرح ملا تک صرف و نحو کی کتابوں کے ساتھ نثر میں نفحۃ الیمن، حریری، کلیلہ دمنہ، تاریخ یمنی اور نظم میں متنبی اور حماسہ شریک ہیں۔ عربی سے اردو، اردو سے عربی ترجمہ کے لئے بھی وقت نکالا گیا ہے اور معقولات یا علوم دانشمندی میں فلسفہ کی حد تک اگرچہ صرف میبذی ہے لیکن دماغی تربیت اور ذہنی ورزش کیلئے

منطق کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کافی تعداد بھی باقی رکھی گئی ہے۔ مختصر رسالوں مثلاً غوجی، قال اقول، مرقاۃ، تہذیب اور مبسوط کتابوں میں شرح تہذیب قطبی اور میر قطبی کو باقی رکھا گیا ہے۔ چھ سال کی اس محدود مدت میں اسی نصاب کو ختم کرانے کے لئے نقشہ میں سال بھر کے تعلیمی دنوں کی میزان کر کے ہر دن اور ہر دن میں ہر سبق کے لئے کتنا وقت دینا چاہیئے۔ تفصیل وار نقشہ میں ان سارے امور کا ذکر کر کے مدرسین کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ کہ فلاں کتاب کو اتنی مدت میں ختم کرا دیں۔ الغرض کوئی سوال اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے تشنہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ نقشہ کو دیکھ کر سمجھ میں آجاتا ہے کہ دس سال کی عمر میں بھی دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولہویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے اور یوں صرف خالص اسلامی علوم ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے موروثی مروجہ فنون سے بھی کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم اور نئی علمی زبانیں سیکھ کر بائیس تیئس سال کی عمر میں گریجویٹ بن جانے کا بھی کافی موقع پیدا کر دیا گیا تھا۔ یعنی آج بھی گریجویٹ بننے کی جو عام عمر ہے۔ کم و بیش اسی عمر میں سیدنا امام الکبیر (مولانا محمد قاسم نانوتوی) کی مجوزہ تربیت کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جانے کا قوی امکان، مسلمانوں کے سامنے ہو گیا تھا۔ دین اور اپنے آبائی سرمایہ کی ضمانت کے ساتھ باہر کی چیز دل سے استفادہ کی صلاحیت کے لئے مزید وقت دینے کی ضرورت قطعی طور پر باقی نہیں رہی تھی" جناب گیلانی نے آگے چل کر سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ بعد میں دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں مزید تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں لیکن ان کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے"

دارالعلوم کی حیات مبارکہ کا دوسرا سال

جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے کہ سال دوم ۱۲۸۴ھ میں تمام ہندوستان میں قحط اور دیوبند میں کوئی عام وبا پھیلی جس سے مدرسہ کے طلبہ اور مدرسین منتشر ہو گئے اور انتظام مدرسہ متزلزل ہو گیا مگر پھر بحمد اللہ جلد ہی دو ماہ میں درست ہو گیا۔ اسی سال میں حضرت حاجی عابد حسین صاحب حج پر تشریف لے گئے اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی ابن مولانا فرید الدین صاحب ابتدائے شعبان ۱۲۸۴ھ میں مہتمم مقرر ہوئے۔ اس سال میں کتب عربی اس درجہ نایاب تھیں کہ مقامات کے علاوہ کوئی کتاب کسی مطبع سے ہاتھ نہ آئی اس لئے اسباق طلبہ میں حرج واقع ہوا۔ اہل مدرسہ نے اہل مطابع اور تجار کتب کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ اس سال مدرسین کی تنخواہوں میں حسب ذیل ترقی ہوئی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اعلیٰ کو بیس روپیہ سے تیس روپیہ اور حضرت ملا محمود مدرس دوم کی پندرہ روپیہ سے بیس روپیہ تنخواہ ہو گئی۔ اسی سال ایک تیسرا مدرس ادب داں کے رکھنے کی تجویز بھی ہوئی۔ اعلان اخبارات میں دیا گیا کہ ادب حضرات درخواستیں بھیجیں اسی سال فارسی مدرس رکھنے کی تجویز بھی کی گئی۔ ذی الحجہ ۱۲۸۴ھ میں حافظ نامدار خان صاحب کو تعلیم قرآن کے لئے مقرر کیا گیا، اور اسی سال شیخ الہند نے کنز، میبذی اور مختصر المعانی کا امتحان دیا اور اسی سال دارالعلوم کے آئین کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ کوئی طالب علم مدرسہ عربی سہارنپور کا جب تک سند صفائی مہتمم یا مدرس اعلیٰ مذکور کی نہ داخل کرے بھرتی مدرسہ ہذا میں نہ کیا جائے گا۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۲۸۰ پر ارقام فرمایا ہے کہ ۱۲۸۴ھ میں فارسی وغیرہ کی کلاسیں کھولی گئیں اور حساب، ارعد، قرآن ناظرہ و حافظہ کی جماعتیں بھی کھول دی گئیں ا اسی سال مدرسہ کا حساب رکھنے کے لئے چار روپیہ ماہوار پر ایک محرر رکھا گیا۔ ۱۲۸۴ھ میں طلبہ کی تعداد ۱۲۰ ہو گئی اور چندہ بھی بڑھ گیا۔ اس سال کا امتحان مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا مہتاب علی صاحب نے لیا" جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے اپنی تصنیف حیات یعقوب و مملوک کے صفحہ ۶۱ میں ۱۲۸۴ھ کے بارے میں اور تفصیلات بھی دی ہیں اور لکھا ہے کہ " دارالعلوم دیوبند کی عمر کے دوسرے سال یعنی ۱۲۸۴ھ مطابق ۶۹-۱۹۶۸ء کے حالات کے سلسلہ میں بھی مولانا محمد طاہر صاحب تنخواہ کے بارے میں

مدرسین کی تنخواہوں میں ترقی کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ "اس سال (۱۲۸۴ھ) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے باکمال شیخ کے بیس روپیہ سے تیس روپیہ اور ملا محمود مدرس دوم کے بجائے پندرہ روپیہ کے بیس روپیہ ہوئے اور دونا ئبوں کے تین تین روپیہ کے بجائے چھ چھ روپیہ مقرر ہوئے اور قرار پایا کہ ۱۲۸۵ھ سے تنخواہوں میں بشرط وصولی چندہ اور بھی ترقی کی جائے گی۔ (دارالعلوم نمبر ۵۹ محرم ۱۳۸۴ھ) اس سال ۱۲۸۴ھ میں بیماری کی کثرت کے باعث مدرسین اور طلبہ گھروں کو چلے گئے تھے اور بیمار رہے۔ دو ماہ تک یہی صورتحال رہی اور پھر طلبہ اور مدرسین واپس آگئے۔ اسی سال کی روداد میں امتحان لینے والوں میں مولانا محمد یعقوب صاحب کا نام نامی بھی ہے۔ دستخطوں میں لکھا ہے کہ محمد یعقوب مدرس اول" جناب مناظر احسن گیلانی نے "سوانح قاسمی" حصہ دوم۔ صفحہ ۲۴۵ پر ان وجوہات پر روشنی ڈالی ہے جن کے باعث دارالعلوم میں فارسی، قرآن شریف اور حساب وغیرہ کی کلاسیں قائم کی گئیں۔ آپ نے ۱۲۸۴ھ کی روداد کے حوالہ سے لکھا کہ "جب دیکھا گیا کہ طلبہ مبتدی بیرونجات و دیوبند کی تعلیم بدون فارسی پڑھنے کے نہیں ہوتی اور فارسی تعلیم عربی میں ابتداً دخل تمام رکھتی ہے اور نیز خیال کیا گیا کہ اگر کتب فارسی ابتدا سے فارسی پڑھائی جاویں گی تو بالضرور لوگ اپنے چھوٹے لڑکوں کو مدرسہ بھیجیں گے اور اس میں امید قوی ہے کہ رفتہ رفتہ شوق تعلیم عربی ہو۔" اسی روداد میں (۱۲۸۴ھ) آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ تعلیم قرآن کا درجہ بھی اس کے بعد کھولا گیا اور اس سلسلہ میں آوائل ذی الحجہ سے حافظ نامدار خان جن کی تعلیم اور حفظ قرآن مشہور ہے بہ تنخواہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے" (حضرت مولانا محمد یعقوب نے بھی دیوبند میں قیام مدرسہ کی خبر دینے کے بعد یہی ارتقام فرمایا تھا کہ "چند ہی روز گزرے تھے کہ چندہ کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے اور مکتب فارسی و حافظ قرآن مقرر ہوئے۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے دارالعلوم دیوبند کے دوسرے سال کی روداد میں کتابوں کی کمیابی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معاشی بدحالی اور عربی علوم سے عدم دلچسپی کے باعث کتابوں کی اشاعت پر اثر پڑا تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "طباعت کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ جو کتاب چھاپی جائے اس کے طلب کرنے والوں کی تعداد کافی ہو لیکن ناکافی تعداد تھی جس چیز کے خواہش مند دل کی بازار میں بآسانی فراہم نہ ہو سکتی ہو خود سوچئے کہ اس کے چھاپنے پر روپیہ صرف کرنے اور محنت برداشت کرنے کیلئے کون آمادہ ہوتا۔ روداد کے مطالعہ سے جہاں اس کا پتہ چلتا ہے کہ ادب عربی اور ان کی طرف دارالعلوم کی تاسیس کی ابتدائی زمانہ میں خاص توجہ دی جاتی تھی وہاں آگے جن کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی اطلاع دی گئی ہے ان میں متنبی اور نفحۃ الیمن جیسی عام کتابیں بھی ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ دستیاب نہ ہونے والی کتابوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "بالکل بہم نہ ہو سکیں" اور یہ کہ یہ ایسی دشواری ہے کہ "رفع کرنا اس حرج کا اختیار مہتمان مدرسہ و طلبہ سے باہر ہے اس کے بعد اسی روداد میں یہ تجویز بھی ملتی ہے کہ "یہ مشکل بہ توجہ تاجران کتب و دیگر مطابع ہی حل ہو سکتی ہے۔" گویا ملک کے اسی خاص طبقہ کو متوجہ کر کے تجویز بہ این الفاظ پیش کی گئی۔" یعنی ان کتب کو بہ کثرت چھاپیں اور فروخت کریں اور کسی قدر وقف خرچ مدرسہ بھی فرما کر شامل نفع دینی و دنیا ہوں" بہر حال یہ تو تجویز کا پہلا حصہ تھا، یعنی ارباب مطابع کو کتابیں چھاپنے اور شائع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی دوسرا جز واس کا جو یہ تھا کہ اپنی چھاپی ہوئی کتابوں کے کچھ نسخے بطور وقف مدرسہ میں بھی داخل کریں ان کا ذکر بھی اسی روداد میں آگے چل کر ہے، لکھا ہے کہ "جن حضرات نے اس شیوہ پسندیدہ کو اختیار کر کے کتب عربی فارسی وقف مدرسہ فرمائیں یا عاریتاً واسطے استعمال مدرسہ کے سپرد مہتم کیں، فہرست ان کی آخر روداد میں مندرج ہے" اور اسی فہرست میں خود مولانا نانوتوی سرفہرست تھے جنھوں نے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی "جو فہرست عاریتاً و امانتاً مدرسہ میں کتابوں کے رکھوانے والوں کی تھی، اس میں سب سے پہلا اسم گرامی خود سیدنا امام الکبیر رحمتہ اللہ علیہ (مولانا محمد قاسم نانوتوی) کا ہے اور کافی قیمتی کتابوں کا نام لیا گیا ہے" (سوانح قاسمی حصہ دوم صفحہ ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، اور ۳۱۴)

دار العلوم کی حیات مبارکہ کا تیسرا سال

جناب مولانا مفتی محمد شفیع نے آگے چل کر دار العلوم دیوبند کے قیام کے تیسرے سال یعنی ۱۲۸۵ھ کا تذکرہ فرمایا ہے، آپ لکھتے ہیں کہ بعد تلاش بسیار ایک عالم ذی استعداد یعنی مولوی سید احمد صاحب دہلوی حسب خواہش مہتمان ماہ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ میں مدرس مقرر ہوئے اور اسی سال حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے دار العلوم کا معائنہ فرمایا اور اس سلسلہ میں ایک تحریر سپرد قلم کی جو یہ ہے: "آج ۳ رجب ۱۲۸۵ھ کو یہ عاجز مدرسہ دیوبند میں حاضر ہوا، اور اتفاق ملاحظہ حال مدرسہ و مدرسین و طلبہ ہوا تو رجسٹر سے ہونا ۵۸ طلبہ عربی خواں سوائے فارسی خواں اور قرآن خواں کے معلوم ہوا۔ ۲۰ نمبر اعلیٰ ۱۹ متوسط ۱۸ ادنیٰ تجویز ہوئے اس سال کے امتحان میں مولانا فتح محمد تھانوی استاذ حکیم الامت تھانوی قدس سرہ شریک ہوئے اور اعلیٰ کتابوں میں امتحان دیا۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی نے اس سال کتب حدیث ترمذی وغیرہ کا امتحان دیا، اس سال فارسی کے امتحان دینے والوں میں کوئی صاحب محمد شفیع دیوبندی بھی ہیں، اسی سال میں مفتی عزیز الرحمٰن نے قرآن شریف کا امتحان دیا۔ اور احقر کے والد ماجد مولانا محمد یاسین نے پارہ عم میں امتحان دیا"۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے لکھا ہے کہ "۱۲۸۵ھ میں ۲۷ ذی الحجہ کو تقسیم انعام کا جو جلسہ ہوا اس کی رپورٹ سے اخذ کر کے قاری محمد طاہر صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت مولانا محمد قاسم نے بشمول مولانا ذوالفقار علی و مولوی مہتاب علی و مولانا محمد یعقوب صاحب و مولانا رفیع الدین احمد صاحب اپنے دست مبارک سے طلبہ کو انعامی کتب عطا فرمائیں" اس سال کے دو واقعات بے حد اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسی سال دار العلوم کے نصاب تعلیم کو از سر نو مرتب کیا گیا اور اس کے لئے ایک خاص کمیٹی ترتیب دی گئی جس نے مدرسہ کا نیا نصاب ترتیب دیا۔ اس کی تفصیل دار العلوم کے نصاب کے ضمن میں آچکی ہیں، دوسرا بڑا واقعہ یہ ہے کہ اسی سال دار العلوم کی ملک گیر حیثیت کو مستحکم کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے ہر دو واقعات کا تفصیلی ذکر اسی سال کی روداد میں جن کا اپنے موقع پر ذکر ہو چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ برصغیر کے کن کن شہروں کے مدارس دار العلوم دیوبند سے متعلق تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی، جلد دوم، صفحہ ۳۰۷ میں یہ ارقام فرمایا ہے کہ "تاسیس دار العلوم کے ابتدائی سالوں ہی میں یہ نصب العین سامنے تھا کہ سارے ہندوستان کے مناسب مقامات پر قومی خزانہ سے دینی تعلیم گاہوں کا جال اس طرح بچھا دیا جائے جیسے حکومت کے خزانہ سے دنیاوی مدارس ہر جگہ کھولے جا رہے ہیں۔ آپ کو مدرسہ کے تیسرے سال کی روداد میں یہ عبارت مل جائے گی" (یہ عبارت اپنی جگہ نقل ہو چکی ہے) اسی صفحہ پر نیچے فٹ نوٹ میں جناب گیلانی کی یہ تصدیق موجود ہے۔ دار العلوم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے خاکسار جب وہاں مقیم تھا۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے کی بات ہے اس وقت تک اتنا اثر باقی تھا کہ چند خاص مقامات کے مدارس خصوصاً رڑکی، بانسی بریلی، نگینہ وغیرہ کے مدرسوں سے ہر سال چند ممتحنوں کو طلب کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی خاکسار بھی جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب اب یہ رسم قدیم باقی ہے یا یہ بھی ختم ہو گئی" جناب گیلانی کی اس عبارت کے بعد قاری محمد طیب نے یہ الفاظ رقم فرمائے ہیں "الحمد اللہ اب بھی باقی ہے۔ اور اس میں وسعت بھی ہو گئی ہے۔

دار العلوم دیوبند کی حیات مبارکہ کا چوتھا سال

جناب مفتی محمد شفیع صاحب نے فتاویٰ دار العلوم دیوبند کے صفحہ ۱۴ میں ارقام فرمایا ہے کہ دار العلوم کی زندگی کے چوتھے سال ۱۲۸۶ھ کا اہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت حاجی عابد حسین نے حج سے واپس آکر پھر عہدہ اہتمام سنبھالا اور مولانا رفیع الدین صاحب حج کو تشریف لے گئے۔ اسی سال احقر کے والد صاحب مرحوم نے نصف قرآن میں امتحان دیا لیکن جناب پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے حیات یعقوب و مملوک میں لکھا ہے کہ اس سال پھر دیوبند بیماری اور قحط کی زد میں رہا جس کے باعث مدرسہ پانچ ماہ کے لئے بند رہا۔ آپ نے دار العلوم کی رپورٹ بابت ۱۲۸۶ھ کے حوالہ سے یہ فرمایا ہے کہ "باوجود قحط عام، شدت بیماری کے اور باوجود مدرسہ کے

قریب پانچ ماہ جد رہنے کے اور طلبہ سے لیکر مدرسین تک بیمار ہو ہو کر اپنے اپنے وطن تشریف لے جانے کے الحمد اللہ کہ سعی و کوشش حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس و حضرت مولانا محمد محمود صاحب و مولانا سید احمد صاحب خواندگی پوری ہوئی۔"

دارالعلوم کی حیات مبارکہ کا پانچواں سال

دارالعلوم کی زندگی کے پانچویں سال ۱۲۸۷ھ میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں البتہ کتابوں کی فراہمی کے لئے جو اپیل ۱۲۸۴ھ میں کی گئی تھی اس کا نتیجہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۳۱۴ پر یہ ارقام فرمایا ہے کہ "تعلیم و تدریس کے ساتھ قیام دارالعلوم کے ابتدائی دنوں سے کتب خانہ کے دونوں ہی شعبوں (تدریسی و غیر تدریسی) کی طرف پوری توجہ کی گئی۔ ہر سال کی روداد میں اسی اہم علمی ضرورت کی طرف مختلف الفاظ میں مسلسل اور موثر اپلیں شائع ہوتی رہیں جن کا بحمد اللہ اچھا خاصہ اثر ہوا۔ گویا اپنے اپنے مطبع اور تجارتی کتب خانوں کی کتابوں کے چند نسخوں کا (جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے) دارالعلوم کے کتب خانہ میں داخل کرنا رفتہ رفتہ ایک رسم اور دستور کی صورت بن گیا۔ انتہا یہ ہے کہ علاوہ مسلمانوں کے اس سلسلہ میں غیر معمولی فراخدلی کا ثبوت منشی نولکشور نے بھی پیش کیا۔ ۱۲۸۷ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ "امداد کتب کی نسبت جو سال گزشتہ یعنی ۱۲۸۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ بہت سے اہل محبت نے اس طرف توجہ فرمائی اور بہ ارسال کتب قیمتی و کارآمد مدرسہ کی امداد فرمائی" آگے اس کے بعد ہے کہ "بالخصوص منشی نولکشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی۔ اس کے بعد اسی روداد میں یہ توقع بھی ظاہر کی گئی کہ "امید ہے کہ اسی طرح (یعنی جیسے منشی نول کشور نے مدد کی ہے) اور صاحبان مطابع بھی امداد فرمائیں کہ ان کو آب از دریا بخشیدن ہے اور یہاں کام روشنی چراغ سحری کا ہے۔"

دارالعلوم کی زندگی کا چھٹا سال

جناب مفتی محمد شفیع صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے صفحہ ۱۴ پر ارقام فرمایا ہے کہ اس سال جامع مسجد دیوبند کی بنیاد جاری ہوئی، حاجی عابد حسین صاحب مہتمم مدرسہ کو اس کام میں نہایت مشغولی رہی اس لئے مدرسہ کے مہتمم مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم تجویز ہوئے۔ شروع ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ سے وہ مہتمم بنائے گئے۔ اس وقت تک مدرسہ ایک کرایہ کے مکان میں تھا۔ اسی سال ایک اعلان ضرورت تعمیر مکان کا کیا گیا۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے لکھا ہے کہ "دارالعلوم چھتے کی مسجد کے بعد قاضی کی مسجد میں اور پھر کرایہ کے مکان میں اور بعد ازاں چند سال جامع مسجد کے حجروں میں رہا (انوار قاسمی صفحہ ۲۶۶) ایک جگہ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کرایہ کے مکان سے منتقل ہونے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ مالک مکان برابر کرایہ میں اضافہ کا طالب رہتا تھا۔ بہر حال اسی سال بقول مولانا مفتی محمد شفیع ضرورت تعمیر مکان کا اشتہار دیا گیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں طلبا کی کثرت اور اس کی روز افزوں مقبولیت کی بناء پر یہ بات ارباب دارالعلوم نے شدت کے ساتھ محسوس کی کہ دارالعلوم کی اپنی الگ عمارت ہونی چاہئے۔ مفتی عزیز الرحمٰن نے تذکرۃ مشائخ دیوبند کے صفحہ ۱۹۱ میں لکھا ہے کہ "کچھ دنوں تک مدرسہ چھتہ کی مسجد میں چلا۔ اس کے بعد جب طلبہ زیادہ ہوئے تو قاضی کی مسجد میں اور دوسرے مکانات میں تبدیل ہوتا رہا۔ چنانچہ چند سال تک جامع مسجد میں رہا لیکن طلبہ کی زیادتی کی وجہ سے ضرورت ہوئی کہ مدرسہ کا قیام کسی کشادہ جگہ پر ہونا چاہیئے اور اسے علاحدہ شکل دینی چاہیئے۔" اس سال کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اکابر دیوبند نے آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ دارالعلوم کو اپنی ایک الگ اور کشادہ عمارت میں منتقل ہونا چاہیئے۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں اس اشتہار کا ذکر کیا جو بقول مولانا مفتی محمد شفیع اس سال کی روداد میں کیا گیا۔ جناب گیلانی نے لکھا ہے کہ اسی سال یعنی ۱۲۸۸ھ میں" جو قیام مدرسہ کا چھٹا سال تھا۔ ایک طویل الالفاظ

اپیل روداد میں شائع کی گئی جس میں مدرسہ کے لئے ایک مستقل عمارت کی تحریک پیش کی گئی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا یہ ایک خاص ورق اور اہم تاریخی دستاویز ہے (جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے) اس میں پہلے تو مدرسہ کی مکانی دشواریوں کا ذکر کیا گیا۔ کرایہ کے جن مکانوں میں اس وقت تک مدرسہ تھا کچھ ان کی حالت، درسگاہ طلبہ کی قیام گاہ، کتب خانہ کا مکان، ان سب میں کافی فاصلہ، نیز درسگاہ کے تنگ غیر تدریسی مکان میں پڑھانے والے اور پڑھنے والوں کو جو دقتیں پیش آ رہی تھیں مثلاً اجتماعی تدریس کی وجہ سے شور کا بلند ہونا اور شور کو محسوس کر کے "ہر شخص کو اس ضرورت سے کچھ آواز بلند کرنی ہوتی ہے اور جتنی جتنی آواز بلند ہوتی جاتی ہے اتنا ہی شور بڑھتا ہے"۔ پھر قصبہ ہونے کی وجہ سے وسیع مکانوں کی دستیابی میں ناکامی، سب سے دلچسپ اطلاع یہ ہے کہ قصبہ والوں کے خام کچے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو کرایہ پر مدرسہ نے جو لیا تھا تو جہاں اس دیوبند میں ایک طبقہ ان مسلمانوں کا تھا جو سب کچھ مدرسہ پر نچھاور کر رہا تھا وہیں روداد کے اس فقرہ کو پڑھ کر کہ "مکان مدرسہ اول تو کرایہ کا ہے اور ہر سال نیا معاملہ کرنا ہوتا ہے اور مالک مکان کے بہ سبب اس کے کہ حاجت مند جانتے ہیں، ہر سال کچھ نہ کچھ کرایہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں" کم از کم میری گردن تو جھک گئی مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی اور پڑتی چلی جا رہی تھی اس کی تہ میں ٹٹولنے سے کچھ اس قسم کے اسباب کا نشان ملتا ہے۔ بہر حال یہ اور اسی قسم کے متعدد اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں مجلس شوریٰ کی اس تجویز سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ "ایک مکان وسیع، با فراغت جس میں کہ قریب ایک سو طلبہ بہ آرام رہ سکیں اور چار یا پانچ درسگاہیں بھی ہوں اور رفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اسی میں تیار ہو، آج دارالعلوم کی فلک پیما، کوہ ہیکل عمارتوں کا سلسلہ طویل و عریض رقبہ میں پھیلا ہوا ہے یہی پہلی تجویز (اور بقول مولانا محمد شفیع اشتہار) اسی تناور درخت کا تخم اول تھی" (سوانح قاسمی حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۳۔ ۳۲۲) اس سال کا دوسرا اہم واقعہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ حاجی محمد عابد حسین کی دارالعلوم کی مہتمی سے سبکدوشی اور حضرت شاہ رفیع الدین کی اس عہدہ پر دوبارہ تقرری ہے۔ آپ اس سال ۱۲۸۸ھ میں دارالعلوم کے مستقل مہتمم بنا دیئے گئے اور اسی عہدہ پر ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء تک قائم رہے اور آپ کے اور مولانا محمد قاسم صاحب کے درمیان وہ اتحاد فکر و عمل تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔ خود انہوں نے روایات الطیب ارواح ثلاثہ کے صفحہ ۲۵۸ میں اس کی نشاندہی ہے یہ روایت مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ہے وہ فرماتے ہیں کہ "مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ ایسی مناسبت تھی کہ جو کچھ مولانا کے قلب پر وارد ہوتا تھا اس کا خیال مجھے بھی گزرتا تھا اور حضرت قبلہ والد مرحوم نے اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا کہ حضرت مولانا رفیع الدین فرمایا کرتے تھے کہ حضرت نانوتوی نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام خود نہیں فرمایا بلکہ اہتمام کے لئے مجھے طلب فرمایا اور میں وہی کرتا ہوں جو انہیں منکشف ہوتا ہے۔ علم ان کا ہے اور عمل میرا ہے۔ ان کے منشائے علمی و کشفی کو میں سمجھ کر فوراً عمل درآمد کرتا ہوں۔ مفتی عزیز الرحمٰن نے مشائخ دیوبند کے صفحہ ۱۹۵۔ ۱۹۴ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "دارالعلوم دیوبند کے اہتمام سے بیشتر آپ باہر جنگل میں رہا کرتے تھے۔ جب آپ کو مہتمم بنانے کا خیال ہوا تو کچھ آدمی آپ کو لینے کے لئے گئے مگر آپ نے انکار فرما دیا۔ اس کے بعد حضرت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نے حضرت مولانا محمود حسن کو ایک رفیق کے ساتھ بلانے کے لئے بھیجا۔ حضرت حجۃ الاسلام کا پیغام سن کر آپ فوراً تشریف لے آئے، (علمائے حق) آپ نے انتظام اور اہتمام کا کام اتنے حسن و خوبی سے انجام دیا کہ لوگ حیران تھے اسی طرح سے دستار بندی کا جلسہ ہوا تو اس کا بھی انتظام نہایت خوبی سے کیا، چنانچہ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ تو خیر جلسہ ہے، ہم کو تو اگر سلطنت بھی سپرد کر دی جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا بھی ایسا ہی سہولت و اطمینان اور حسن و خوبی کے ساتھ انتظام کر کے دکھا دیں (اشرف السوانح صفحہ ۱۳۹) مولانا محمد طیب صاحب اپنے والد ماجد یا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ "اہتمام کے علاقہ میں آنے کے بعد جب میں نے تعمیرات کی طرف توجہ کی تو دیکھا کہ جس جگہ نالی بنانے کی ضرورت محسوس کی اس کی جگہ نالی کا نشان پایا کہ جس کو شاہ رفیع الدین صاحب نے بنوا کر بند کرا دیا تھا۔"

دارالعلوم کی زندگی کا ساتواں سال

۱۲۸۹ھ کا یہ سال دارالعلوم کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ اس سال ۱۲۸۳ھ میں داخل ہونے والے طلبہ کا آخری سال تھا۔ جناب مفتی عزیز الرحمٰن نے تذکرہ مشائخ دیوبند کے صفحہ ۱۹۱ پر تحریر فرمایا ہے کہ دارالعلوم کا سب سے "پہلا دورہ اس سال ہوا"۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے صفحہ ۴۱ پر ارقام فرمایا کہ اس سال چند طلبہ کو سند فراغ دی گئی جن میں حضرات ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۱ مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی ۲ حضرت مولانا فخرالحسن گنگوہی ۳ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ۴ مولانا قاضی جمال الدین صاحب نیشاپوری۔ ۵ مولانا محمد فاضل صاحب ساکن پھلت ۶ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی ۷ مولانا فتح محمد صاحب تھانوی۔ مولانا مفتی محمد شفیع نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی سال حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے دارالعلوم میں تاریخ یمنی وغیرہ کتب کا امتحان دیا۔ اس سال کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم میں حدیث پڑھی، پھر آخر میں معقولات کی تکمیل دیوبند میں کی۔ مولانا مناظر حسن دیوبندی نے سراج الارواح میں لکھا ہے کہ حکیم محمد حسن صاحب برادر حضرت شیخ الہند نے اس سال شرح وقایہ کا امتحان دیا۔ مگر تعجب ہے کہ انہوں نے شیخ الہند اور مولانا عبداللہ جلال آبادی کا نام نہیں لیا جنہیں اگلے سال دستار فضیلت ملنے والی ہے۔ اس سال کی روداد میں پھر منشی نولکشور کا ذکر ہے اور انہوں نے جو کتابیں مدرسہ کو دیں اس میں قاموس کا خاص طور پر روداد میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اور بڈھانہ کے ایک ہندو ایڈیٹر بھی دارالعلوم کو اپنا اخبار بھیجتے تھے اور جس کا شکریہ بھی روداد میں ادا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جناب عبدالرحمٰن شاکر مالک مطبع نظامی کا بھی اس روداد میں ذکر ہے جن کا اخبار نورالانوار برابر دارالعلوم میں آرہا تھا۔ اسی طرح میرٹھ کے اخبار نجم الاخبار کا بھی اس سال کی روداد میں تذکرہ ہے جس میں مدرسہ کی حمایت میں مضامین شائع ہوئے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کا آٹھواں سال

۱۲۹۰ھ کا سال گذشتہ سال کی طرح دارالعلوم کی زندگی میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔ جناب مولانا مفتی محمد شفیع نے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں تحریر فرمایا ہے کہ ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو پہلا جلسہ دستار بندی جامع مسجد زیر تعمیر میں ہوا۔ پانچ فارغ التحصیل علماء کو دستار فضیلت دی گئی روداد ۱۲۹۰ھ صفحات میں اس جلسہ کی قابل دید کیفیات درج ہیں۔ بڑے بڑے مشائخ کا اجتماع ہے۔ حضرت مولانا نانوتوی کی عجیب تقریر درج ہے۔ اسی روداد میں حضرت نانوتوی کی تقریر جلسہ اور فارغ التحصیل حضرات سے سوالات و جوابات کی تفصیل بھی درج ہے۔ جناب مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی کے صفحہ ۲۷۵ میں تحریر فرمایا ہے کہ "۱۹ر ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۴ء میں یہ جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا۔ گویا عصری یونیورسٹیوں میں کانووکیشن کے اجلاس کی جو نوعیت ہوتی ہے کچھ اس طرز کا یہ جلسہ تھا۔ اطراف وجوانب سے بھی کافی تعداد مہمانوں کی اس تعلیمی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دیوبند پہنچی تھی۔ منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت اس تعلیمی جلسہ کی یہ بھی نظر آئی کہ جن علوم وفنون کی تعلیم فارغ ہونے والے طلبہ کو دی گئی تھی ان میں سے کسی فن اور علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے، یہی مقالے لوگوں کو سنائے گئے۔ یہ بھی روداد میں شائع کردیئے گئے جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیوبند کے اس مدرسہ کا تعلیمی معیار کتنا بلند ہو چکا تھا۔ گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ مختلف یونیورسٹیوں کے آخری مدارج مثلاً ایم۔ اے یا ریسرچ وغیرہ کی کلاسوں میں جیسے مقالے اب لکھوائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم کے تعلیمی نظام میں ایک سو پانچ برس پہلے یہ سنت جاری ہو چکی تھی"۔ جناب مفتی عزیز الرحمٰن نے تذکرہ مشائخ دیوبند کے صفحہ ۱۹۱ پر جن پانچ اکابر کو اس کانووکیشن میں سند فراغت دی گئی یا جن کے دستار فضیلت باندھی گئی ان

کے نام (علمائے حق مصنفہ مولانا محمد میاں کے حوالہ) اس طرح دیتے ہیں ۱۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند ۲۔ مولانا عبد الحق صاحب ساکن پور قاضی ۳۔ مولانا فخر الحسن گنگوہی ۴۔ مولانا فتح محمد تھانوی اور ۵۔ مولانا عبد اللہ صاحب جلال آبادی۔

روداد

اس سال کی روداد کا عنوان ہے۔ روداد دار العلوم برائے ۱۲۹۰ھ اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "اس سال میں متعدد طلبہ نے مجوزہ نصاب تعلیم کی تکمیل کر کے سند فراغ اور انعام حاصل کیا۔ امتحان سالانہ مثل سابق کے ہوا۔" اسی روداد میں آگے چل کر یہ تحریر ہے کہ مجلس شوری کے امسال کے ارکان حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ۲۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۳۔ حاجی عابد حسین دیوبندی ۴۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ۵۔ منشی فضل حق صاحب دیوبندی اور ۶۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی" اس روداد کے مطابق ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو ارباب مشورہ مذکورۃ الصدر نے مدرسہ کے جملہ حسابی کتاب کا غذات کا معائنہ فرما کر اس کی درستی وصفائی پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرما کر اپنے دستخط فرمائے۔ نقل عبارت۔ آج ۲۲ ذلیقعدہ ۱۲۹۰ھ کو معائنہ زر نقد وبقیہ کا کیا گیا۔ سب درست وموجود پایا۔ دستخط مذکورہ بالا حضرات۔

سالانہ آمد وصرف

اس سال کی آمدنی 1980/13/6

اور خرچ 600/12/- روپے

جلسہ عطائے اسناد وتقسیم انعام

جیسا کہ جناب مناظر احسن گیلانی نے اوپر تذکرہ فرمایا دار العلوم دیوبند کے پہلے کانوکیشن کا حوالہ روداد دار العلوم دیوبند برائے ۱۲۹۰ھ کے مطابق یہ ہے" ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ یوم جمعہ مطابق ۹ر جنوری ۱۸۷۴ء کو دیوبند کی جامع مسجد میں جہاں مدرسہ حسب تجویز اکابر منتقل ہو گیا تھا۔ ایک نہایت ہی بارونق وبابرکت جلسہ ہوا۔ ہزارہا اہل اسلام وصدہا خیر خواہان دار العلوم مختلف اضلاع اور قصبات سے تشریف لائے۔

ممتاز شرکا

شرکائے جلسہ میں سے قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، جناب مولانا نور اللہ صاحب ساکن گلاؤٹھی، جناب قاضی اسمٰعیل صاحب منگلوری، حاجی محمد ہاشم صاحب مالک ہاشمی پریس میرٹھ، حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری، منشی محمد صدیق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نہر جمن، مولانا ذوالفقار علی صاحب، منشی محمد حیات صاحب مدیر نجم الاخبار وغیرہ وغیرہ۔

جلسہ کا آغاز

بعد ادائے نماز جمعہ حضرت مولانا محمد قاسم نے منبر پر کھڑے ہو کر نہایت ہی موثر تقریر فرمائی اور اس کے بعد ایک تحریر من جانب خواجہ ابو الحسن صاحب دہلوی پڑھی گئی۔ اس کے بعد فارغ التحصیل طلبہ یعنی مولانا عبد الحق صاحب ساکن پور قاضی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولوی فتح محمد تھانوی اور مولوی عبد اللہ صاحب جلال آبادی کے وہ تحریری جوابات جن کو انہوں نے بوقت امتحان تحریر فرمایا تھا مجمع میں پڑھ کر سنائے گئے۔ اس کے بعد حضرات اکابر مدرسہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ان پانچوں یگانہ روزگار فارغ التحصیل طلبہ کے سر پر دستار فضیلت باندھی اور سند فراغت عطا کی۔ منشی مخدوم احمد صاحب سررشتہ دار گردام ورکی نے ایک ایک قطب نما ان پانچوں فارغ التحصیل حضرات کو اپنی طرف سے انعام میں مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دار العلوم نے امتحان سالانہ کی کیفیت پڑھ کر سنائی اور طلبہ کو درجہ بدرجہ انعام تقسیم ہوا۔ اور حاضرین جلسہ نے مدرسہ کی ترقی ومروج تعلیم وتعلم کے احیا کے لئے دعا کی اور جلسہ برخاست ہوا۔

کانوکیشن ایڈریس

اس جلسہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نے جو تقریر پُرتاثیر فرمائی۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے
جس کے پڑھنے سے ایک خاص کیفیت قلب میں پیدا ہوتی ہے

الحمد لله ونحمده ونستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من
شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي
له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان محمدا عبده ورسوله۔
اللهم صل على سيدنا محمد النبي الامي وازواجه امهات المومنين وذريته واهل بيته
كما صليت على سيدنا ابراهيم انك حميد مجيد اللهم انزله المقعد المبارك عندك اليوم
القيامة۔ لاکھ لاکھ شکر ہے اس خداوند بندہ نواز کا کہ جس نے ہم کو آدمی بنایا اور قابلیت علم
اور چراغِ عقل عنایت فرمایا جس کے باعث تمام موجودات سے افضل ہوجانے کی لیاقت ملی
اور خلافۃ الارض کی قابلیت عطا ہوئی۔ اور درود نا محدود اس خلاصۂ موجودات سرورِ کائنات
افضل انبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جس کو افضل کتب یعنی قرآن مجید اور عمدہ ترین
ادیان یعنی یہ دین متین عطا فرمایا اور ہم کو ان کی غلامی سے شرف اعزاز عنایت فرماکر حسب قول

شاہ حسن عسکری شہید
حیات اور کارنامے

یہ حریت پرور داستان اس عظیم مجاہد کی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا رکنِ رکین اور ابوظفر بہادر شاہ کا روحانی پیشوا تھا اور جسے اس جنگِ آزادی کی قیادت کے نتیجے میں تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا اور اس طرح اسے شہادت کا عظیم مرتبہ اور منزل نصیب ہوئی۔

یہ کتاب بھی جسے سید اشتیاق اظہر نے تحریر کیا ہے، عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

کنتم خیر اُمتہ کرامت فرمایا۔ بعد حمد و صلوۃ تمام برادران اہل اسلام خصوصًا اہل دیوبند کی خدمت میں بہ کمال خیرخواہی یہ گذارش ہے کہ شرافت انسانی علم پر ہے۔ رکوع۔ واذ قال ربک کو دیکھئے تو باعث سجدۂ ملائک اور خلافت آدم یہی علم تھا جس میں حضرت آدم علیہ السّلام ملائکہ سے اول نمبر نکلے۔ قرآن مجید جو تمام کتب آسمانی اور مکتوبات زمینی سے افضل ہو گیا تو علاوہ دیگر محاسن بشہادۃ آیۃ تبیانا لکل شئی یہی تھا کہ یہ کتاب ام العلوم اور جامع العلوم ہے۔ ہمارے پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم جو اور انبیا سے افضل ہوئے تو منجملہ اور کمالات عمدہ وجہ افضلیت موافق اشارہ حدیث علمت علم الاولین' جس سے آپ کا جامع العلوم ہونا ثابت ہوتا ہے یہی کمال علمی تھا جو انبیا کا خاص منصب ہے اور بلکہ انبیا و صدیقین کو جو شہدا اور صالحین سے یہ شرف و امتیاز حاصل ہوا کہ کلام اللہ میں اول اُن کو ذکر فرمایا اِن کو بعد میں تو اس کا باعث بھی یہی تھا کہ شہدا اور صالحین اگر بوجہ عمل اوروں پر شرف رکھتے ہیں تو انبیا اور صدیقین بوجہ علم ان سے بھی اشرف ہیں۔ اور کیوں نہ ہو خداوند علیم تو یوں فرماتا ہے۔ قل ہل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اے ہمارے حبیب سنا کر کہہ دو کہ کہیں جاہل بھی عالموں کے برابر ہو سکتے ہیں' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ ففضل العالم علی العابد کفضلی علی ادنا کم جس کا مطلب یہ ہے کہ عالم کی بزرگی عابدوں پر اس قسم کی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ پر الغرض آدمی کی خوبی اور اس کا عمدہ جوہر یہ علم و عقل ہے۔ مگر افسوس کہ اس زمانہ میں اور خوبیاں تو کچھ نہ کچھ باقی ہیں مگر علم خاص کر علم دین اُٹھا چلا جاتا ہے۔ جس میں سادات اور شیوخ وغیرہم جو قدیم سے اس کمال میں اوروں سے ممتاز رہا کرتے تھے آج کل اس سعادت سے بالکل بے بہرہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس وجہ سے کون سی آوارگی کی بات نہیں جو ان میں نہیں۔ گانے بجانے۔ رنڈی بازی۔ شراب خوری وغیرہ کی جو روز بروز ترقی ہے تو وجہ ان سب خرابیوں کی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس کام کو چھوڑ دیا جس کے باعث سے سب سے ممتاز تھے۔ افلاس پر افلاس جو اہل اسلام خصوصًا شرفا میں برابر چلا آتا ہے اس کا باعث بجز اس کے کیا ہے کہ اہل اسلام میں علم و ہنر نہ رہا۔ یہ جوہر اہل اسلام خصوصًا ان چار قوموں کے حق میں فقط موجب امتیاز دین ہی نہ تھا بلکہ سرمایۂ دنیا بھی ان کے حق میں یہی تھا۔ اور قوموں کے اگر اور پیشے تھے تو سادات و شیوخ وغیرہم کا پیشہ یہی علم تھا۔ الغرض جب یہ حال دیکھا تو چند خیرخواہان بے غرض نے بنام خدا اس قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی طرح ڈالی اور تمام بنی آدم خصوصًا اہل اسلام کی بہبودی کی صورت نکالی۔ سو بحمد اللہ اپنے خیال سے بڑھ کر اس نے رونق پائی۔ اور یہاں کی دیکھا بھالی جا بجا مدرسے مقرر ہوئے اور اس آخری زمانہ میں علم کا پھر اسی طرح چرچا ہوا جیسا کہ گل ہوتے وقت چراغ سنبھالا لیا کرتا ہے۔ اور بحمد اللہ سینکڑوں آدمی اس دولت عظمیٰ سے اس مدرسہ میں آکر مستفید ہوئے اور تھوڑا بہت اپنی لیاقت کے موافق حصہ لے اُڑے۔ مگر سب دور و نزدیک کے رہنے والے جانتے ہونگے کہ اس مدرسہ کی بنا دیوبند والوں نے ڈالی۔ اس امر میں وہ سب کے امام ہیں۔ ہر چند اور باہر کے صاحب اس کار خیر میں شریک ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں ہی کا طفیل ہے۔ اور اس وجہ سے اگر یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کار خیر کا ثواب ملے گا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو عین مطابق قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم من سن بالسنۃ فلہ اجرہا و اجر من عمل بہا الیٰ یوم القیامۃ' او کما قال۔ واقعی اہل دیوبند نے یہ وہ کام کیا ہے کہ قیامت تک صفحہ روزگار پر ان کی یادگاری رہے گی۔ یہ مدرسہ ہمیشہ ہمیشہ اہل دیوبند کی یادگاری کا باعث رہے گا۔ چونکہ اور اکثر مدارس اس مدرسہ کی دیکھا بھالی مقرر کئے گئے یا کئے جاتے ہیں تو گو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پا جائے پر اہل عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پرتوا ہوگا اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو یہ ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں جو اہل سلطنت نے بہ رفاہ عام کئے ہیں۔ بہ ایں ہمہ کھانے

کی امداد میں طالب علموں کے ساتھ جو دلسوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کریں۔ فرشتوں نے اگر طالبان علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تھے تو انھوں نے ان کے سر پر دست شفقت رکھا۔ ماں باپ کو بھلا دیا دیوبند کو مثل گھر بنا دیا۔ یہ وہ خاص بات ہے جس میں شہر کا زچندہ میں سے کوئی ان کا شریک سہیم نظر نہیں آتا۔ اس کے عوض میں خداوند کریم یہاں کے باشندوں کو دارین میں جزا کامل عطا کرے۔ بالجملہ اس دولت بے زوال سے' بدولتنا اہل دیوبند عالم مستفید ہے۔ مگر افسوس بلکہ ہزار افسوس کہ اہل دیوبند اس دولت بے زوال سے جیسی چاہیئے بہرہ مند نہیں بلکہ ان کے حق میں یہ مدرسہ ایسا تھا جیسے کہا کرتے ہیں گھر گنگا آگئی مگر اس پر بھی اس نعمت کا ذائقہ نہ چکھا اور اس دولت کا مزہ نہ اڑایا بدستور خواب غفلت میں سوتے رہے۔ آنکھ کھول کر نہ دیکھا کہ یہ کیا نیا تماشہ ہے۔ کان کھول کر نہ سنا کہ یہ کیا چرچا ہو رہا ہے۔ دور دراز سے لوگ آئے اور اس دولت کو لوٹ لے گئے پر یہاں کے باشندے ویسے ہی خالی دامن پڑے رہے۔ ہائے افسوس اس مدرسہ کی خبر جس کے باعث دیوبند کا نام چار کھونٹ میں پہنچ جائے دیوبند والوں کے کان میں نہ پہنچے۔ چند ہند کے طالب علم جو شوق علم سے مکہ معظمہ میں پڑھتے تھے دیوبند کے مدرسہ کا چرچا سُن کر گرتے پڑتے مدرسہ دیوبند میں آپہنچے۔ مگر کیا حسرت کی بات ہے کہ دیوبند والوں سے مدرسہ تک نہ پہنچا گیا۔ اطراف و جوانب کے لوگ شوق تماشا میں مدرسہ دیوبند کو آکر دیکھیں مگر دیوبند کے طالب علم کبھی بھولے بسرے بھی ادھر کو آنکلے۔ طالب علموں میں اگر گنئے تو دیوبند کا کوئی لڑکا نکلے گا۔ اگر اطفال و نوجوان دیوبند کسی اپنے کار ضروری میں تحصیل علم کی فرصت نہ پاتے تو عذر کی گنجائش تھی' پر رنج تو اس کا ہے کہ فارغ البال شب و روز گائیں بجائیں' زٹل قافیہ بکتے جائیں ہاں علم کے حاصل کرنے میں دو چار گھڑی کی تکلیف بھی نہ اٹھائیں۔ اگر بزرگان اطفال نصیحت فرماتے اور اطفال نوجوان اپنی بہبودی کی طرف دھیان لگاتے تو یہ دولت تنہا باہر کے طالب علم ہی نہ لے جاتے۔ صاحبو بے غرضانہ ہمارا یہ التماس ہے کہ آپ صاحب اس نعمت عظمیٰ کو غنیمت جانیں ہم گنہگار آپ صاحبوں کی خاطر اس مدرسہ کی خدمت گزاری کے لئے بجان و دل حاضر ہیں۔ اس التماس پر غور فرمائیے کہ ہمارا کیا فائدہ ہے اور آپ کا کیا نقصان ہے۔ جو لوگ کہ اس کے کارپرداز ہیں اس کے عوض دام درم کے طالب نہیں بلکہ اور الٹے ممنون احسان ہوں گے کہ آپ صاحبوں نے اس ہماری خدمت گزاری کو قبول فرمایا اور ہم کو اپنا خیر خواہ سمجھا۔ اگر تمام اہل اسلام خصوصاً اہل دیوبند اپنے لڑکوں کی تربیت اور تعلیم اس مدرسہ میں کرادیں تو لاریب اس کار خیر کی طرف اور زیادہ متوجہ ہوں اور اس سبب سے یقین واثق ہے کہ چند روز میں اس مدرسہ کو ترقی روز افزوں ہو اور سرمایہ دنیا و آخرت تھوڑی سی توجہ میں سب کے لئے ہاتھ آجائے۔ ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ اس نامی مدرسہ نے باوجود اس شہرت اور حسن انتظام کے جو اس کی ہر پہلو سے نمایاں ہے اور اس کے حساب کتاب کی صفائی سے مثل آفتاب روشن ہے ویسی ترقی نہ پائی جیسی اس کی شہرت ہے اور وہ رونق نہ حاصل کی جیسی اس کی قدر و منزلت ہے۔ باعث اس کا بجز کم توجہی اہل اسلام اور کیا ہے۔ ہر چند بڑا سبب اس کم توجہی کا یہی ہے کہ اہل اسلام زمانہ حال اس دولت کے مزے اور اس سعی کی لذت سے ناآشنا ہیں اور اس کے ثواب اور درجوں سے بے خبر۔ اگر یہ جانتے کہ کوئی مصرف مصارف دینی یا دنیوی میں اس مصرف کے برابر نہیں تو وہ نواب و رئیس جو سخاوت خداداد بھی رکھتے ہیں داد و دہش میں ہرگز تامل نہ کرتے۔ پر اس کم توجہی سے ہم کو فقط یہی افسوس نہیں کہ اس دیوبند کے مدرسہ کے شریک نہ ہوئے بلکہ یہ افسوس اس سے زیادہ ہے کہ امرا رئیس نہ علم رہا نہ علم کی طلب رہی نہ قدر رہی۔ بہرحال بڑا سبب اس مدرسہ کے ترقی نہ پانے کا تو جہل ایثار روزگار ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں نام امانت اٹھ گیا۔ مال جیسی عزیز چیز کا دینا جو جان پر کھیل جانا ہے بے اطمینان بہت دشوار ہے خاص کر ایسے لوگوں کے حوالہ کر دینا جو قلیل المعاش ہوں

اور علوم دین کے کارپرداز ہوں کیسی خدا ترس بے جگر کا کام ہے ۔ یہ امانت اور خیانت چھپی نہیں رہتی ۔ مدرسہ کا آٹھ برس کا حساب کتاب مثل آئینہ صاف ہے ہر صاحب کو اجازت عام ہے کہ آئیں اور اطمینان کر جائیں اور اس آنے میں ہم کو اپنا ممنون احسان سمجھیں ۔ کیونکہ اپنی برأت اور مدرسہ کی ترقی اور اہل اسلام کی بہبودی کا باعث ہے ۔ علاوہ ازیں ہم یہ جانتے ہیں کہ دیوبند کے باہمت لوگوں کا نام جنہوں نے مال سے یا کھانے سے اس مدرسہ کی امداد فرمائی ہے اور نیز اور شرکاء کا نام خوب مشہور ہو جائے اور اہل عقل اور فہم کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ کارخانہ کس غرض سے برپا ہو رہا ہے ۔ بھائیو جو لوگ اس مدرسہ کے حق میں ساعی ہیں ان کو کوئی مطلب ذاتی نہیں جس کے باعث سے کسی صاحب کو اور کچھ خیال ہو ۔ ہاں یہ کہئے کہ آپ صاحبوں کی بہبودی میں ہمارا بھی مطلب ہے بلکہ بڑا مطلب ہے ۔ اب خاص باہر کے لوگوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ ہم مفلس تو تمام اہل اسلام کے لئے اپنی سعی کر گزرے پر باقی اہل ہمت نے بہت دریغ فرمایا خاصکر رؤسائے اطراف و جوانب نے ہرگز کچھ توجہ نہ کی اور یہی نہیں تو دنیا کے مصارف کی دھن میں یہ مدرسہ کیونکر چل سکتا ہے ۔ اگر گھر پیچھے ایک پیسہ مہینہ اور ایک آٹے کی چٹکی ہر روز اس مدرسہ میں آئے تو چندہ میں بہت افزائش ہو جائے اور طالب علموں کو جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں کھانے کی طرف سے اطمینان ہو حسرت کا مقام ہے کہ تمام امراء اطراف و جوانب اپنے مصارف غیر ضروریہ میں جن کا ثمرہ نہ دنیا میں ملے نہ آخرت میں امانت رہے کیسے دل کھول کر بے دریغ بے حساب خرچ کریں اور یہاں اس کا عشر عشیر بھی دیگر سرمایہ دنیا اور آخرت فراہم نہ کریں ۔ اگر آخرت کا کچھ خیال نہ تھا تو فقط نیک نامی و شاباشی کا خیال کیا ہوتا ۔ تیسرا امراء اہل اسلام سے بڑا تعجب ہے کہ ایسی باتوں سے ایسی غفلت فرمائیں اور اس طرح خواب خرگوش میں پڑے گزاریں ۔ ان مدارس میں جن میں فقط علوم دنیوی پڑھائے جائیں لوگ کیسے جان و دل سے ہمت لگائیں اور تم صاحب اس مدرسہ میں جو تمہارا سرمایہ نیکنامی دنیا و آخرت ہے اور جس میں سب قسم کے علوم پڑھائے جاتے ہیں اور اس کی بڑی تعلیم علوم دینی کی تعلیم ہے اتنی تھوڑی سی توجہ نہیں فرماتے ۔ اس آخری زمانہ میں اگرچہ جملہ علوم کی تحصیل میں اہل اسلام خصوصاً شرفا کوتاہی کرتے ہیں مگر خاصکر علوم دین میں سب سے زیادہ کوتاہی آگئی ۔ تماشے کی بات ہے کہ سرکار انگریزی باوجود اس شوکت و قوت سلطنت کے اپنی رعایا کو در بارہ مذہب مطلق العنان اور آزاد کر دے ۔ ادھر دنیا و آخرت میں اہل اسلام کو اپنے علوم سے اعزاز حاصل ہو خدا اور رسول کے نزدیک وہ درجے اور وہ مرتبے ہوں پھر بھی ہم نہ سمجھیں اور دولت علم سے کامیاب نہ ہوں اور چندہ نقد اور سامان خوراک سے مدد نہ فرمائیں ۔ ہر چند امراء اطراف و جوانب کی اتنی امداد بھی قابل شکر یہ ہے کہ انہوں نے اپنے غیر وطنوں کے مدرسہ میں دور بیٹھے مدد فرمائی مگر جب دیکھا جائے کہ یہ کام خاص دیوبند والوں کے حق میں نافع نہیں ایک رفاہ عام ہے کسی کی تعلیم کی کوئی تخصیص نہیں کہ بعد لحاظ اس امر کے کہ مصارف غیر ضروریہ میں بہت دل کھول کر اکثر صاحب خرچ کرتے ہیں یہ اتنی توجہ بہت تھوڑی ہے کہ جمیع علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم اور ان کی استعداد حاصل کرنے کے لئے یہ مدرسہ اور سہارنپور کا مدرسہ بلا تامل عمدہ سامان ہے ۔ اور انشاء اللہ یہاں کے طالب علم بشرط تکمیل باقی علوم قدیمہ اور جدیدہ کو بوجہ قوت استعداد بسہولت بہت جلد حاصل کر سکتے ہیں ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوت استعداد ہے ۔ فقط علوم دینی پر اکتفا نہیں کیا ۔ بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے جس کا عمدہ نتیجہ ۔ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم بڑی بڑی استعداد اور قوت کے اہل اسلام میں بکثرت ہوئے ۔ اس لئے ہم اس بات کو بالیقین سمجھتے ہیں کہ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم و فنون جدیدہ سے کامیاب نہ ہوتے ہوں پر ان کے حق میں یہ ان کی استعداد مثل استاد کامل تعلیم کے لئے کافی ہے اور مدارس میں اگرچہ بعض علوم جدیدہ کی تعلیم کی کثرت کے باعث طالب علموں

کو ایک مشق تازہ اُن علوم کی ایسی ہو جو یہاں کے طالب علموں کو نہ ہو۔ نیز بوجہ قوت استعداد اہل انصاف کے نزدیک بالمعنی ان علوم میں بھی اُن مدارس کے طالب علموں سے زیادہ ہی یہاں کے طالب علم سمجھے جائیں گے۔ بایں ہمہ اگر بالفرض بوجہ مشق نہ ہونے بعض علوم جدیدہ کے کچھ نقصان بھی متصور ہو تو بوجہ مفقود ہونے قوت استعداد علمی اور نہ ہونے علم دینی کے اُن مدارس کے طالب علم بدرجہا یہاں کے طالب علموں سے ناقص ہونے چاہئیں۔ اب ہم اُس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جاوے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تحریر کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا۔ منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص ہو اُس پہلو کا لحاظ چاہیے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔ سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ہاں علوم نقلیہ کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے ضروری سمجھا گیا۔ دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے۔ ہاں بعد تحصیل فنون دانشمندی جس کو خاص تحصیل استعداد ہی کے لئے تجویز کیا ہے اگر اور فنون قدیمہ و جدیدہ کو حاصل کیا جائے گا تو البتہ مقدار زمانہ تحصیل برابر رہے گا۔ اس تقدیم تاخیر سے مطلب بخوبی حاصل ہوگا اور استعداد ہر علم کی بخوبی حاصل ہوگی۔ اس لئے علوم نقلیہ اور ان کے ساتھ علوم دانشمندی کو داخل تحصیل کیا۔ اس کے بعد اگر طلبار مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو اُن کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہوگی۔ کاش گورنمنٹ ہند بھی قید عمر طلبار نو داخل کو اڑا دیں تاکہ یہ رفاہِ عام رہے اور سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد اسے کہا کرتے ہیں۔ بالجملہ یہ مدرسہ ایک ذخیرۂ خیر اور سرمایۂ علم و ادب و استعداد ہے جس کے طفیل سے آج خداوند ذوالجلال نے یہ دن دکھلایا کہ چند طالب علموں نے اکثر یہاں تعلیم پاکر استعداد کامل حاصل کی۔ ہر فن میں مناسبت معقول اور ہر علم میں لیاقت مناسب پیدا کر کے اقران و امثال میں ممتاز ہوئے جن میں سے پنجتن مولوی عبدالحق صاحب ساکن پور قاضی اور مولوی محمود حسن خلف الرشید مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی محمد فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ اور مولوی فتح محمد صاحب ساکن تھانہ بھون اور مولوی عبداللہ صاحب ساکن جلال آباد نے تحصیل معمولی سے فراغت پائی۔ ہر چند دریائے علم ایک دریائے ناپیدا کنار ہے جس کا تمام حاصل کر لینا طاقت بشری سے باہر ہے مگر استعداد علمی جس پر مدار فضیلت ہے بحمداللہ کہ ان پانچوں کو حاصل ہوا۔ باقی اور آٹھ سات صاحب قریب تکمیل ہیں۔ سال آئندہ میں انشاءاللہ وہ بھی یہی منصب حاصل کرتے ہیں اس لئے یوں مناسب معلوم ہوا کہ بطور اعزاز و امتیاز ان کو سند فضیلت میں دستار فضیلت عنایت کی جاوے تاکہ ان کو اپنا پاس فضیلت رہے۔ ہمیشہ اس بات پر نظر رہے کہ کوئی بات خلاف منصب ہم سے سرزد نہ ہو اور سوائے ان کے اور اسلام کو اس بات کے دریافت کرنے میں کچھ دقت نہ ہو کہ کس سے دین کی یا علم کی بات پوچھیے۔ ادھر اور طالب علموں کو بھی یہ شوق دامنگیر ہو کہ تحصیل علم میں ایسی ہی کوشش کریں تاکہ ان کو بھی یہی منصب خدا عنایت کرے سوائے ان کے چند شرکار چندہ کو بھی اپنے صرف کا عمدہ نتیجہ آنکھوں سے نظر آجائے اور آئندہ کو شرکار سابق ہمت کو دوبالا کریں اور جو شریک چندہ نہیں ان کے لئے باعث گرمی طبع اور شوق امداد ہو۔ بہ نظر تفریح طبع حاضران جلسہ ان پنجتن کی استعداد دکھلانے کے لئے ایک ایک ان کی تحریر جو بعض سوالات کے جواب میں انہوں نے رقم فرمائی ہے سنا کر محظوظ کرتے ہیں تاکہ ہمارے دعوے کی دلیل بھی ہو اور شایقان جلسہ خوش ہو کر دل سے ان کی مزید قدر اور اصلاح دارین کی دعا کریں۔

کانووکیشن کا بقیہ احوال

کیفیت امتحان سالانہ مدرسہ عربی دیوبند بابت ۱۲۹۰ھ کے تحت اسی روداد میں یہ الفاظ درج ہیں: "خداوند کریم ذوالجلال والاکرام کا شکر ہے کہ یہ سال اس مدرسہ کا آٹھواں سال ہے کمال فضل الٰہی اور نہایت عنایت خداوندی کا ظہور ہے کہ طلبہ قابل انعام کی تعداد میں مقابلتاً سال گذشتہ بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اور پہلے برسوں کی نسبت تو بہت ہی زیادہ اضافہ ہوا اور جو طلبہ کم درجہ رہے ان کا عدد بھی نصف سے بڑھ کر رہا۔ الحمد للہ کہ امتحان نہایت ہی اچھا، امید سے نہایت بڑھ کر ہوا۔ امتحان کے قواعد بدستور قائم رہے۔ کافیہ تک تقریری ہوئی اور اس سے بڑھ کر تحریری امتحان ہوا۔ امتحان فارسی کا اور کتب ما سوائے عربی کا جناب مولوی سید احمد صاحب مدرس دوئم مدرسہ ہذا نے لیا۔ اور ہر ایک طالب علم کا سب کتابوں میں درجہ اور نمبر مقرر کیا۔ اور امتحان تحریری کے اکثر سوال تو مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول مدرسہ ہذا نے اور کچھ جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نے اور ہیئت اور بعض اور کتب کے جناب مولوی سید احمد صاحب نے سوال لکھے اور یہ سوال تجویز فرمائے اور اس وقت طلبہ کو لکھ کر دیئے بوقت تحریر جواب بندہ مہتمم (شاہ رفیع الدین) اور محمد سراج الحق منشی مدرسہ اور مدرسین نگرانی کرتے رہے۔ تاکہ کوئی سے یا ایک دوسرے کی مدد نہ لیوے، اور اظہار حال ہر ایک کا بخوبی ہو جائے اور اگلے دن ہر امتحان کے جوابات دیکھے گئے۔ بدستور سابق طلبہ کے نام کی بجائے۔ حروف، الف۔ بے تجویز کئے اور مدرس اول نے ان جوابات کو پڑھا اور مدرس دوئم و سوئم نے عدد نمبر تجویز فرمائے، اور حتی المقدور احقاق حق میں کہ مقصود درس مقرر سے تھا۔ کوشش مبذول رہی، اور بدستور کامل کے ۲۰ عدد مقرر کئے گئے اور جتنا کم اتنا کم اور اگر کچھ تحقیق زیادہ جواب سے یا کوئی عمدہ بات لکھی گئی تو اس کو ۲۱ یا ۲۲ عدد تجویز کیا۔ اس سال عدد انعاموں کا اتنا بڑھا کہ بظاہر صورت روپیہ کے اس کے اندازے پر کچھ بھی نہ تھے۔ فضل الٰہی شامل حال ہوا کہ چند اہل خیر نے دست ہمت کشادہ کیا اور کسی قدر روپیہ جمع ہوا ان کے نام نامی فہرست انعام میں درج ہیں اور جناب مولوی محی الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر سررشتہ تعلیم مظفرنگر نے جو چند عدد کتب بہ نظر انعام طلبہ عنایت فرمائے وہ بھی درج فہرست انعام کئے گئے۔ صورت تقسیم انعام یہ ہوئی کہ طلبہ قرآن خوانی کے چار مستحق انعام تھے، ایک لڑکا حفظ کرنے والوں میں سے کہ جس نے چند پارے پڑھے ہیں اور تین حافظ ان کے انعام کے واسطے ایک روپیہ چندہ انعام سے تجویز ہوا۔ باقی کتابیں قریب چار روپیہ کے کتب مولوی محی الدین سے ملیں اور عربی کے ۵۳ طلبہ کو ۱۹۴ انعام ملے جن میں طلبہ اعلیٰ کے ۷۰ انعام ہوئے۔ تخمیناً فی انعام ایک روپیہ اور طلبہ وسطی کے ۵۴ انعام ہوئے۔ فی انعام سات آنہ اور طلبہ ادنیٰ کے ۷۰ انعام ہوئے۔ تخمیناً پانچ آنے اور تجویز کتب انعام میں بدستور فرق کمی و بیشی عدد نمبر کا فرق ملحوظ رہا۔ بعض بڑی کتابوں کے کئی کئی ٹکڑے کر کے انعام دیا۔ اب مہتمم خداوند رب الانعام کے لیے الطاف کا شکر کرتا ہے اور مدرسین کی سعی مشکور اور طلبہ کی عنایت محنت کی داد دیتا ہے۔ اور خداوند مالک الملک وحدہ لاشریک سے دست بدعا ہے کہ جس طرح اس کریم کارساز نے اس مجمع پر اپنا ایسا انعام بے پایاں فرمایا۔ ہمیشہ دنیا و دین و آخرت میں ظاہر و باطنی اسی طرح اپنا فضل و کرم مزید فرماتا رہے۔"

کانووکیشن ایڈریس پر تبصرہ

ہمارے علوم جدیدہ کے نصاب تعلیم کی بنیاد جیساکہ لارڈ میکالے نے کہا تھا اور جس کا ذکر اپنے مقام پر ہوچکا تھا۔ ہندوستانی جسم اور فرنگی روح پر مشتمل نوجوانوں کی کھیپ پیدا کرنا تھی۔ اور یہی پالیسی برصغیر کی تقسیم کے وقت تک قائم رہی۔ اب ہماری مغربی تعلیم دینے والے اداروں میں اس بات کا رجحان عام ہو رہا ہے کہ تعلیم کا مقصد کلرک یا افسر پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ عام طالب علم کی استعداد بلند کی جائے اور اس کی بنیادی قابلیت میں اضافہ کرکے اسے زندگی کے نت نئے تقاضوں اور وقت کی اہم ضرورتوں اور زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنایا جائے۔ تعلیم اور وقت کی ضروریات کو ہم آہنگ کرنے کے مسئلہ پر تحقیق کے بعد یہ طے پا رہا ہے کہ تعلیمی نظام میں طالب علم کے اندر بنیادی قابلیت پیدا کرنے اور اس کی بنیادی استعداد کو مستحکم بنانے پر زور دیا جائے۔ اور تعلیمی زندگی کے ابتدائی ایام میں بنیادی طور پر اس مسئلہ پر توجہ دی جائے، تاکہ جب طالب علم اپنی تعلیمی ترقی کے عروج کی منزلوں میں جائے۔ تو وہ علوم جدیدہ اور سائنس کی برق رفتار ترقی کو اپنے اندر سمونے اور اس سے بیش از بیش استفادہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اور تعلیمی ترقی کی یہ نہج اور سمت ایک دم مقرر نہیں ہوگی بلکہ اس میں بھی کتنے ہی تعلیمی کمیشنوں کی تحقیق و تفتیش اور کتنے ہی ماہرین تعلیم کی غور و فکر کو دخل حاصل ہے۔ اور پھر بھی عرف عام میں یہی کہا جا رہا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام عہد حاضر کی تعلیمی ضرورتوں سے کما حقہ نبرد آزما ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ تعلیم پر اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے یونیورسٹیاں بن رہی ہیں۔ کروڑوں اور اربوں روپیہ کے خرچ سے فلک بوس اور عالیشان عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں مگر عہد حاضر کا طالب علم، علم کے میدان میں روز بروز پست ہو رہا ہے۔ اور اس کی ذہنی پستی کو دور کرنے کے لئے نت نئے خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ درسگاہوں کے امتحانی ڈھانچے میں بھی متواتر انقلاب انگیز تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں مگر ابھی یہ تعلیمی ترقی کی رفتار اور طلبہ کی علمی استعداد کے بارے میں اطمینان کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ذرا غور کیجیے کہ دیوبند جیسے گمنام قصبہ میں بیٹھ کر حکومت کی امداد و اعانت سے بے پرواہ علوم جدیدہ کے دبدبہ اور غلغلہ سے بے نیاز، مشرقی علوم، علوم قدیمہ اور نقلیہ کا خورشید حسن نصاب تعلیم کی جس بنیادی اور اہم شق کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اور آج سے ایک سو آٹھ برس پہلے کر رہا ہے اس پر موجودہ علمی ماہرین اب [illegible] پہنچ سکے ہیں حالانکہ بے چارے کوشش تو بہت کر رہے ہیں اور وہ شق یہ ہے کہ طلبہ کو ابتدائی تعلیم کے دور میں ان علوم و فنون کی تربیت دی جائے جس سے ان کی بنیادی صلاحیت اور استعداد میں اضافہ ہو دارالعلوم دیوبند کے پہلے جلسہ تقسیم انعامات کا بنیادی ایڈریس جو اس ادارہ کے سربراہ نے ۹ر جنوری ۱۸۷۴ء میں پیش کیا ان کی اسی فکر و فہم کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب لارڈ میکالے کی پالیسی کے تحت دھڑا دھڑ انگریزی مدارس قائم کئے جا رہے تھے جن کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ انگریزی نظام حکومت کے کل پرزے تیار کئے جائیں۔ دوم یہ تھا کہ ہندوستانی عوام کو اسلامی اور مقامی معاشرت سے بے نیاز بنایا جائے اور انہیں مغربی طرز فکر اور مغربی طرز حیات اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ان حالات میں دارالعلوم دیوبند کا قیام۔ اس میں علوم قدیمہ اور نقلیہ کی تعلیم اور اس کے نصاب تعلیم میں ان علوم و فنون کی شمولیت جو طالب علموں کو نہ صرف ان کے دین سے کما حقہ واقف کر سکیں بلکہ انہیں انگریزی معاشرت کی خرابیوں سے آگاہ کرکے انہیں مغربی طرز حکومت کے تحت دین و ایمان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی جرأت و ہمت دے سکیں اور سب سے اہم یہ کہ انہیں اپنے ملک کی آزادی کے لئے سرگرم عمل ہونے اور غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال دینے کے لئے مناسب حوصلہ و استقلال کا مالک بنا سکیں۔ ہاں دارالعلوم دیوبند کو علوم جدیدہ کی اہمیت سے انکار نہیں تھا۔ وہ انگریزی زبان کے بھی مخالف نہیں تھے لیکن وہ استبداد اور جبر کے خلاف [illegible] اور وہ یہ چاہتے تھے کہ ملک کے نوجوانوں اور خاص تر مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے وہ صاحب استعداد بن سکیں اس لئے کہ ان کی نگاہوں میں ہر صاحب استعداد اپنا نفع و نقصان اور اپنے ملک و ملت کا نفع و نقصان اچھی طرح سمجھتا ہے اور اگر وہ علوم قدیمہ و نقلیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علوم جدیدہ کی طرف توجہ کرنا چاہتا [illegible] یہ کہ وہ اپنی استعداد کے لحاظ سے

ان فنون و علوم کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو مناسب طور پر آمادہ اور تیار پاتا ہے بلکہ وہ ان علوم کے بظاہر خراب اثرات سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے جو اس نظام تعلیم کی بنیادی اساس تھے" جناب مناظر احسن گیلانی نے اپنی تصنیف سوانح قاسمی میں اس ایڈریس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جس زمانہ میں یہ تقریر ہوئی تھی اس وقت تعلیمی راہ سے مسلمانان ہند کی تربیت و اصلاح کے مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول (تربیت علم ہو یا خاص اس پہلو کا لحاظ چاہیے جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو) کی روشنی میں کیا ہونا چاہیے اس کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ ارشاد فرمایا گیا کہ "سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہیں کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ حاصل ہوئی ہوگی۔ جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ نہ علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم و فنون سے الگ تھلگ رہنا چاہیے جن سے ملک کی قائم ہونے والی حکومت سے روشناس کیا ہے توجہ صرف اس بات پر دلائی گئی کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم و فنون کے پڑھنے پڑھانے کا نظم وسیع پیمانے پر کیا جا چکا ہے اور آئندہ کیا جائے گا اور کیسا نظام وسیع کہ بقول حضرت والا (مولانا نانوتوی) اتنی سرپرستی قدیم علوم اور اسلامی فنون کو گزشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی علوم جدیدہ کی عام اشاعت و ترقی کے اس تذکرے کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا کہ ہاں علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل کبھی کسی کا زمانہ میں نہ ہوا ہوگا "علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ و دینیہ دونوں کے باہمی تقابل کی تصویر جو حقیقت اور واقعہ کی عکاسی تھی اس کو پیش کرنے کے بعد نتیجہ کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا کہ "ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا" گویا مثال اس کی وہی ہوئی کہ جو کرتا ہی نہیں ریشمی قمیض پہنے ہوئے ہے اس کی قمیض میں قمیضوں کا اضافہ کیا جارہا ہے لیکن جس وجہ سے غریب ننگا کہلاتا ہے اور عریانی و بے ستری کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے اس سے لاپرواہی برتی جارہی ہے بہرحال جس چیز کی حامی غیر محدود وذرائع رکھنے والی حکومت ہو۔ اسی کے اضافہ میں محدود ذرائع رکھنے والے محکوموں اور رعایا کی آمدنی خرچ کرنا اور اس کے لئے امدادی چندوں کا بار ان ہی غریبوں کے سر ڈالنا مولانا نانوتوی کے خیال میں تحصیل لاحاصل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آپ نے اس کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ملک کے عام چندوں اور مالی استعداد سے اضافہ کی اس لئے قرین دانش یہی تدبیر نظر آئی کہ حکومت جن علوم کی سرپرستی کر رہی ہے ان کو تو حکومت کے سپرد ہی رہنے دیا جائے لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کے باعث مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دست بردار ہی نہیں ہو گئی ہے بلکہ واقعات بتا رہے ہیں کہ نئی حکومت کے پیدا کردہ ماحول میں جو اسلامی علوم زبوں کی آخری حدود تک پہنچ چکے ہیں ان کے احیاء اور بقا کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر (کانوکیشن ایڈریس) میں پائے جاتے ہیں۔ "صرف بہ جانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی اور دینی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (التفات ضروری کیا گیا۔" جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا علوم جدیدہ کی تعلیم کا مقصد بھی دارالعلوم کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب کے متعلق حضرت قاسم العلوم کا یہی جدید نقطہ نظر ہے جس کی طرف آپ نے صرف اسی اجمالی اشارہ ہی سے توجہ نہیں دلائی ہے بلکہ خالص دینی و اسلامی علوم کے مقابلہ میں مدرسہ کے نصاب کے عقلی و ادبی فنون کا علوم دانش مندی کے عنوان سے تذکرہ کرتے ہوئے اپنے صحیح تعلیمی نصب العین کو کھلے کھلے الفاظ میں پیش بھی فرما دیا ہے۔ اب آگے اسی تقریر میں اعادہ کرتے ہوئے کہ کیوں "علوم نقلیہ اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا جائے" اپنی اسی تجویز سے اسی زمانہ میں سننے والوں اور سمجھنے والوں کو آگاہ فرماتے ہیں، کہ "اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں

جاکر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موثر ثابت ہوگی" ذرا سوچئے کہ غم وغصہ، بیروزگاری اور دل فگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسی اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کرکے غلام بنالیا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے زمین پر پٹک دیئے گئے تھے۔ ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہیئے تھا۔ قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی چاہیئے تھی جن کے ہاتھوں وہ اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے لیکن اسی مسموم فضا اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں بھی سیدنا امام الکبیر (مولانا نانوتوی) یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہوکر تعلیم پانے کے جواز ہی کا فتویٰ دے رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہوکر علوم جدیدہ کی تعلیم، علمی کمالات تک پہنچانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لئے مفید ہوگی۔ اللہ اللہ ایک طرف اسی زمانہ میں مولویوں کا ایک طبقہ تھا۔ بلکہ ان کی اکثریت یہ باور کرے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انہوں نے پڑھ لیا ہے اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جسے سیکھا اور پڑھا جائے ان ہی مولویوں کے درمیان پکارنے والا پکار رہا ہے کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید اضافہ، مزید فروغ اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ یورپ کے جدید علوم وفنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے جو سرکاری مدارس میں سکھائی جاتی ہیں،" دیوبندی نظام تعلیم" کے امام اول واکبر (مولانا نانوتوی) نے ٹھیک وقت پر جدید عصری علوم کی ضرورت واہمیت کو نہ صرف تسلیم کرلیا تھا بلکہ علوم اسلامیہ کے ساتھ یورپ کے جدید علوم وفنون کے پیوند لگانے کے سلسلہ میں تین ممکنہ راستوں کینی، اول یہ کہ علوم قدیم وجدید کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جائے، دوم کو بنیادی علوم سے فارغ ہونے کے بعد جو پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسلامی علوم پڑھانے کا نظم کیا جائے اور سوئم یہ کہ مسلمانوں کے دینی وموروثی علوم میں بقدر ضرورت بصیرت حاصل کرنے کے بعد مسلمان بچوں کو دانشِ نو سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں جن میں سے تیسری شکل کو اپنے نصب العین میں حضرت والا نے شریک کرنا چاہا اور اپنی اس تقریر میں اس کی توجیہہ بھی کی۔ حضرت نانوتوی کا تعلیمی نظریہ یہ تھا کہ "پہلے دینی واسلامی علوم کا نصاب دانشمندی کے فنون کے ساتھ ختم کرالیا جائے جن کے بغیر خالص اسلامی علوم، تفسیر، شرح احادیث وفقہ وغیرہ کی کتابوں کے نہ مطالعہ ہی کی صحیح قدرت پیدا ہوسکتی ہے اور جیسا کہ چاہیئے ان کتابوں سے استفادہ بھی بہ آسانی ممکن نہیں اس کے بعد جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں صاف اور واضح لفظوں میں اپنی یہ تجویز پیش کی کہ علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے"۔ آپ نے اپنی تقریر میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ اس ترتیب سے تعلیم دلانے کا تجربہ کیا جائے۔ عوام ہی کو نہیں خود حکومت کو جوش میں آکر براہ راست مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ سرکار کو بھی یہی طریقہ کار اپنانا چاہیئے (سوانح قاسمی صفحہ ۲۸۴ تا ۲۸۵) اس کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں، کہ

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دانشمندی کے قدیم علوم جن کو معقولات بھی کہتے ہیں، ان میں بال میں کھال نکالنے کی مشق کی وجہ سے قدرتاً فکر ونظر میں گہرائی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، نازک سے نازک بات تک پہنچنے اور پہنچانے کی اس عادت کے ساتھ جدید علوم وفنون میں حقیقت نہیں، واقعات طبعی پر جو زور دیا جاتا ہے، قدیم و جدید علوم کی ان دونوں طبعی خاصیتوں کی باہمی ترکیب سے علمی استعداد کے جس رنگ کو پیدا کیا جاسکتا ہے اس رنگ کو صرف قدیم یا صرف جدید تعلیم کی راہ سے شاید حاصل نہیں کیا جاسکتا (سوانح قاسمی حصہ دوم صفحہ ۲۸۵) کراچی یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے جو پاکستان کے مشہور سائنسدان بھی ہیں اپنی ایک تقریر میں جو انہوں نے اردو کالج کے جشن سیمیں کے موقع پر جو ۱۹۷۵ء کے اوائل میں منایا گیا تھا اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ جب تک عربی اور فارسی کی بنیادی تعلیم حاصل نہ ہو طبیعت علوم جدیدہ کے معاملات میں نہیں کھلتی ہے جناب مناظر احسن گیلانی آگے چل کر فرماتے ہیں، کہ مولانا نانوتوی کی یہ تعلیمی پالیسی سرکاری مدارس کی حد تک اس لئے کامیاب نہ ہوسکی کہ ان مدارس میں داخلوں کے سلسلہ میں عمر کی قید تھی اور علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد جب طلبہ سرکاری مدارس میں داخلہ کے قابل بنتے تو ان کی عمر انگریزی حساب سے داخلہ کے قابل نہیں رہتی۔ جناب گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ" مولانا نانوتوی نے" علم کے طلبہ کی غلامی کے ساتھ خود علم کی اس غلامی کو دیکھتے

ہوئے فرمایا تھا کہ میری مجوزہ ترتیب پر تعلیم پانے والوں کے لئے سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم و فنون سے استفادہ کی راہ میں رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "کاش گورنمنٹ ہند بھی قید عمر طلبہ تو داخل کروا ڈالے"۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی دارالعلوم دیوبند اور اکابر دیوبند کی پالیسی سے مختلف تھی۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انگریزی حکومت یہ چاہتی ہی نہیں تھی کہ ہندوستانی طلبا اور بالخصوص مسلمان طلبہ اپنے آبائی اور قدیمی علم کو حاصل کریں تو یہ زیادہ صحیح ہوگا اور لارڈ میکالے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تعلیمی پالیسی میں فرق بھی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ انگریز جو ہندوستان میں صرف انگریزی زبان اور تہذیب کا اثر و نفوذ دیکھنا چاہتے تھے یہ پروپگنڈہ بھی کرتے تھے کہ مسلمان ہی انگریزی تعلیم کے خلاف تھے حالانکہ مولانا محمد قاسم صاحب کے کانووکیشن ایڈریس سے نہ صرف اس کی نفی ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب ہمارے علماء نے چاہا کہ مسلمان طلبہ علوم اسلامی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور عمر کی قید لگا کر انگریزی اور سرکاری مدارس میں ۱۵ پر داخلہ کی پابندی لگا دی اور اس عرصہ میں جب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے حکومت کی توجہ مبذول کرائی اور یہ قید ختم کرنے کی تجویز پیش کی تو اس تجویز کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا گیا اور شرقی و مغربی علوم اور جدید و قدیم علوم کے حسین اور لطیف امتزاج کا جس کی حضرت نانوتوی نے توقع ظاہر کی تھی موقعہ فراہم کرنے سے صاف انکار کر دیا گیا۔

انگریزوں کا مکروہ پروپگنڈہ

انگریزوں نے اس کے برخلاف یہ پروپگنڈہ کیا کہ علمائے کرام مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے خلاف تھے اس سے قبل مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کے کانووکیشن ایڈریس سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تحصیل کے خلاف نہیں تھے صرف تقدیم و تاخیر کا فرق تھا۔ یہ صرف انگریزی پروپگنڈہ تھا اور اس کا اثر انگریزی مدارس میں پڑھنے والے مسلمان طلبا پر خاص طور پر تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ علماء نے مسلمانوں کو تباہ کیا اور انہوں نے انگریزی دور حکومت میں مسلمان بچوں کو اس دور کی حکومت کی زبان سے محروم کرنے کی سعی کی حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ غیر جانبدار انگریز مورخین نے بھی مثلاً ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر نے اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے کہ "مسلمان علماء نے انگریزی تعلیم سے نہیں روکا بلکہ انہوں نے عام طور پر اس کی اجازت دی" اس نے شاہ عبدالعزیز کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے ان سے پوچھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے تو انہوں نے فرمایا کہ "انگریزی کو اس لئے پڑھنا کہ انسان کتابیں پڑھ سکے خط لکھ سکے اور الفاظ کے مخفی معنوں کو معلوم کر سکے جائز ہے کیونکہ زید بن ثابتؓ نے رسول کریم کے حکم سے یہود و نصاریٰ کی زبان اور ان کی لغت پڑھی تھی تاکہ وہ ان خطوط کا جواب لکھ سکیں جو رسول کریم کی خدمت میں یہود و نصاریٰ کی طرف سے آتے تھے (ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔ صفحہ ۲۶۴) سر سید احمد خان نے خود اعتراف کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ وہی شاہ عبدالعزیز ہیں جو اپنے اس فتویٰ کے لئے بھی مشہور رہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اب مسلمانوں کا یہاں جہاد کرنا جائز ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی نے بھی فتویٰ دیا کہ "فی الواقع نفس تعلیم انگریزی میں ممنوع نہیں۔" جناب مولانا ظفیر الدین نے اپنے مضمون "انگریزی دور حکومت کا مکروہ پروپگنڈہ" میں جو دارالعلوم دیوبند کے رسالہ دارالعلوم مورخہ نومبر سنہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا لکھا ہے کہ "علماء نے جو کچھ کہا تھا اس کا منشا یہ تھا کہ انگریزی ضرور پڑھی جائے مگر اس طرح نہیں کہ اس سے اسلامی عقائد و اعمال کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ ان کے دینی نظام تعلیم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جائے۔ اور نہ مسلمان، مسلمان باقی رہے۔" خود مذکورہ بالا مصنف نے اس وقت کی حکومت ہند کے وزیر داخلہ کا یہ بیان نقل کیا ہے جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ "یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ (یعنی مسلمان) اس طریقہ تعلیم سے

پرہیز کرتے ہیں جو فی نفسہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن ان کے ملی رجحانات کو قطعاً نظر میں نہیں لاتا۔ حقیقت میں اس طریقہ ان کی ضروریات سے غیر ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ یہ طرز تعلیم انگریزی طرز تعلیم لازماً ان کے عقائد کے خلاف اور ان کی مروجہ روایات کے منافی ہے" (ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ صفحہ ۲۲۲) جناب ظفیر الدین کا کہنا ہے کہ "انگریزی حکومت کے دور اول میں انگریزی زبان کی تعلیم سے علماء نے ہرگز نہیں روکا۔ جو کچھ ہوا وہ تعصب تھا جو انگریزوں کا پیدا کردہ تھا۔ علماء ہر دور میں دینی تعلیم پر ضرور نظر رکھتے تھے اور ان کو رکھنا بھی چاہیئے تھا۔ اگر اس طرف توجہ نہیں دی گئی تو پھر مسلمان کسی طرح مسلمان باقی نہیں رہ سکتے تھے۔ اخلاق و اعمال اور عقائد کی درستی کے ساتھ علماء زبان کے پڑھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ جب ہم نے یونان کے علوم و فنون کو اپنایا اور علم کی کوئی وادی ہمارے گھوڑے سے خالی نہ رہی تو پھر انگریزی زبان میں ہمارے لئے کیا قباحت تھی (دار العلوم صفحہ ۴۷ نومبر ۱۹۵۶ء)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے کانووکیشن ایڈریس پر سر سید احمد خان کا تبصرہ

حضرت نانوتوی نے اپنے کانووکیشن ایڈریس میں سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا تھا کہ پہلے علوم دینی اسلامی حاصل کئے جائیں اور جب حسب توفیق استعداد پیدا ہو جائے تو پھر علوم جدیدہ کی طرف توجہ دی جائے۔ اور انہیں حاصل کیا جائے۔ علوم قدیم اور علوم جدید کی پیوندکاری کے بارے میں جو ان کی رائے تھی وہی دیوبند کی تعلیمی پالیسی تھی مگر سر سید یہ چاہتے تھے کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ ایک ساتھ پڑھائے جائیں اور یہ چیز حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی پالیسی کے بالکل برعکس تھی اس لئے بقول مولانا نانوتوی وقت واحد میں بہ کثرت علوم کے پڑھانے سے علم اور استعداد کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دونوں حضرات کا اختلاف سر سید احمد خان کے اس تبصرہ سے واضح ہو جاتا ہے جو انہوں نے یکم ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے سر سید لکھتے ہیں کہ "اس مدرسہ کی سالانہ مجلس میں جناب مولوی محمد قاسم نے ایک نہایت لمبی اور دل پر اثر کرنے والی اور صداقت سے بھری ہوئی گفتگو کی اس کے پڑھنے سے ہم کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ جناب مولوی صاحب ممدوح بھی مسلمانوں کے حق میں علوم و فنون جدیدہ کا حاصل کرنا ضروری تصور فرماتے ہیں کہ اور ہم جو مدرسۃ العلوم قائم کرتے ہیں تو ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ جو جناب مولوی صاحب ممدوح نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے لئے علوم دینی اور علوم دانش مندی اور علوم و فنون جدیدہ کا سامان مہیا کیا جائے۔ مگر ہم کو یہ بات تسلیم نہیں کہ مدارس سرکاری میں علوم جدیدہ کی تعلیم بکثرت جاری ہے بلکہ درحقیقت کچھ بھی نہیں اور بالفرض اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو علوم دینی اور علوم دانش مندی و علوم و فنون جدیدہ کی تعلیم گاہوں کا متفرق و منتشر ہونا کچھ خفیہ نہیں اور اس لئے ضروری ہے کہ وہ سب ایک جگہ جمع کی جاویں تاکہ انتظام واحد سے ہر شخص بقدر اپنی استعداد اور خواہش کے جن علوم کو چاہے حاصل کرے۔ یہ خیال کرنا کہ ایک مدرسہ میں ایک قسم کے علوم کی تکمیل کر کے اور پھر دوسرے قسم کے مدرسہ میں داخل ہوں تو تجربہ کی رو سے یہ درست نہیں اس لئے کہ عمر تحصیل علم کی نکل جاتی ہے کہ پھر کچھ حاصل نہیں ہوتا غرضیکہ ہمارے مقصد اور جناب مولوی صاحب کے مقصد میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔ ہمارا یہ مقصد ہے کہ جن چیزوں کی ضرورت جناب ممدوح نے فرمائی ہے وہ سب ایک جگہ جمع کی جاویں تاکہ جس کو جس کی ضرورت ہو وہ اسے مل جائے مگر کیا ایسا واقعتاً ہوا۔ اس کا ثبوت خود علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات سے مل سکتا ہے۔

سر سید کے تبصرہ پر تبصرہ

سر سید نے اپنے تبصرہ میں جس طریقہ کار کو اپنانے پر زور دیا ہے وہ طریقہ کار بھی مولانا محمد قاسم کے زیر غور تھا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے علوم نقلیہ اور علوم دینیہ کا علوم جدیدہ کیساتھ پیوند کرنے کے مسئلہ پر اس دور کے مسلمان مفکرین میں تین آرائیں ایک رائے تو سر سید کی تھی کہ دونوں کو

ایک ساتھ، ایک مدرسہ اور ایک مقام پہ پڑھانے کا بندوبست کیا جائے دوسری رائے یہ تھی کہ پہلے سرکاری مدارس میں علوم جدیدہ کو حاصل کیا جائے اور پھر علوم دینیہ پر توجہ دی جائے اور تیسری رائے وہی تھی جو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے پیش کی تھی۔ مولانا نانوتوی کی رائے کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے کا جواب سرسید کے پاس بھی نہیں تھا جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۲۸۳ میں ارقام فرمایا ہے کہ "اسلامی ادبی دینی علوم کی صحیح بصیرت حاصل کرنے کے لئے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے۔ صرف، نحو، ادب، معانی بیان، اصول فقہ، کلام اور علوم وافنی منذی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے ان سب کے چھوٹے سے چھوٹے مختصر ترین نصاب کے لئے بھی اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بمشکل نکل سکتی ہے اور طلبہ پر کسی نہ کسی طرح اس ناقابل برداشت بوجھ کو لاد بھی دیا جائے تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ پوری محنت اور توجہ سے جس کے بغیر صحیح استعداد طلبا میں پیدا نہیں ہو سکتی، سیدنا امام الکبیر یہی بات فرمانا چاہتے ہیں کہ اس فکر میں قدیم وجدید دونوں علوم اس سے محروم رہ جائیں گے آپکے بیان کا یہ تو خیر کھلا ہوا پہلو ہے۔ اسی کے ساتھ اگر اس کو سوچا جائے کہ جس زمانہ میں یہ تقریر کی گئی تھی۔ یعنی آج سے تراسی سال قبل (اب ایک سو پانچ سال قبل) پہلے تو حالت یہ تھی کہ مشرقیات کے پڑھنے پڑھانے والے ہمارے علماء اور مغربی علوم کے معلمین، پروفیسروں اور ٹیچروں کا طبقہ، دونوں کے پڑھنے پڑھانے کا صرف طریقہ ہی مختلف نہیں تھا بلکہ مشرقیات کے اساتذہ پر عموماً عقیدت و یقین و ادب سلف کے احترام کے جذبات غالب تھے۔ اور اس کے برعکس مغربی علوم وفنون کی تعلیم جو دیتے تھے وہ شک و شبہ بے اعتمادی اور مطلق العنانی کی ذہنیت کے دباؤ کے نیچے دبے ہوئے تھے اور مرض متعدی کی طرح ان کے پڑھنے والوں میں اسی ذہنیت کے جراثیم قدرتاً منتقل ہوتے رہتے تھے۔ اب تو مختلف اسباب و وجوہ کے کسر و انکسار کی بدولت، ایک صدی کی طویل مدت میں دونوں طبقوں کے رجحانات میں آتنا بعد و تخالف باقی نہیں رہا لیکن جس عہد میں قدیم و جدید تعلیم کے پیوند کے اس مسئلہ کو سیدنا امام الکبیر (مولانا نانوتوی) نے اٹھایا تھا اس وقت یہ واقعہ ہے کہ ان دو مختلف "قطعاً مختلف" احساسات و رجحانات والے اساتذہ سے ایک ہی زمانہ میں تعلیم پانے والوں کے متعلق اگرچہ تنبیہ کیا گیا تھا کہ قدیم ہو یا جدید دونوں ہی سے صحیح مناسبت نہ پیدا ہو سکے گی، تو جو واقعات تھے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح بصیرت کسی اور نتیجہ تک شاید پہنچ بھی نہیں سکتی تھی۔ الغرض نقصان استعداد کے جس اندیشہ کا اظہار مندرجہ بالا تقریر (کانووکیشن ایڈریس) میں کیا گیا تھا۔ ایک پہلو اس اندیشہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخر اساتذہ کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدر و قیمت طلبا پر واضح ہو جاتی ہو اور معاً دوسرے حلقے میں پہنچنے کے ساتھ ان ہی کے وزن و وقار سے طلبہ کو خالی الذہن کر دیا جائے۔ اثبات و نفی کے اس قصہ میں اگر ہر دو کی نفی ہوتی رہے تو ان دو متخالف طریقہ تعلیم کا خود ہی سوچئے دوسرا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے۔" (سوانح قاسمی حصہ دوم صفحہ ۲۸۴-۲۸۳)۔ اسی صفحہ کے فوٹ نوٹ میں جناب مناظر حسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ "بعد کو ذاتی مشاہدہ سے خاکسار اس نتیجہ پر پہنچا، بلکہ اسی کے ساتھ جدید علوم فنون کو چونکہ حکومت کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا کہ اسلامی علوم و دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں میں کی جاتی ہے۔ بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب ہو جاتا ہے جو رنگ خالص مغربی علوم و فنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے۔ رنگ ڈھنگ، وضع قطع، طریقہ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طفیلی بنے ہوئے ہیں۔ الناس علیٰ دین ملوکھم۔ (اس کا اثر اب تک ہم محسوس کر رہے ہیں کہ یہی مغربی علوم زدہ طبقہ پاکستان میں ملک کی مسلمہ اور قانونی طور پر منظور شدہ قومی زبان کی ترقی اور نفاذ میں حارج ہے اور اس کے نزدیک پاکستان کی ترقی، دنیا کے تمام ممالک کے برعکس جہاں قومی زبان کو کلی طور پر اختیار حاصل ہے صرف انگریزی اور انگریزی زبان میں نظر آتی ہے)۔ بات تو پرانی ہے لیکن ہر نئے تک

زمانہ میں اس پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن سابق مہتمم دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم کے نصاب کے بارے میں اسی سلسلہ میں ایک دن گفتگو ہوئی۔ تو پہلی دفعہ اس پیر دانا نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن کا باقی رہنا دشوار ہوجائے گا طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آجائے گی۔ دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت دارالعلوم کے طلبہ سے اس وقت جوبن آ تی ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس سے بھی وہ محروم ہوجائیں گے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا گیا۔ مشاہدہ سے ان تجربہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جارہی ہے۔ قدیم و جدید علوم کے حصول کے بارے میں سچ تو یہ ہے کہ رائے مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہی کی درست تھی جس کی جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے خود کراچی یونیورسٹی کے موجودہ قائمقام وائس چانسلر ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی برادر خورد چودھری خلیق الزماں نے تصدیق کی ہے لیکن انگریز جو برصغیر میں اسلام ہی نہیں دوسرے مذاہب کا بھی خاتمہ چاہتے تھے اور جو پورے برصغیر کو عیسائی بنا کر ایسے مسیحی مملکت بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے علوم قدیم و جدید کے ارتباط کو اس شکل میں جو مولانا نانوتویؒ نے اپنے کانووکیشن ایڈریس میں پیش کی تھی کس طرح قبول کرتے۔ داخلہ کو عمر کے ساتھ منسلک کرکے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور دینی زندگی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ لیکن حضرت مولانا محمد قاسمؒ اور ان کے پیروکاروں کی کوشش کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ یہاں تک کہ برصغیر میں جنگ پلاسی کی دوسری صد سالہ تقریب کے موقعہ پر تمام ہندوستان کو عیسائی دیکھنے کی آرزو رکھنے والے اس تقریب سے دس سال قبل یعنی ۱۹۴۷ء میں برصغیر کو چھوڑنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی صف اول میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ اور سب سے بڑھ کر خود حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ سب کے سب اسی دارالعلوم دیوبند کے خوشہ چین تھے جس کے معمار اول نے اپنی فہم و فراست سے انگریزوں کی چالوں کو ناکام بناتے ہوئے ایسے فہیم اور زیرک افراد کی تربیت کی۔ جن کے باعث آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

سالانہ رپورٹ پر سرسید کا تبصرہ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے کانووکیشن ایڈریس کا ایک بہت بڑا حصہ ان حوصلہ شکن حالات کے جائزہ میں صرف ہوا جن سے اپنی زندگی کے ۸ سال میں دارالعلوم کو دوچار ہونا پڑا۔ یعنی اہل وطن کی بے اعتنائی۔ ارباب دولت کی بے پرواہی اور غفلت۔ سرسید احمد خاں کے رسالہ تہذیب الاخلاق کی مورخہ یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ کی اشاعت میں بھی ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ رسالہ مذکور نے اپنی اس اشاعت میں اپنے مخصوص انداز میں دارالعلوم دیوبند کی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ کیا ہے۔ جس سے اس وقت کے مسلمان امراء کی بے اتفاقی کا صحیح حال معلوم ہوتا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم نے جس دلسوزی کے ساتھ اپنے کانووکیشن ایڈریس میں ان حوصلہ شکن حالات کا تذکرہ فرمایا اس کا احساس اور شدید ہوجاتا ہے۔ اس تبصرہ کا عنوان ہے "عربی مدرسہ دیوبند اور مسلمانوں کا جھوٹا دعویٰ دینداری" اس عنوان کے تحت رسالہ تہذیب الاخلاق رقم طراز ہے کہ "مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ عربی دیوبند نے اس مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۲۸۹ھ ہمارے پاس بھیجی ہے۔ جس کے دیکھنے سے ہم کو نہایت رنج ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کی حالت پر کس قدر افسوس ہوتا ہے۔ اب ہم اس رپورٹ پر متعدد طرح سے نظر ڈالتے ہیں۔ اول بہ لحاظ مسلمانوں کے جوش مذہبی کے۔ ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اور جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم دنیاوی بشمول دینوی پڑھائے جاویں گے۔ اس پر جو بعض مسلمان یا متعصب دیندار یا متشدد وہابی اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرسٹانی مدرسہ ٹھہراتے ہیں اور اس سبب سے لوگوں کو اس میں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں تو عربی مدرسہ دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور

کچھ نہیں ہے اور جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں. جن کو مسلمان چاہتے ہیں. بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور مدد کی ہوگی. مگر رپورٹ کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوئی. بڑے سے بڑا چندہ فہرست میں آٹھ روپیہ پانچ آنہ ماہوار کا ہے اور اس کے بعد تین روپے ماہواری کا ہے۔ اور یہ ماہواری قسم کے چندے غیر وصولی ہیں۔ بعضوں پر دو دو برس اور بعضوں پر ایک برس کا باقی ہے۔ اس کے بعد بہت تھوڑے چندے دو روپیہ اور ایک روپیہ ماہواری کے ہیں۔ اور اس کے بعد تو پھر روپیہ۔ دو روپیہ۔ تین روپیہ۔ آٹھ آنہ۔ چار آنہ سال پر نوبت پہنچ گئی اور وہ بھی بہ آسانی وصول نہیں ہوتا۔ بہ مجبوری مہتمم نے یہ تجویز کی ہے کہ چندہ اگانے کے لئے ایک نوکر رکھا جائے۔ بس یہ کارروائی ہمارے لئے قطعی ثبوت اس بات کا ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں مقدس اور متقی اور پکا مسلمان ظاہر کر کے مدرستہ العلوم مسلمانان میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اپنی دینداری ظاہر کرتے ہیں صرف سخن ساختہ اور حلیہ ناشروع ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں نے مدرسہ عربی دیوبند میں جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ بھی نہیں ہے کیوں مدد نہیں کی۔ حقیقت میں مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسہ میں بھی جیسا کہ دیوبند کا عربی مدرسہ ہے اور جس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب کا سا فرشتہ صفت نگراں ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سا شخص مدرس ہے کچھ مدد نہ کریں۔ دوئم بہ لحاظ اشغال مدرسہ کے تمام رپورٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ خود اپنے پیر پر یا مسلمانوں کی ہمدردی پر قائم نہیں ہے بلکہ صرف ایک شخص کی ذات پر اس کا دار و مدار ہے۔ مولوی محمد قاسم صاحب درحقیقت نہایت بزرگ اور نہایت نیک مادرزاد ولی ہیں۔ تمام اضلاع سہارنپور۔ میرٹھ اور مظفر نگر میں لوگ ان کو بہ مصداق اس حدیث کے علمارِ امت مرتبہ میں انبیائے بنی اسرائیل سے کم نہیں، ان کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کی سبب سے یہ چندہ ہوتا ہے ورنہ ایک مسلمان ایک ٹکہ بھی نہیں دیتا۔ اور دوسرا بڑا سبب مولوی محمد یعقوب صاحب کا ہے جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں اور انہوں نے صرف پینتیس (۳۵) روپیہ ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے اور قناعت و زہد سے اس قدر قلیل تنخواہ میں اوقات بسر کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو کیا دوسرا شخص اس قلیل مشاہرہ پر ان علوم کے پڑھانے کو ملے گا جو اس مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بس یہ مدرسہ ان دونوں بزرگوں کی دعاؤں پر قائم ہے۔ جس دن یہ دونوں بزرگ خدا کے گھر یا خدا کے پاس تشریف لے جائیں گے اُسی دن مدرسہ کا خاتمہ ہے۔ سوم بہ لحاظ نتائج دین و دنیوی کے جن کے حاصل ہونے کی اس مدرسہ سے توقع کی جاوے۔ اس مضمون پر کچھ لکھنے سے پہلے کچھ حامی طالب علموں کا اور بعد امتحان جو انعام تقسیم ہوا اس کا لکھنا مناسب ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ میں ۱۴۵ طالب علم ہیں جن میں سے ۸۳ (تراسی) صرف دیوبند کے رہنے والے ہیں۔ اور باسٹھ (۶۲) بیرونجات کے ہیں۔ ان میں سے سات طالب علم ایسے ہیں جو اپنے پاس سے روٹی کھاتے ہیں۔ اور پچپن وہ ہیں جو دیوبند کے رہنے والوں یا مدرسہ سے روٹی پاتے ہیں۔ کسی کو کپڑا اور جاڑے میں رضائی ملتی ہے۔ اور تقسیم انعام کی کیفیت رپورٹ میں یہ لکھی ہے کہ طلبار مکتبۂ قرآن میں جو اعلیٰ دو حافظ اور ادنیٰ دو لڑکے مستحق انعام ہوئے۔ ان کے لئے ڈیڑھ روپیہ تجویز ہوا۔ اور طلبہ فارسی جو سات تھے ان کے ۱۱ انعامات کے لئے ایک روپیہ چھ آنے تجویز ہوئے کہ تخمیناً ہر انعام دو آنے کے قریب ہوا۔ اور فارسی کے طلبہ اعلیٰ کے لئے جو چھ سات تھے فی انعام پانچ آنے کل دو روپیہ تین آنہ مقرر ہوئے۔ اور عربی میں ادنیٰ درجہ کے چوبیس طالب علموں کو ترپن انعام ملے۔ بحساب فی انعام ۵ آنہ۔ ان کا کل انعام سولہ روپیہ نو آنے ہوئے۔ اور اوسط کے ۱۱ طلبہ کو اکیس انعام۔ ان کو انعام فی کس سات آنہ تخمیناً ۹ روپیہ تین آنہ۔ اور طلبار اعلیٰ (عربی) کے انیس (۱۹) قابل انعام ہوئے اور چھیاسٹھ انعام انہوں نے پائے فی انعام چودہ آنہ۔ کل انعام کل ستاون روپیہ بارہ آنہ ہوا۔ اول تو ہم مسلمانوں کی اس حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ ان کی قوم کا مسلمانی مدرسہ اور ایسی خراب اور محتاج حالت میں۔ کہاں ہیں بڑے بڑے دین اسلامی کا دعویٰ کرنے والے۔ اور کیوں مذہب اسلام کے مدرسہ کو ایسی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ دیکھ لو۔ تمہارے ہی ملک میں ایک تربیت یافتہ قوم یعنی پادریوں

کے مذہبی مدرسہ میں۔ ان کی تائید بھی نہایت غریب آدمی اور بیوہ عورتیں زیادہ تر کرتی ہیں۔ اور خود انصاف کرو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ اس کا سبب صرف یہی ہے کہ اس قوم میں تعلیم و تربیت بہت عمدہ ہے۔ ان کے سب کام اچھے ہیں۔ ہماری قوم میں تعلیم و تربیت نہایت خراب ہے۔ گو تعلیم تو برائے نام ہے لیکن تربیت کا تو نام بھی نہیں۔ اور اسی سبب سے ہمارے سب کام کیا دینی اور کیا دنیوی سب خراب ہیں۔ اور برباد و ذلیل ہیں۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ جن طالب علموں نے ایسی خراب حالت۔ محتاجی اور ناداری اور ذلت میں تعلیم پائی ان سے ہم کو اپنی قومی ترقی کی کیا توقع ہو۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ خود اپنے لئے کچھ مفید ہوں گے تو اس کی بھی ہم کو کچھ توقع نہیں ہوتی۔ کوئی فن انہوں نے نہیں سیکھا۔ کوئی ہنر ان کو نہیں آتا۔ روٹی کمانے اور کھانے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں۔ ہاں ایک بات اس تعلیم سے ہونے والی ہے کہ کاہل اور کام چوروں کا گروہ بڑھ جائے گا۔ آج جس مسجد میں اگر دس خیرات کی روٹی کھانے والے ہیں تو کل بیس ہو جائیں گے۔ ہاں بلا شبہ ان لوگوں سے اس بات کی توقع ہے کہ جب کوئی شخص دلی ہمدردی اور محبت قومی اور حب ایمانی اور خالص عشق رسول ؐ سے اپنی قوم کی بھلائی کے لئے کھڑا ہوگا تو اس کی نسبت کفر کے فتوے دینے کے لئے موجود ہوں گے۔ جناب مولوی نذیر حسین صاحب بھی سید احمد کے کفر پر مہر ثبت فرمائیں گے اور مولوی سعد اللہ بھی تکفیر کے فتووں پر مہریں کریں گے۔ مگر ان بزرگوں کو خیال کرنا چاہئیے کہ ان فتووں سے کیا ہوتا ہے۔ اور بقول شاہ عبدالعزیز کے کوزشتر کے برابر بھی کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ وہ خود تو مسلمان ہو لیں جب دوسروں کی تکفیر کریں۔ جو لوگ ہماری تدبیروں کی مخالفت کرتے ہیں وہ پکے دشمن اسلام کے اور مسلمانوں کے ہیں۔ تمام باتیں ان کی ظاہری اور محض جھوٹی ہیں۔ اپنے مطلب پر وہ وہ باتیں کرتے ہیں جو ایک ادنیٰ دیندار بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری غرض اس تمام تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانی ہے کہ ان کے دونوں کام دین و دنیا کے سب خراب اور ابتر ہیں۔ ان کو شرم کرنی چاہیئے کہ ان کے مدرسہ اسلامی دیوبند کا کیا حال ہے۔ سب کو چاہیئے کہ اس مدرسے کی ایسی مدد کریں اور اعلیٰ ترقی پر پہنچاویں جو اسلام کی شان اور رونق کا نمونہ ہو۔"

سرسیدؒ کی خام خیالی

سرسید کے تبصرے سے کئی باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مدرسہ اسلامی دیوبند کی حالت زار کی طرف توجہ دلا کر ان مسلمانوں کی مذمت کرنا چاہتے ہیں جو مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے خلاف ہیں۔ دوسرے وہ مسلمانوں کی بے حسی کا رونا رو کر انہیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور انگریزوں کی عادات و اطوار کو اپنانے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اور اس ضمن میں انگریزوں کی معاشرت اور طرز زندگی اور ان کے طریقہ تعلیم کو سب سے اچھا۔ سب سے افضل۔ سب سے عمدہ اور تمام خرابیوں سے پاک اور مبرّا بتاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیوبند جیسے اسلامی مدرسہ سے جس کی مالی حالت خراب ہے اور جو صرف دو بزرگوں کی دعاؤں اور ایثار کی بدولت چل رہا ہے۔ اور جو ان دونوں بزرگوں کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یقیناً ختم ہو جائے گا۔ چوتھے اسی مدرسے کے طلباء ایسی خراب حالت۔ محتاجی۔ ناداری اور ذلت میں تعلیم پاتے ہیں تو پھر ان سے قومی ترقی کی کیا توقع کی جا سکے۔ پانچویں یہ طالب علم جب علم حاصل کر کے زندگی کی شاہراہ میں داخل ہوں گے تو یہ معاشرہ پر ایک بوجھ ہوں گے اور یہ مساجد میں خیرات پر پلنے والے افراد کی تعداد کو کم از کم دو چند کر دیں گے۔ اور ان کا کام بجز اس کے کچھ نہ ہوگا کہ وہ اچھے اور روشن خیال مسلمانوں پر جس میں وہ خود بھی شامل ہیں کفر اور تکفیر کے فتوے لگائیں گے۔ جہاں تک مسلمانوں کی دینی بے حسی اور قومی غفلت کا معاملہ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنے کانووکیشن ایڈریس میں سرسید سے بھی زیادہ تلخ خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ مگر انہوں نے سرسید کی طرح امت مسلمہ پر تمسخر نہیں کیا اس لئے کہ اس دور

میں مسلمان جن نازک حالات سے دوچار تھے اور صدیوں کے قومی اضمحلال نے ان کی قوت ارادی کو جس خطرناک حد تک متزلزل اور غیر مستحکم بنا دیا تھا اس کی بنا پر ان کو بے غیرتی اور قومی معاملات سے بے اعتنائی اور غفلت کے لئے حد سے زیادہ مورد الزام ٹھہرانا اور ان کا مذاق اڑانا مسئلہ کا حل اور علاج نہیں تھا۔ اسی طریقہ سے مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا تدارک اور مداوا نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت نانوتوی رحؒ کی تقریر میں مسلمانوں کو علوم دینیہ کی اہمیت سے واقفیت اور مذہب کی طرف ان کی بے حسی کا بیان کرکے ان کی قومی غیرت وحمیت کو بیدار کرنے کی سعی کی گئی ہے جو ہر مسلمان کا دینی اور اخلاقی فرض ہے۔
دوسری طرف سرسید نے مدرسہ عربی دیوبند کے بارے میں مسلمانوں کی غفلت کو ان کی عام بے حسی اور ذہنی ابتری کا باعث قرار نہ دیکر جو امر واقعہ تھا انہیں علم ناشناس اور متعصب دیندار کے لقب سے نوازا جو سراسر زیادتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں جب معاشرہ انحطاط پذیر ہوتا ہے تو عوام کو اکثریت زندگی کے مسائل اور اس کی حقیقتوں سے فرار چاہتی ہے اور اس میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کا مذاق اڑایا جائے بلکہ اصل میں کوشش اس بات کی ہونی چاہیئے کہ معاشرہ کی ان خرابیوں کا سد باب کیا جائے جن کے باعث وہ انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ مولانا نانوتوی رحؒ کے نزدیک معاشرہ کی اصلاح کے لئے دینی تعلیم ضروری تھی۔ اور سرسید کی نگاہ میں عوام کو انگریزی تعلیم اور اور علوم جدیدہ کے حصول کی طرف متوجہ ہونا ضروری تھا۔ دونوں طریقے، کار اصلاح احوال کے لئے تھے۔ لیکن دونوں میں زمین وآسمان کا بعد تھا۔ حضرت نانوتوی کے خیال میں علوم دینیہ کو بنیاد بنا کر علوم جدیدہ حاصل کرنا چاہئیں۔ اور اگر یہ کام بیک وقت شروع کیا جائے گا تو ان کے بقول اس کا طلبا کی ذہنی استعداد پر برا اثر پڑے گا۔ برخلاف اس کے سرسید تمام علوم کی بیک وقت تعلیم کو لازمی قرار دیتے تھے۔ اور اصل میں علوم دینیہ کا تو محض نام تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی علوم اور مغربی تہذیب کو جو ان کی نگاہ میں بے عیب تھی حاصل کریں۔ دونوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تشہیر وتبلیغ کا سہارا لیا مگر حضرت نانوتوی کے الفاظ میں پیار تھا۔ محبت تھی۔ دردمندی تھی۔ التجا تھی۔ قومی غیرت کو للکار تھی۔ جبکہ دوسری طرف طنز تھا۔ مزاح تھا۔ تمسخر تھا۔ سرسید مسلمانوں کی دینی اور علمی بے حسی کو وجہ قرار دے کر اپنے مدرسہ کے نصاب تعلیم اور انگریزی علوم وفنون کی ترویج وترقی کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ جبکہ مولانا نانوتوی مسلمانوں، خاص کر مسلمان امراء کو ان کا دینی ملی اور قومی فرض یاد دلا کر انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدرستہ العلوم علیگڈھ کے برعکس جس میں مغرب زدہ مسلمانوں کے چندہ کے علاوہ حکومت وقت کی امداد بھی شامل تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ اس تعلیمی ادارے میں مسلمانوں کی روح اور ان کے مذہبی عقائد کو بگاڑنے کے لئے انگریز پروفیسر بھی موجود تھے۔ اور اس کا انگریز پرنسپل تو اتنا طاقتور تھا کہ وہ بانی مدرسہ اور مدرسے کے ٹرسٹیوں سے بھی زیادہ با اقتدار تھا۔ جبکہ مدرسہ دیوبند کے عطیہ دہندگان کی تعداد بہت کم تھی اور نادہندگان کی تعداد بقول سرسید بہت کافی تھی۔ [illegible] اور انعام یافتہ طلباء کو نہایت معمولی انعامات جن میں دو آنے، چار آنے، پانچ آنے اور سات آنے کے انعامات شامل تھے ملتے تھے۔ اور مدرسہ کے صدر مدرس کو صرف پینتیس روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ مگر اس مدرسہ کے ارباب حل وعقد نے اپنی خانگی ضروریات کو اس حد تک کم کر لیا تھا کہ جو کام علیگڈھ کے انگریز اساتذہ اور ان کے رفقا کے کار بڑی بڑی تنخواہوں میں بھی نہ کر سکے وہی کام دیوبند کے بوریہ نشین۔ قناعت پسند اور مجسم ایثار وخلوص مدرسین نے تقریباً مفت انجام دیئے۔ اور اس کا اعتراف خود گورنر شمالی مغربی صوبہ (یو۔پی) کے فرستادے پامر (PAMER) نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔ جس کا تفصیلی تذکرہ اپنے مقام پر ہو چکا ہے۔
ہر چند کہ پامر نے دارالعلوم دیوبند کے اخراجات کا تقابل مدرسہ دہلی سے کیا تھا۔ مگر یہ مثال مدرستہ العلوم پر بھی عائد ہوتی ہے کہ وہاں کے اخراجات مدرسہ دہلی کے اخراجات سے اگر زیادہ نہیں تھے تو بہت کم بھی نہیں تھے۔ پھر یہ کہ سرسید کے نظام تعلیم کی کامیابی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اس ادارے کے عظیم سپوت

مولانا حسرت موہانی ۔ مولانا محمد علی ۔ مولانا شوکت علی کو اللہ نے اسی وقت عظمت بخشی جب وہ علوم دینیہ کی طرف راغب ہوئے اور انہوں نے مغرب کے مقابلہ میں مشرق سے اور صلیب کے مقابلہ میں ہلال سے اپنا رابطہ استوار کیا۔ برخلاف اس کے دارالعلوم دیوبند نے ایسے ایسے اکابر پیدا کئے جو اللہ کے خاص بندے ثابت ہوئے۔ اور جن کی شخصیت اور کارناموں سے عروس ہند کی مانگ میں سیندور بھرا ہے۔ سرسید نے دارالعلوم کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "پھر ہم پوچھتے ہیں کہ جن طالب علموں نے ایسی خراب حالت میں۔ محتاجی اور ناداری میں اور ذلت میں تعلیم پائی ان سے ہم کو اپنی قومی ترقی کی کیا توقع ہو۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ خود اپنے لئے کچھ مفید ہوں گے تو اس کی بھی ہم کو توقع نہیں۔ کوئی فن انہوں نے نہیں سیکھا۔ کوئی ہنر ان کو نہیں آتا روٹی کماتے اور کھانے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں۔ ہاں ایک بات بلاشبہ اس تعلیم سے ہونے والی ہے۔ کاہل اور مال حرام خوروں کا گروہ بڑھتا جائے گا۔ آج جس مسجد میں اگر دس خیرات کی روٹی کھانے والے ہیں تو کل بیس ہو جائیں گے"۔ غور فرمایئے دینی تعلیم اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں کس حقارت آمیز اور توہین خیز جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور مدرسہ عربی دیوبند کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے کرتے علوم مذہبی کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ مگر ایسے بے فن۔ بے ہنر۔ کاہل۔ حرام خور اور مسجد میں خیرات کی روٹیاں کھانے والوں نے دین و وطن کی وہ خدمت کی کہ جو انگریز زدوں سے نہ ہو سکی۔ اور یہ لوگ معاشرہ پر بوجھ بننے کی بجائے رہبر اور رہنما کے روپ میں ارض وطن کے جاں نثار ثابت ہوئے۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے اپنے مضمون "دارالعلوم کی بنیاد کے چند غیر معروف گوشے" میں جو رسالہ دارالعلوم کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا اور جو اس رسالہ کے صفحہ ۲۰ سے ۲۸ صفحات تک پھیلا ہوا ہے سرسید کے ان تمسخر آمیز اقدامات کا جواب دارالعلوم دیوبند کی ان ہی سالانہ رودادوں سے دیا تھا جن میں سے ایک رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے بہانے سرسید نے مذہبی نصاب تعلیم اور دنیاوی علوم سے بہرہ ور ہونے والے علماء کو متذکرہ خطابات سے نوازا تھا۔ جناب گیلانی لکھتے ہیں کہ "تیسری بات جسے ہم ان رودادوں میں پاتے ہیں وہ یہ ہے کہ مدرسے سے فارغ ہونے والوں کے متعلق کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے یہ دو سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ یعنی یہ کھائیں گے کیا۔ اور یہ کہ زمانے کے رواجی علوم و فنون سے بے تعلق رہ کر اپنے عہد کے علمی حلقوں میں کام کرنے اور ان کو متاثر کرنے کی صورت کیا ہو گی۔ پہلی بات یعنی معاش کے متعلق تو ایک بڑا دلچسپ جائزہ مدرسہ کی بارہویں سال ہی کی روداد میں شریک کر لیا گیا ہے۔ دکھایا گیا ہے کہ اس قلیل عرصہ میں پڑھ پڑھ کر اپنے اوطان بعیدہ کو جو لوگ چلے گئے' ان کے حالات کا تو علم نہ ہو سکا۔ لیکن مدرسہ کے توسط سے فارغ ہونے والے ایسے طلبہ جو دیوبند میں کسی کے یہاں طالب العلمی کر کے زندگی گذارتے تھے۔ اس زمانہ میں جب شدید قحط تھا' لکھا ہے کہ کس طرح ایک آدمی کے کھانے کا چار روپیہ ماہوار سے کم میں نظم مشکل تھا۔ ارزانی کے ایام میں بھی جو اپنے کھانے کا دیوبند میں خود نظم نہیں کر سکتے تھے (اور جن کے بارے میں سرسیّد نے متذکرہ بالا تبصرے میں حقارت آمیز جملے استعمال کئے تھے) اسی قسم کے غیر مستطیع گھرانے کے بچے مدرسہ میں داخل ہوتے اور مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ان میں کوئی پچاس روپیہ' کوئی تیس روپیہ' کوئی بیس روپیہ ماہوار تنخواہیں پا رہے ہیں اور "معاشرہ پر بوجھ" نہیں ہیں۔ ایسے ۲۲ طالب علموں کا نام سلسلہ وار درج کر کے بتایا گیا ہے کہ ان کو مدرسہ نے ہندوستان کے کن کن مقامات پر بھیجا۔ اور ماہوار یافت اس وقت ان لوگوں کی کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا یہ سمجھئے کہ جن کے والدین اپنے بچے کے کھانے کا خرچ دو ڈھائی روپیہ بھی ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اگر مدرسہ کی تعلیم نے بیس۔ پچیس۔ تیس۔ چالیس پچاس روپیہ تک کمانے کی صلاحیت ان میں پیدا کر دی۔ تو یہ کہنا کہ معاشی حیثیت سے مدرسہ کی تعلیم اہل ملک کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئی (جیسا کہ سرسید کے تبصرے سے ظاہر ہوتا ہے) بجز غلط بیانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اسی موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ مدرسہ سے ان فارغ ہونے والوں کا مشاہرہ ان کی لیاقت اور استعداد سے بہت ہی

کم ہے مگر عزت و آبرو بہت کچھ زیادہ (اور یہی زندگی کا مطمح نظر ہونا چاہیئے)۔ لیاقت و استعداد سے بہت کم کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ اسی فہرست میں شیخ الہند حضرت الامام الاستاذ مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی دسویں نمبر پر ہے۔ تنخواہ کے خانے میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے سامنے پندرہ روپے لکھے ہوئے ہیں۔ خود اسی دارالعلوم میں فارغ ہونے کے بعد منصب تدریس کے لئے آپ کا انتخاب ہوا تھا۔ آپ اس وقت مدرسہ کے مدرس چہارم تھے۔ اور یہی مثال دعوے کے دوسرے جز کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ مشاہرہ پندرہ روپیہ ہی سہی لیکن پندرہ لاکھ پانے والوں میں شیخ الہند کا مقام کتنوں کو حاصل ہوا۔ اسی سلسلہ میں حضرت مولانا احمد حسن امروہوی کا اسم گرامی بھی ہے۔ تنخواہ کے خانہ میں ان کے نام کے آگے تیس روپیہ ماہوار لکھا ہے (حضرت فخر العلماء کا نام بھی اس فہرست میں تھا)۔ روداد میں آگے یہ فقرہ بھی تھا کہ "اور کوئی نہ سمجھے کہ یہ لوگ (دارالعلوم کے فارغین) مدرسی یا معلمی ہی کر سکتے ہیں اور کوئی کام ان سے نہیں ہو سکتا۔" آگے اس خیال کی تغلیط و تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہرگز نہیں۔ ہر سررشتہ اور محکمے میں ہر قسم کا کام کر سکتے ہیں"۔ بہرحال اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہ عموماً درس و تدریس و تعلیم ہی کے کام کو مدرسہ کے فارغین نے کیوں پسند کیا۔ لکھا ہے کہ " علم سے ان کو ایک طرح کا انس اور واسطہ ہے۔ اس واسطے تعلیم و تعلم کی نوکری پسند کرتے ہیں"۔ اور درحقیقت انہیں تربیت ہی اس بات کی دی گئی تھی کہ وہ درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کریں تاکہ سرگرمیوں کا وہ دائرہ جس کا نقطۂ آغاز دارالعلوم ہے زیادہ سے زیادہ وسیع ہو سکے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے حضرت حاجی امداد اللہ کے استفسار کے جواب میں جو خط لکھا تھا اور جس کا ذکر اپنے مقام پر ہے اس میں بھی اس بات پر اظہار مسرت کیا گیا تھا کہ ان کے شاگرد تعلیم اور تعلم کے سلسلہ کو اپنی اپنی جگہ جاری کئے ہوئے ہیں)۔ ایک اور خبر اس سلسلہ میں یہ بھی دی گئی ہے کہ مدرسہ کی تاسیس کو کل بارہ سال گذرے ہیں لیکن حال یہ ہے کہ " واسطے فارغ التحصیل طلباء کے اطراف ہندوستان سے بمشاہرہ معقول مدرسہ ہٰذا آتے ہیں" مطلب جس کا یہی ہے کہ ملک کے اطراف و جوانب سے درخواستیں چلی آتی ہیں کہ اپنے یہاں کے تعلیم یافتوں میں سے کسی کو بھیجئے جس کا سلسلہ بحمد اللہ اس وقت تک جاری ہے۔ اسی زمانہ میں (جب انگریزوں کا اقتدار انتہائی عروج پر تھا اور مدرسہ دیوبند پر عتاب کی نظریں پڑتی تھیں) حال یہ تھا کہ قریب ہی کے علاقوں سے نہیں بلکہ لکھا ہے کہ " ریاست بہاولپور۔ ملک پنجاب سے لاجپور ملک گجرات سے مدرسہ ہذا میں (مطالبے) آتے رہتے ہیں"۔ اور جس وقت تک روداد مرتب ہو رہی تھی غالباً بعد مکانی کی وجہ سے کوئی ان مقامات پر جانے کو تیار نہیں تھا۔ لکھا ہے کہ اب تک کسی نے مقامات مذکورہ کا جانا قبول نہیں کیا ہے"۔ (بعد میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کا بہاولپور جانا ثابت ہے)۔ بہرحال چند دنوں میں لوگوں پر ثابت ہو گیا کہ عربی مدرسہ کے فارغین کو کوئی پوچھے گا کہ نہیں۔ بلکہ برعکس اس کے یہ تجربہ بھی ہونے لگا جیسا کہ اسی روداد میں ہے کہ " نوکری ان لوگوں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے نہ کہ یہ نوکری کو"۔ (صفحہ ۱۳۔ روداد ۱۲۹۴ھ) اور کوئی شبہ نہیں کہ اب جبکہ مدرسہ قریب قریب اپنی عمر کی ایک صدی پوری کر چکا ہے عموماً یہی تجربہ سامنے آیا کہ فارغ ہونے کے بعد بمشکل چند ہی مہینے بیکاری میں گذارنے پر کوئی مجبور ہوا ہو۔ اب بھی ان کی طلب رسد سے بڑھی ہوئی ہے۔ جس کا اندازہ مدرسہ کی دفتری رپورٹ سے ہو سکتا ہے۔" جناب گیلانی نے نوکری اور افادیت کے بارے میں سرسید کے اعتراض کا کافی و شافی جواب دے دیا۔ اور صرف منطق اور استدلال سے کام نہیں لیا بلکہ مدرسہ کی اپنی رپورٹ سے سرسید کی تردید کر دی۔ اب سرسید کے دوسرے اعتراض کی طرف آئیے کہ مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلباء بے ہنر ہیں۔ بے فن ہیں اور معاشرہ پر بوجھ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے جناب گیلانی نے فرمایا کہ " اس دوسری بات یعنی عام رواجی علوم سے بیگانہ رہ کر کام کرنے کا سوال تو اس سوال کو اور کسی نے تو نہیں لیکن مدرسہ کے آٹھویں سال کی روداد میں سیدنا امام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کافی مبسوط تقریر میں دے دیا گیا ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے کہ علاوہ قرآن و حدیث کے فقہ وغیرہ علوم دینی کے نصاب میں ان علوم کی کتابیں بھی رکھی گئی ہیں جنہیں علوم دانشمندی کہتے ہیں۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ ان علوم کے رد و قدح اور سوال و جواب سے پڑھنے والوں کی استعداد میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ وقت رسی

اور باریک بینی کی عادت پڑی ہے۔ حضرت (قاسم العلوم) نے فرمایا کہ ان قدیم استعدادی علوم کے ساتھ دینی علوم کی تعلیم جو مدرسہ میں دی جاتی ہے ان سے فارغ ہونے کے بعد بھی طلبہ کو کافی وقت بچتا ہے۔ اور اس قدر بچتا ہے کہ ان علوم کی تعلیم پائے بغیر سرکاری اسکول اور کالجوں سے فارغ ہو کر جس عمر میں لوگ نکلتے ہیں۔ اسی عمر میں چاہے جاتے تو مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو کر ہمارے ہاں کے طلبہ بھی نکل سکتے ہیں۔ خود حضرت والا کے الفاظ مبارک یہ ہیں کہ بعد تحصیل فنون دانشمندی جس کو خاص تحصیل استعدادی کے لئے تجویز کیا ہے۔ اگر اور فنون قدیمہ و جدیدہ کو حاصل کیا جانے لگا تو البتہ مقدار زمانہ تحصیل برابر رہے گا۔" اگر دار العلوم کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلانا دشوار نہیں کہ سرسید نے جن فارغ التحصیل طلبا کو معاشرہ کا ناسور، بے علم، بے ہنر اور نکما بتایا تھا انہوں نے برصغیر کے گوشہ گوشہ میں جاکر علم و عمل کی وہ شمعیں روشن کیں جن سے ہندوستان کی ظلمت اور تاریکی کافور ہوگئی۔ اور ابتدائی دور میں پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے شیخ الہند نے آزادی اور حریت کی وہ تڑپ پیدا کی جس نے سرسید کے مدرسۃ العلوم کے مشہور اور ہونہار سپوتوں کو یعنی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو ان کا پیرو اور معتقد بننے پر مجبور کر دیا۔ یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ مولانا محمد علی کے خطبۂ کراچی سے جو مقدمہ بغاوت کے دوران انہوں نے کراچی کے خالق دینا ہال میں دیا تھا ان کی شیخ الہند سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر سرسید زندہ ہوتے تو ان سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ " ہماری قوم میں تعلیم و تربیت بہت خراب ہے۔ گو تعلیم برائے نام ہے لیکن تربیت کا نام نہیں، اور اسی سبب ہمارے سب کام کیا دینی، کیا دنیوی سب خراب و برباد اور ذلیل ہیں" کہاں تک درست ہے۔ جو قوم شیخ الہند، سید العلماء اور فخر العلماء جیسے عالم پیدا کر سکتی ہے اس کو کس طرح بے ہنر اور معاشرہ کا ناسور قرار دیا جا سکتا ہے۔

ناسا عد حالات میں بے مثال کامیابی

دار العلوم دیوبند کی سالانہ رپورٹ کے بارے میں سرسید کے تبصرہ کا تذکرہ دو وجوہ کی بنا پر کیا گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ مدرسہ دیوبند کے ابتدائی سال کتنے ناسا عد مسائل کے حل میں گذرے۔ دوسرے یہ کہ ان حوصلہ شکن حالات کے باوجود مدرسہ عربی دیوبند نے کیسی کیسی عظیم شخصیتوں کی پرورش اور نگہداشت کی۔ سرسید کے نزدیک دار العلوم کی حیات طیبہ کا دار و مدار صرف مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا محمد یعقوب کی ذات پر تھا۔ اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے۔ مگر سرسید کو شاید یہ اندازہ نہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے جو کچھ کیا وہ منجانب اللہ تھا اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور شاہ رفیع الدین کے بیانات میں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں اور جن کا تفصیلی تذکرہ اپنے مقام پر ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ سرسید کے نزدیک دیوبند کا نظام تعلیم لچر تھا۔ لیکن اس لچر نصاب تعلیم نے ان مندرجہ ذیل شخصیتوں کو جنم دیا۔ (۱) شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی۔ (۲) فخر العلما حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی۔ (۳) سید العلما حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہوی۔ (۴) حضرت مولانا عبد اللہ صاحب انبیٹھوی۔ (۵) حضرت مولانا فتح محمد تھانوی۔ (۶) حضرت مولانا حکیم جمیل احمد نگینوی۔ (۷) حضرت مولانا عبد الحق ساکن پور قاضی (۸) حضرت مولانا عبد اللہ جلال آبادی۔ (۹) حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری۔ (۱۰) حضرت مولانا عبد العلی صاحب دہلوی۔ (۱۱) حضرت مولانا نواب محی الدین صاحب۔ (۱۲) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی۔ (۱۳) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی۔ (۱۴)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ۔ (۱۵) حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن امروہوی ۔ (۱۶) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ۔ (۱۷) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی (۱۸) حضرت مولانا حکیم عبد الوہاب (نابینا) ۔ (۱۹) حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسین چاندپوری ۔ (۲۰) حضرت میاں اصغر حسین دیوبندی ۔ (۲۱) حضرت مولانا اعزاز علی صاحب ۔ (۲۲) حضرت مولانا نجم الدین صاحب ۔ (۲۳) حضرت مولانا انور شاہ کشمیری ۔ (۲۴) حضرت مولانا شاہ وارث حسن لکھنوی ۔ (۲۵) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ۔ (۲۶) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ (۲۷) حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ۔ (۲۸) حضرت مولانا یحییٰ صاحب سرحدی (۲۹) حضرت مولانا عبد الرزاق صاحب پشاوری ۔ (۳۰) حضرت مولانا عبد العزیز صاحب ۔ (۳۱) حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور غازی انصاری ۔ (۳۲) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی ۔ (۳۳) حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی ۔ (۳۴) حضرت مولانا سید فخر الدین ۔ (۳۵) حضرت مولانا فضل ربی ۔ (۳۶) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی ۔ (۳۷) حضرت مولانا ماجد علی ۔ (۳۸) حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری ۔ (۳۹) حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۔ (۴۰) حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیمبلپوری ۔ (۴۱) حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کابلی ۔ (۴۲) حضرت مولانا وصی اللہ ۔ (۴۳) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ۔ (۴۴) حضرت مولانا محمد طیب صاحب ۔ (۴۵) حضرت مولانا عبد الغفور مدنی ۔ (۴۶) حضرت محمد ادریس صاحب کاندھلوی ۔ (۴۷) حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی ۔ (۴۸) حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی ۔ (۴۹) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ۔ (۵۰) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۵۱) حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ۔ (۵۲) حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ۔ (۵۳) حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ۔ (۵۴) حضرت مولانا حامد اللہ انصاری ۔ (۵۵) حضرت مولانا مفتی محمود ۔ (۵۶) حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی ۔ (۵۷) حضرت مولانا احسان الحق تاجور نجیب آبادی ۔ (۵۸) حضرت مولانا شائق احمد عثمانی ۔ (۵۹) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن بجنوری ۔ (۶۰) حکیم محمد حسن ۔ (۶۱) مولانا محمد یاسین شیرکوٹی ۔ (۶۲) مولانا رسول خان ۔ (۶۳) مولانا سراج احمد ۔ (۶۴) مولانا گل محمد خان ۔ (۶۵) مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی ۔

دیوبند کے پنجتن

لیکن ان تمام اکابرین میں سابقون الاولون کی حیثیت سے دار العلوم کے پنجتن ہی کی سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنے کانووکیشن اَیڈریس میں محبت اور شفقت کے انداز میں ان کو دیوبند کے پنجتن کا خطاب دیا اور فرمایا کہ " بالجملہ یہ مدرسہ ایک ذخیرۂ خیر اور سرمایہ علم وادب واستعداد ہے جس کے طفیل سے آج خداوند ذوالجلال نے یہ دن دکھلایا کہ چند طالب علموں نے اکثر یہاں تعلیم پاکر استعداد کامل حاصل کی ۔ ہر فن میں مناسبت معقول اور ہر علم میں لیاقت پیدا کرکے اقران وامثال میں ممتاز ہوئے ۔ جن میں سے پنجتن مولوی عبد الحق صاحب ساکن پورقاضی ۔ اور مولوی محمود الحسن خلف الرشید مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ اور مولوی فتح محمد ساکن تھانہ بھون ۔ اور مولوی عبد اللہ صاحب ساکن جلال آباد نے تحصیل معمولی سے فراغت پا ۔ ہر چند دریائے علم ایک دریائے ناپید کنار ہے جس کا تمام حاصل کرلینا طاقت بشری سے باہر ہے مگر استعداد علمی جس پر مدار فضیلت ہے بحمد اللہ ان پانچوں کو حاصل ہوئی ۔

نقل سوال جوکہ مولوی عبدالحق صاحب سے کیا گیا تھا۔

امور عامہ اگر عوارض عامہ ہیں تو ہر بالعرض کے لئے موصوف بالذاۃ کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں وہ امور عامہ جو اقسام ثلثہ کو شامل ہیں واجب ہیں بالعرض ہوں گے جس سے واجب کا محل حوادث ہونا اور غیر کی طرف محتاج ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر عوارض عامہ نہیں تو امور مذکورہ اقسام ثلثہ کے ذاتیات میں سے ہوں گے یا لوازم ذات ہیں سوائے اس کے کوئی احتمال نہیں۔ پہلی صورت میں تو لازم آئے گا کہ اقسام ثلثہ شریک الجنس ہوں جس سے واجب میں ترکیب کا ہونا اور مقولات عشر کا جنس عالی نہ ہونا لازم آتا ہے اور دوسرے میں اقسام ثلثہ کا متحد الذات اور متحد الماہیہ ہونا لازم آتا ہے۔ اس لئے کہ اتحاد لوازم ذات کو اتحاد ذات اور اختلاف ماہیۃ و ذات لازم ہے۔ بینوا توجروا۔ قال صاحب المواقف الموقف الثانی فی الامور العامۃ ای مالایختص بقسم من الاقسام الثلثۃ وہی الواجب والجوہر والعرض اورد علیہ بما محصلہ ان الامور العامۃ اما ان تکون عوارض لہذاہ الثلثۃ۔ اولا علی الاول لابد لہا من موصوف بالذات فان بالعرض فلہ ما بالذات بالضرورۃ فتکون فی الباری بالعرض فیلزم کون الواجب تعالیٰ شانہ محلا للحوادث و محتاجا الی الغیر وہو محال وعلی الثانی اما ان تکون ذاتیۃ او من لوازم الذات علی الاول یلزم ان تکون الاقسام الثلثۃ مشترکۃ فی الجنس فیلزم الترکیب فی الواجب جل شانہ وان لاتکون المقولات اجناسا عالیۃ وعلی الثانی تکون الاقسام الثلثۃ متحدۃ بالذات والماہیۃ فان اتحاد لوازم الذات یلزمہ اتحاد الذات واختلافہما یلزمہ اختلاف الذات والماہیۃ اقول فی الجواب وباللہ التوفیق ولنمہد اولا ان الممکنات باسرہا جواہر کانت او اعراضا لیست مقتضاہا الوجود بل ہو باعطاء الواجب جل مجدہ وکذا کل شئی فی الممکن بما یتصور بالنظر الظاہری اشتراکہ فی الواجب تعالیٰ شانہ فیکون منشاء جمیع الکمالات ذاتہ تعالیٰ ولکل ما بالعرض انما یکون بالذات ہو الوجوب او اذا تمہد ہذا فنقول لایلزم علی تقدیر اختیار الشق الاول کون الواجب محلا للحوادث و محتاجا الی الغیر فانہ انما یلزم لو کان ذلک تحصیلا من الغیر واما اذا کان منشارہ ذاتہ تعالیٰ وتقدس فلا یلزم شئی من المحذورین وایضا نقول وان کان مخالفا للاکثر ولہذا اخاف المناقشۃ ان الامور التی تعد مشترکۃ فی الاقسام الثلثۃ لیست مشترکۃ فی الحقیقۃ بل ہو قول ظاہری واما النظر الدقیق فہو یحکم بان ذاتہ تعالیٰ وتقدس لیس معہ اشتراک شئی اصلا اشتراکا معنویا مثلا الوجود ثابت للممکن والواجب لکن ما ہو ثابت للواجب لیس ما ہو ثابت للممکن وانما ہذا الاطلاق باعتبار الاشتراک اللفظی وکذا الحال فی جمیع الصفات مثل العلم والقدرۃ ولک ان تقول علی طبق ما قال الفارابی فی الفصوص الذات الواجبۃ بسیطۃ محضۃ وما یفہم زیادۃ علیہا من الامور العامۃ او الصفات فہو علیہ تعالیٰ لا اثنینیۃ فیہا اصلا وانما ہذہ الکثرۃ بانتزاع من العقل فان قلت علی تقدیر الاشتراک اللفظی لایکون شئی من الامور العامۃ فان ما للواجب لیس لغیرہ قلت الامور العامۃ تکون باعتبار الاشتراک فی القسمین الباقیین کالحدوث مثلا فانہ مشترک بین الجوہر والعرض۔

نقل سوال مولوی محمود حسن صاحب

آیۃ وضو میں جو موافق قراۃ ابوبکر لفظ ارجلکم مجرور ہے جس سے تصریح عطف رؤسکم مذہب امامیہ اعنی فرضیۃ مسح قدم اور عدم فرضیۃ غسل قدم راجح معلوم ہوتی ہے سو اول تو اس کا جواب معقول دیجئے۔ دوسرے یہ فرمائیے کہ اطلاق لفظ رؤسکم اس بات کو متقاضی ہے کہ اگر فرض ہو تو تمام سر کا مسح فرض ہو یا ایک دو بال کا۔ فقط حنفیوں نے جو ایک ربع راس کی شاخ لگادی اس کی کیا وجہ ہے۔ جواب:۔ اقول بحول اللہ وقوتہ جناب عالی سوال اول کا تو جواب یہ ہے کہ قراۃ ارجلکم

بالنصب تمام قراء کی یہی قرأۃ ہے۔ بجز ابو بکر کے اور یہ قاعدہ مسلم ہے کہ اختلاف قرأۃ سے اختلاف احکام نہیں ہوتا یعنی یہ نہیں ہوتا کہ بموجب ایک قرأۃ کی ایک چیز کی فرضیت ثابت ہو اور بحکم دوسری قرأۃ کے عدم فرضیت۔ علیٰ ہذا القیاس اور حالت نصب میں فرضیۃ غسل ظاہر اس لئے حالت جر میں بھی فرضیت غسل بجنسہ برقرار رہنی چاہیئے۔ اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ دو قرأۃ متواترہ جب مختلف ہوں تو ان کا حکم دو آیتوں کا سا ہوتا ہے اس لئے حتی الوسع تطبیق میں کوشش کی جاتی ہے۔ اگر تطبیق نہ ہو سکے تب کسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ترجیح بھی نہیں بن پڑتی تو پھر احادیث و اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس قاعدہ کے موافق جب ہم نے دونوں آیتوں کو ملاحظہ کیا تو اس میں دو وجہ تطبیق سمجھ میں آئیں اس لئے حالت کسی اور شے کی نہ ہونی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ارجلکم بسبب جر جوار کے مجرور ہوا اور معنی وہی ہوں جو حالت نصب میں ہونے چاہئیں اور یہ قاعدہ تمام نحاۃ کے نزدیک جائز ہے اور کلام اللہ میں بھی چند مواضع میں مستعمل ہے اس وقت کوئی آیت یاد نہیں آتی اور اقوال شعراء میں بھی یہ قاعدہ جاری ہے جیسا کہ قول نابغہ لم یبق الا اسیر غیر منفلت او موثق فی عقال الاسر مکبول لفظ مکبول روی قصیدہ مجرور کی ہے حالانکہ معطوف ہے اسیر پر۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسح کو یہاں غسل کے معنوں میں استعمال کیا جاوے اور یہ معنی بھی محاورات عرب میں مستعمل ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں مسح الارض المطر حضرات شیعہ عاملہم اللہ بعدلہ یہاں یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ اس صورت میں جمع بین الحقیقۃ والمجاز لازم آتا ہے کیونکہ برؤسکم میں تو مسح بمعنی حقیقی ہے اور ارجلکم میں بمعنی اعنی غسل ہے اور جمع بین الحقیقۃ والمجاز ممنوع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک وامسحو قبل ارجلکم کے مقدر مان لیں گے اور الفاظ متعددہ سے معانی متعددہ مراد لینے میں کچھ خرابی نہیں اور یہ اعتراض کرنا کہ ایسے پیچ کے ساتھ جس کے معانی سمجھنے میں دقت ہو خلاف شان کتاب اللہ ہے۔ واہیات ہے کیونکہ یہ آیت فرضیت وضو کے بہت عرصہ کے بعد نازل ہوئی تھی ارکان بموجب تعلیم حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلے معلوم ہو چکے تھے اور سب لوگ اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ کیونکہ روز پانچ وقت اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لئے یہ یہاں اُن لوگوں کو کافی و وافی تھا اس کے سمجھنے میں کسی کو خلجان نہیں ہوا۔ اور ارجلکم ایدیکم کے متصل کرنے میں اور برؤسکم پر مقدم کرنے میں بعض فوائد مثل بیان ترتیب وغیرہ نکلے جاتے تھے اس لئے یہ ترکیب مرقومہ کے موافق بیان کیا اور احادیث کے بعض کلمات اس کے مؤید ہیں۔ مثلاً لفظ ویل للاعقاب بعض احادیث میں موجود ہے اور عملدرآمد دوامی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی تائید کرتا ہے۔ ورنہ اگر مسح جائز ہوتا تو جناب ختمی مآب مثل اور احکامات جائزہ کے بیان جواز کے لئے اس کو بھی ایک دو بار مدت العمر میں ضرور عمل میں لاتے۔ ان تمام امور سے فرضیت غسل ہی کی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر بالفرض ان تمام امور سے قطع نظر کی جائے تب بھی مسح مصطلحہ حضرات شیعہ ہداہم اللہ کا اس کسی طرح پر نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ مسح مطلق بغیر کسی قید کے مذکور ہے۔ تحت یا فوق وغیرہ کسی جانب کی کچھ قید نہیں۔ حضرات روافض کا ایک سمت کو ہیئت کذائی کے ساتھ معین کرنا بالکل بے اصل ہے واللہ اعلم۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں اطلاق لفظ رؤسکم تو اس کو ہی مقتضی ہے کہ یا تو تمام راس کا مسح فرض ہے یا ایک دو بال کا۔ چنانچہ امام مالک و امام شافعی رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ اول شق تو مذہب امام مالک رحمۃ اللہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسح کل راس کا فرض ہے جیسا فامسحوا بوجوہکم میں تمام وجہ کا مسح فرض ہے۔ اس کا جواب حنفیہ کی طرف سے یہ ہے کہ جب یوں بولا کرتے ہیں کہ مسحت الجدار بالید تو تمام جدار مراد ہوتی ہے اور جب مسحت بالجدار بولتے ہیں تو جب بعض مراد ہوتی ہے اس لئے کہ پہلی صورت میں تو جدار مقصود بالمسح ہے کیونکہ وہ مسح کا مفعول محل واقع ہے اور افعال متعدیہ میں محل مقصود ہوتا ہے بخلاف صورت ثانیہ کے۔ اس واسطے کہ یہ قاعدہ مقررہ ہے کہ

لفظ با اصل میں وسائل اور وسائط پر داخل ہوتا ہے تو جدار اگرچہ حقیقت میں محل ہے مگر اب بسبب دخول با کے مشابہ بالوسائل ہو گئی مقصود نہیں اس لئے جہاں جدار مقصود ہے وہاں کل مراد ہوگی اور جہاں جا وسیلہ مقصود قرار دی جائے گی وہاں بعض کیونکہ وسیلہ کی ضرورت حصول مقصود کے لئے ہوتی ہے پس بقدر وسیلہ الی المقصود کافی ہوگا کل کی حاجت نہیں جب جب یہ قاعدہ ممہد ہوچکا تو ہم کہتے ہیں کہ وامسحوا برؤسکم میں بارؤسکم پر داخل ہے اس واسطے بہ مشابہ وسیلہ کے ہوگا اور بقدر ضرورت یعنی ما یثبت بہ مجرد حصول الفعل فی المحل کافی ہوگا۔ زیادہ کی ضرورت نہیں ہاں البتہ اس وقت یہ اعتراض ہوگا کہ پھر وامسحوا بوجوہکم کے کیا معنی ہوں گے، یہاں بھی چاہیئے کہ بعض وجہ مراد ہو وہو باطل کما ہو ظاہر تو اس کا جواب یا تو یہ دیا جاوے کہ یہ کلمہ تیمم کے بیان میں آیا ہے اور تیمم خلیفہ وضو ہے۔ سو اصل کے موافق عمل کیا جاوے گا۔ اسی واسطے آیۂ تیمم میں بایدیکم کو مطلق چھوڑ دیا کچھ تحدید نہ کی ورنہ چاہیئے تھا کہ بغلوں تلک مسح کرنا پڑتا دوسرا جواب یہ ہے کہ تیمم میں استیعاب نص سے نہیں ثابت کرتے بلکہ احادیث مشہورہ سے کرتے ہیں اور حدیث مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو مشہور بالمعنی ہے مقدار ناصیہ کو ثابت کرتی ہیں اور امام مالک پر اس باب میں حجت ہے اور شق ثانی مذہب شافعیہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک یا تین بال کے مسح کرنے سے فرض ادا ہوجاتا ہے کیونکہ مسح مطلق ہے ادنیٰ سے اعلیٰ تک برابر بولا جاتا ہے اس کا جواب حنفیہ کی طرف سے یہ ہے کہ ہم مسح کو مطلق نہیں کہتے بلکہ مقدار کے باب میں مجمل ہے اس لئے کہ مطلق مسح کی تعریف تو امرار ید مبتلہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک دو بال کے مسح کرنے کو مسح راس نہیں کہتے۔ اب مسح راس کی حد معلوم ہونی چاہیئے سو حدیث حضرت مغیرہ کے اس کا بیان قرار دیا جائے گا۔ یہ جوابات تو ختم ہوئے اب ایک اور تقریر کرو جو ان تمام تکلفات سے خالی ہو اور روافض کا جواب بھی بخوبی حاصل ہو جائے اور حنفیہ کی بھی مؤید ہو۔ سننی چاہیئے بشرطیکہ مجھ سے بیان ہوسکے ڈرتے ڈرتے مختصر عرض کرتا ہوں جہاں کہیں نقص ہوگا میرا قصور [illegible] ۔ یاد سمجھنا چاہیئے۔ بہت دن ہوئے کہ استاذی مولانا مدظلہم سے سنی تھی۔ سو رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی۔ تقریر تو بہت عمدہ و طویل ہے مگر اپنے حوصلہ کے موافق مختصر عرض کرتا ہوں۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے لفظ با اصل میں الات پر داخل ہوتا ہے تو آیۃ وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین میں بھی جب اس قاعدہ کو ملحوظ کریں گے تو ظاہر ہوجاوے گا کہ رؤس آلہ مسح ہے کہ مفعول مسح اور علی ہذا القیاس ارجلکم بھی کیونکہ معطوف و معطوف علیہ متحد فی الحکم ہوتے ہیں۔ اور مفعول وامسحوا محذوف ہے۔ یعنی وامسحوا الماء برؤسکم وارجلکم اور ماء مسح کے معنی میں داخل ہے۔ اور مسح کے قرینہ سے سمجھنا چاہیئے تو اب یہ معنی ہوئی کہ مسح کرو تم پانی کو اپنے سروں سے اور پیروں سے یعنی روس اور ارجل تو آلہ مسح ہیں اور ماء اس کا مفعول ہے تو ایسی صورت ہوئی کہ پانی تو اپنی جگہ مستقر ہے اور سر اور ارجل کو اس پر رکھیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ سر کی مسح میں تو کچھ تحدید نہیں کی اور ارجل میں الی الکعبین کی قید مذکور ہے تو جب ارجل کو پانی پر اس طرح رکھیں کہ کعبین تلک پانی سے مماس ہوں تو تمام ہی کا دھلنا لازم آئے کا غسل اور کس چیز کا نام ہے البتہ سر میں یہ قید نہیں اس لئے مسح راس مطلق رہا تو جس جانب سے راس کو سطح ماء پر رکھ دیں فرض ادا ہوجائے گا۔ تو اب امام شافعی کی رائے تو اس طرف معلوم ہوتی ہے کہ پانی بھی کروی شکل ہے اور راس بھی۔ اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ کرہ کرہ سے ایک نقطہ پر مماس ہوتا ہے اس لئے ان کے نزدیک ایک یا تین بال کے مسح سے بھی فرض مسح ادا ہوجاوے گا۔ اور امام صاحب کی رائے اس طرف معلوم ہوتی ہے اور یہی ٹھیک ہے کہ راس کرہ نہیں بلکہ بچکا ہوا

کرہ کیلئے تو بجا ہے اس کی چار سمتیں ہیں۔ کما ہو ظاہر تو جب اس کو پانی کی سطح پر رکھو گے تو ناچار کم سے کم ایک نہ ایک جانب سے مماس پانی کی سطح سے ہوگا اس لئے فرضیت مسح ربع راس کے قائل ہوئے۔ اب یہ شبہ ہوتا ہے کہ پھر چاہیئے کہ سر کا مسح جائز نہ ہو بلکہ غسل ہے چاہیئے سو البتہ اس تقریر کے موافق غسل راس چاہیئے مگر بعض منائع سے یہاں مسح ہی پر اکتفاء کیا مثلاً یہ کہ سر کا دھونا حکم میں سارے بدن کے دھونے کے ہے اور ہر وقت غسل کرنا موجب حرج شدید ہے اور مسح احادیث مشہورہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ کما مر واللہ اعلم بحقیقۃ الحال+

نقل سوال مولوی فخرالحسن صاحب

حصول الاشیاء بانفسہا یا باشباحہا کے کیا معنی ہیں اور ان دونوں مضمونوں میں باہم تعارض ہے یا توافق بھی ممکن ہے — جواب:۔ حصول اشیاء بانفسہا اور حصول الاشیاء باشباحہا جہاد ومذہب ہیں یعنی حصول الاشیاء بانفسہا کے یہ کہتے ہیں کہ حصول ماہیت شے وقت علم کے اس طرح سے ہو کہ حصول ساتھ تشخصات خارجی نہوں اور معقولی اس بات کے قائل ہیں کہ علم شے کا اس طرح پر ہوتا ہے کہ اس شے کی ماہیت ذہن میں آتی ہے مجرد ہوکر تشخصات سے لیکن اس پر حصول اشیاء باشباحہا کے قائل اعتراض کرتے ہیں کہ اگر حصول اشیاء بانفسہا ہوگا تو کچھ تمیز درمیان علم زید اور علم عمرو وغیرہ کے نہ رہیں گے۔ اس لئے کہ جب ماہیتہ مجرد ہوکر دونوں کے ذہن میں گئے تو فقط حیوان ناطق کہ ماہیت زید وعمرو کے ہے دونوں آپس میں ہرگز متمیز نہ ہوویں گے اور جب متمیز نہ ہوئیں تو علم زید بعینہ علم عمرو ہوگیا اور اس کا جواب حصول اشیاء بانفسہا والے یہ دیتے ہیں کہ جس وقت ماہیت شے کی ذہن میں مجرد ہوکر آتی ہے تو بمجرد حصول کے عوارضات ذہنی یعنی تشخصات ذہنی اس کو لاحق ہوجاتے ہیں اور یہ تشخصات ذہنی مثل تشخصات خارجی کے ہوتے ہیں۔ اب اس صورت میں علم زید علم عمرو دونوں متمیز ہوں گے پھر اس جواب پر حصول الاشیاء باشباحہا والے اعتراض کرتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ تشخصات ذہنی مثل تشخصات خارجی عارضی ہوں اس صورت میں ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عوارضات ذہنی جو کہ ماہیۃ زید کو عارض ہوئے ہیں ماہیتہ عمرو کو کیوں نہیں عارض ہوئے اس اعتراض کا جواب بعض نے مثل ملا حسن کے یہ دیا ہے کہ وقت حصول ماہیت کے بعض عوارضات خانگی بھی ذہن میں آتے ہیں اور یہ ہی موجب ترجیح ہوتے ہیں اور فرق درمیان دونوں معقولوں کے اہل معقول یہ بیان کرتے ہیں کہ معنی حصول اشیاء بانفسہا کے یہ ہیں کہ حصول ماہیتہ ذہن میں اس طرح سے ہو کہ اگر خارج میں وہ پائی جائے تو اس شے کی مانند ہو یعنی اس شے کی عین ہوکر پائی جائے اور معنی حصول اشیاء باشباحہا کے یہ ہیں کہ حصول شے ذہن میں اس طرح پر ہو کہ اگر خارج میں پائی جاوے تو اس کے سایہ کی مثل ہوکر پائی جاوے۔ یہ تحقیق تو وہ ہے جو کہ نزدیک معقولیوں کے مشہور معروف ہے۔ وتحقیقہ علی ما افادہ الاستاذ العلامۃ انار اللہ برہانہٗ وادام اللہ علیٰ رؤسنا انزاع لفظی لیکن یہ بات ایک بات پر موقوف ہے اور وہ یہ ہے کہ علم ما بہ الانکشاف ایک نور ہے کہ خداوند کریم نے انسان کو عطا کیا۔ وہ نور ایک منبسط جیسا نور آفتاب نہ صورۃ حاصلہ کما ہو مذہب الحکماءؔ نہ کیفیت انجلائیہ یا ادراکیہ کما ہو مذہب المتکلمین حسب علم ما بہ الانکشاف وہ نور ہے کہ خداوند کریم نے انسان کے اندر رکھا ہے تو اب سنئے کہ علم کسی شے سے اگر متعلق ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ نور علم اس شے کا احاطہ کر لیتا ہے تو جیسا نور آفتاب جس سے متعلق ہوتا ہے اس کو محیط ہوتا ہے یعنی سطح ظاہری اس شے کی محاط ہوتی ہے اور وہ نور آفتاب اس کو محیط ہوتا ہے اور محیط کا سطح باطنی محاط کی سطح ظاہری پر منطبق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آفتاب علم کا

حال قیاس کرنا چاہیئے کہ جب علم مثل نور منبسط حاوی ایک شئے کو ہوا اور وہ شئے محوی تو بیشک وہ شئے معلوم ہوجائے گی اور اس کا انکشاف ہوجائے گا اب اس وقت میں ہیئتہ مثل محوی کے اس نور علمی حاوی میں پیدا ہوجاتے ہے اور اس ہیئتہ کے دو اعتبار ہیں۔ ایک اعتبار سے اس نور علمی حاوی کے عین ہے اس لئے کہ وہ ہیئتہ اصل میں نور علمی ہے یعنی منتہی ہوا ہے۔ ایک صورت خاص کے ساتھ اور وہ صورت محوی کی ہے اور اصل میں مفعول فعل کا یہ ہے انتہار فعل ہوتی ہے۔ اور مفعول بھی جس کو کہتے ہیں اس پر انتہار فعل ہوتا ہے تو حقیقت انتہا فعل مفعول ہے نہ یہ مفعول جس کو مفعول بہ نحوی کہتے ہیں۔ چنانچہ علم خلق وغیرہ میں حالانکہ متعدی ہے اس کے کام نہیں چلتا زیادہ گفتگو اس میں اس لئے نہیں کی جاتی کہ یہ مسئلہ مسئولہ نہیں۔ پس اس اعتبار سے معنی حصول اشیاء بانفسہا کے صحیح ہوں گے۔ اور ایک اعتبار دوسرا واسطے اس ہیئتہ کے یہ ہے کہ لحاظ کریں اس ہیئتہ کو بہ نظر محاط یعنی محوی کے تو اس صورت میں ہیئتہ غیر نور علمی کے ہوگی جس نے اس لحاظ کی طرف لحاظ کیا اس نے باشباحہا کہا اور جس نے پہلے لحاظ کو ملحوظ کیا اس نے بانفسہا کہا۔ کیوں کہ آخر وہ شئے خود ہی تو اس نور علمی کی محاط ہو رہی ہے نہ غیر ان دونوں کو لحاظ کرنے سے یعنی اس شئے کو محاط محوی اور نور علمی محیط حاوی مان لینے سے اور ہیئت محاط محوی کی محیط کی سطح میں مان لینے سے یہ اختلاف رفع ہوگیا ورنہ معقولیوں کی طرح پر ان دونوں میں تعارض ہے اور تاویل حصول الاشیاء بانفسہا کی اس طرح پر کہ اس پر اعتراضات سابقہ وارد نہوں بغیر اس تحقیق کے کہ جو ہم نے بحوالہ استاذ العلامہ ادام اللہ الی یوم القیمہ تحقیق کے ہی سمجھ میں نہیں آتا اس وقت جو کچھ یاد آیا لکھ دیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال وعلمہ اتم واحکم واجزم فقط

نقل سوال ہدایہ مولوی فتح محمد صاحب ساکن تھانہ بھون

اقالہ کس کے نزدیک بیع جدیدہ ہے اور کس کے نزدیک فسخ اور اس کی کیا تفصیل ہے اور تفسیر اور ہر مذہب کی کیا دلیل — جواب:۔ اقالہ نزدیک امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فسخ ہے حق متعاقدین میں اگر ہو سکے اور بیع جدید ہے حق ثالث میں مثل شفیع کے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ زید نے ایک حویلی عمر سے خریدی اور بکر اس کا شفیع تھا وقت بیع کے اس نے اجازت دیدی یا خبر اس کو پہنچی اور اس نے اشہاد نہ کیا دعویٰ شفع کا اس کا باطل ہوا پھر عمر نے زید سے اقالہ حویلی مذکور کا کرنا چاہا۔ اب درمیان زید و عمر کے تو فسخ ہوتا ہے تو دعویٰ اس کا نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ پہلی رضا اس کی ہو چکی تھی اور اگر فسخ نہ ہو سکے تو اقالہ باطل ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ زید نے ایک غلام عمر سے خریدا اور عمر کے پاس آکر اس میں کوئی عیب حادث ہوا مثلاً ہاتھ کٹ گیا یا آنکھ پھوٹ گئی یا کوئی اور عیب۔ اب بیع غلام کا فسخ ممکن نہیں۔ پس اقالہ باطل ہے۔ اور دلیل امام صاحب کی یہ ہے کہ لفظ اقالہ لغت موضوع ہے واسطے رفع کے اور یہی معنی اصطلاحی فسخ کے ہیں یعنی رفع عقد سابق کا۔ پس لفظ اپنے معنی موضوع لہ میں مستعمل ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے نزدیک اول بیع ہے اور اگر بیع نہ ہو سکے تو فسخ ہے اور اگر فسخ بھی نہ ہو سکے تو اقالہ باطل ہے صورت اول کے کہ جس میں یہ ہو سکے یہ ہے کہ ایک غلام زید نے خریدا بکر سے اور اس کا قبض بھی کر لیا۔ اب اگر عمر اقالہ کرنا چاہے تو یہ عقد درمیان زید و عمر کے جو ہوا بیع جدید ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں بیع نہ ہو سکی۔ مثلاً زید نے عمر سے لونڈی خریدی اور اس کو قبض نہ کیا۔ اب قبل القبض چاہتے ہیں اقالہ کرنا چونکہ بیع قبل القبض جائز نہیں اسی واسطے فسخ ہوا تیسری صورت یہ ہے کہ جس میں فسخ بھی ممکن نہو۔ مثلاً زید نے بکر سے ایک لونڈی خریدی اور اس کے پاس آکر وہ معیوب ہوگئی اب فسخ تو بسبب معیوب ہونے کے ممکن نہیں اس لئے اقالہ باطل ہوا اور دلیل امام ابی یوسف رحمۃ اللہ کے یہ ہے کہ احکام بیع کے اس پر وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ

شفیع کے حق میں بیع ہوتی ہے اور بسبب عیب کے مبیع بھی پھرایا جاتا ہے مثل اور مبیع کے اور نزدیک امام محمدؒ رحمۃ اللہ اول فسخ ہے اور اگر فسخ نہو سکے تو بیع ہے۔ مثلاً زید نے عمر سے ایک کتاب خریدی اب زید چاہتا ہے اقالہ کرنا جب عمر نے کتاب لی اور زید نے ثمن تو بہ عقد فیما بین فسخ ہوا اور اگر کتاب کو چوہوں نے کتر ڈالا تو فسخ اس کا ممکن نہیں اس لئے یہ بیع ہوئی اور دلیل امام محمد رحمۃ اللہ کی یہ ہے کہ لفظ اقالہ لغت موضوع ہے واسطے رفع اور فسخ کے اور محتمل ہے صورت بیع کو کیونکہ اس میں تراضی طرفین اور مبادلۃ المال بالمال ہوتا ہے اور معنی رفع کے حدیث شریف سے ثابت ہیں اللہم اقلنی عثراتی کے تاوقتیکہ لفظ معنی موضوع لہ میں مستعمل ہوسکے معنی محتمل میں مستعمل نہ کریں گے اور جو موضوع لہ مستعمل نہیں ہو سکتا تو معنی محتمل فیہ میں استعمال کریں گے۔

نقل سوال مولوی عبداللہ صاحب جلال آبادی

حضرت بریرہ کی نسبت بعد آزاد ہوجانے کے بشہادت حدیث شریف یہ حکم ہوا تھا کہ چاہو اپنے خاوند مغیث کے پاس رہو چاہیں ہوجائیں۔ اور احادیث دیگر دربارہ غلامی و آزادی مغیث مخالف ایک دیگر۔ سو ہم پوچھتے ہیں کہ حدیث مشعر غلامی مؤید مذہب شافعی اور مخالف مذہب حنفی ہے یا نہیں اور قوت روایت غلامی باعث مذہب شافعی کو راجح کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ علی ہذالقیاس حدیث مشعر آزادی مؤید مذہب حنفی اور معارض حدیث شافعی ہے یا نہیں پھر باعتبار عقل کون سا مذہب منصور ہے کون سا نہیں۔ جواب:۔ جاننا چاہیئے کہ اللہ جل شانہ نے ہر شخص کو حر الاصل پیدا کیا ہے یعنی بدون عوارض کفر وغیرہ کے ہر شخص کی حریت ہے اور اپنے ہر قسم کے نفع اور نقصان کا اس کو اختیار ہے لیکن بباعث کفر اور مقبوض ہوجانے اہل اسلام کے وہ اختیار واسطے تذلیل کفر کے باطل ہوجاتا ہے یا بباعث طفولیت اور عدم حوصلہ عاقبت اندیشی مجبور رہتا ہے۔ پھر جس وقت یہ عوارض مرتفع ہوجاتے ہیں تو اختیار اصلی عود کر آتا ہے چنانچہ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا اور حدیث بریرہ اس پر ناطق ہے۔ یعنی اس قدر تو حدیث شریف اور قرآن شریف سے ثابت ہے کہ وقت آزادگی اور بلوغ کے اختیار ہوجاتا ہے ہاں اس میں کلام ہے کہ اگر خاوند حُر ہو تو اس وقت بھی اختیار ہے یا فقط غلامی کی صورت میں منحصر ہے۔ پس ہم کہتے ہیں قطع نظر اس سے کہ حدیث غلامی کے مقابل ہو حدیث آزادی کی یا نہ ہو علت اختیار کی خروج عن قبضۃ المسلم ہے اس لئے کہ جس وقت قبضہ نہ پایا گیا تو باعث بطلان اختیار اعنی مجموعہ کفر و قبضہ اہل اسلام نہ پایا گیا پس اختیار باطل نہ ہوگا۔ پس جس وقت کہ علت اختیار کی خروج عن قبضۃ المسلم قرار پائی تو وہ ہر دو وقت اعنی زوجیت و غلام ہو یا زوجیت حر پائی گئی تو اختیار بھی ہر دو وقت میں ثابت ہوگا۔ یہ اس وقت میں جبکہ حدیث مشعر آزادی سے قطع نظر ہو اور بنا کلام فقط حدیث غلامی پر ہو کیونکہ حدیث اختیار سے تخصیص غلامی اور آزادی کی کچھ ثابت نہیں ہوتی اور جس وقت کہ حدیث آزادی کا خیال کیا جائے گو علی وجہ الضعف ہو تو تائید کامل مذہب حنفی کی اور تعارض تمام مذہب شافعی کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے حدیث ضعیف غیر معتبر اس وقت شمار کی جائے گی جس وقت کہ اس کی اور کوئی حدیث معارض ہو اور یہاں حدیث غلامی کو قوی ہے معارض حدیث آزادی کی نہیں۔ اس واسطے کہ اصل میں تو مغیث غلام ہے اور آزادی میں کلام ہے۔ بعض احادیث سے گو ضعیف ہوں یہ تو ثابت ہے کہ آزاد ہوئے اور یہ کسی حدیث سے ثابت نہ ہوا کہ آزاد نہ ہوئے بلکہ رواۃ غلامی کی غرض سے ہو سکتا ہے کہ اثبات غلامی وقت آزادگی کی غرض ہو تو یہ امر غیر ممکن ہے کہ وقت آزادگی کے جمیع اشخاص موجود ہوں ورنہ آزادگی کی کوئی ایسی علامت جس سے یہ معلوم ہوجائے کہ آزاد ہے غلام نہیں یا غلام ہے آزاد نہیں پس ہو سکتا ہے کہ رواۃ قوی

غلامی سے کوئی وقت آزادگی کے موجود نہ ہو اور رواۃ ضعیف آزادی کے موجود ہوں ہاں اگر یہ امر ثابت ہوجا اور ترجیح قوی کو دی جا اور یہ امر متعسر ہے یا اگر غلامی کی صورت کچھ اور ہوتی ہے اور وقت آزادگی بریرہ تک رواۃ غلامی نے مغیث کو صورۃ غلامی میں دیکھا ہو تو آزادی مغیث کی نہ ثابت ہو۔ پس معلوم ہوا کہ وہ رواۃ غلامی مغیث کی مذہب حنفی کو کچھ ضرر نہیں کرتی اور نہ مذہب شافعی کی معارض ہوتی ہے اور باعتبار عقل کے مذہب حنفی منصور ہے جیسا بیان ہوچکا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نقل سند

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ مولوی محمد عبدالحق ساکن قصبہ پور قاضی ضلع مظفرنگر سنہ ۱۲۸۰ھ ہجری میں شرح ملا پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے علوم نحو بلاغت منطق فلسفہ حکمت کلام اصول فقہ حدیث تفسیر فرائض ریاضی ہیئت ادب میں کتب ذیل تحصیل کیں۔ نحو میں شرح ملاّ۔ بلاغت میں مختصر معانی۔ منطق میں شرح تہذیب قطبی میر قطبی سلم العلوم، ملاحسن، میر زاہد، رسالہ مع عبدالعلی وغلام یحییٰ میر زاہد جلالیہ حمداللہ قاضی مبارک فلسفہ حکمت میں میبذی صدرا شمس بازغہ، کلام میں شرح عقاید شرح مواقف میر زاہد امور عامہ، اصول میں اصول شاشی نورالانوار حسامی توضیح تلویح مسلم الثبوت، فقہ میں شرح وقایہ کنزالدقائق، ہدایہ حدیث میں مشکوٰۃ شریف ترمذی مسلم بخاری شریف نسائی ابوداؤد وابن ماجہ موطا، تفسیر میں جلالین بیضاوی، فرائض میں سراجی، ریاضی میں جبر ومقابلہ خلاصۃ الحساب تحریر اقلیدس ہیئت میں تصریح شرح چغمینی سبعہ شداد، ادب میں مقامات ہندی مقامات حریری دیوان متنبی تاریخ یمینی حماسہ سبعہ معلقہ سالانہ امتحانوں میں عدد کامل حاصل کیا اور ہمیشہ انعام پایا۔ استعداد عالی مناسبت تام ذہن ثاقب طبع سلیم فکر مستقیم رکھتے ہیں اور بطور نیابت طلبہ کو درس دیتے رہے۔ ان کے خوبی اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسین اور مہتمم راضی اور سب طلبہ سبق یاب وہم سبق خوش رہے۔ اب بعد تکمیل تحصیل بمشورہ مہتممان مدرسہ سے یہ سند عطا ہوئی۔ فقط ۱۹ ذی قعدہ سنہ ۱۲۹۰ھ ہجری۔

العبد مدرسین مدرسہ عربی دیوبند ضلع سہارنپور

العبد مدرس اول — مولوی محمد یعقوب صاحب
العبد مدرس دوم — مولوی رشید احمد صاحب
العبد مدرس سوم — مولوی محمد محمود صاحب

العبد مہتممان مدرسہ مذکور الصدر

العبد — مولوی مہتاب علی صاحب
العبد — مولوی ذوالفقار علی صاحب، ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع سہارنپور
العبد مہتمم مدرسہ — مولوی محمد رفیع الدین صاحب

(۲) نقل سند مولوی محمود حسن خلف الرشید مولوی ذوالفقار علی صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع سہارنپور ساکن دیوبند ضلع سہارنپور سنہ ۱۲۸۳ھ ہجری میں تہذیب پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے۔ منطق میں تہذیب قطبی میر قطبی حکمت میں میبذی بلاغت میں مختصر معانی کلام میں

شرح عقاید اصول میں شاشی نورالانوار توضیح تلویح، فقہ میں کنز شرح وقایہ ہدایہ، حدیث میں مشکوٰۃ ترمذی نسائی مسلم ابوداؤد، ریاضی میں تصریح شرح چغمینی، ادب میں مقامات ہندی مقامات حریری دیوان متنبی تاریخ یمینی تاریخ تیموری حماسہ باقی کتب درسیہ بخدمت جناب مولوی محمد قاسم صاحب تحصیل کیں۔ سالانہ امتحانوں میں عدد کامل پایا اور انعام ہمیشہ ان کو ملا استعداد جید مناسبت تام ذہن ثاقب طبع موزوں فکر صائب رکھتے ہیں اور بطور نیابت طلبہ کو درس دیتے رہے۔ انکی خوبی اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسین اور مہتمم راضی اور سب طلبہ سبق یاب و ہم سبق خوش رہے، اب بعد تکمیل تحصیل بمشورہ مہتمان مدرسہ سے یہ سند عطا ہوئی۔ فقط ۱۹ ذیقعد ۱۲۹۰ھ

العبد مدرسین و مہتمان مثل سند سابق

(۳) مولوی فخرالحسن ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور ۱۲۸۴ھ ہجری میں شرح ملا پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے۔ نحو میں شرح ملا جامی بلاغت میں مختصر معانی منطق میں تہذیب شرح تہذیب قطبی میر قطبی اصول میں نورالانوار فقہ میں کنز شرح وقایہ ہدایہ، حدیث میں مشکوٰۃ ادب میں مقامات ہندی مقامات حریری دیوان متنبی اور باقی علوم کی تکمیل بخدمت مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد قاسم صاحب کی۔ سالانہ امتحانوں میں عدد کامل پایا اور انعام انکو ہمیشہ ملا استعداد عالی مناسبت تام ذہن رسا طبع وقاد فکر صائب رکھتے ہیں خوبی اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسوں اور مہتمم کو خوش اور ہم سبقوں کو راضی رکھا، اب بعد تکمیل تحصیل بمشورہ مہتمان مدرسہ سے یہ سند عطا ہوئی۔ ۱۹ ذی قعد ۱۲۹۰ھ (باقی مثل سابق)

(۴) مولوی فتح محمد ساکن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ۱۲۸۳ھ ہجری میں داخل مدرسہ مختصر معانی پڑھتے ہوئے ہوئے۔ بلاغت میں مختصر معانی منطق میں قطبی میر قطبی حکمت میں میبذی، کلام میں شرح عقاید اصول میں شاشی نورالانوار، فقہ میں ہدایہ، حدیث میں نسائی مسلم بخاری شریف موطا، تفسیر میں بیضاوی، ہیئت میں تصریح، ادب میں نفحۃ الیمن مقامات حریری دیوان متنبی یہاں تحصیل کیں اور باقی کتب درسیہ اور جا پڑھیں۔ سالانہ امتحانوں میں عدد کامل حاصل کرکے انعام پایا۔ استعداد کامل مناسبت تام طبع سلیم فکر صائب ذہن رسا رکھتے ہیں اور عہدہ نیابت پر کارگزاری بخوبی تمام کرتے رہے۔ ان کی خوبی اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسین اور مہتمم راضی اور سب طلبہ سبق یاب و ہم سبق مداح ہیں۔ اب بعد تکمیل تحصیل بمشورہ مہتمان مدرسہ یہ سند عطا ہوئی۔ فقط ۱۹ ذی قعد ۱۲۹۰ھ (باقی مثل سابق)

(۵) مولوی عبداللہ ساکن جلال آباد ضلع مظفر نگر ۱۲۸۳ھ ہجری میں کافیہ پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے۔ نحو میں کافیہ شرح ملا، بلاغت میں مختصر معانی منطق میں ایساغوجی قال اقول میزان منطق مرقات تہذیب شرح تہذیب قطبی میر قطبی حکمت میں میبذی، کلام میں شرح عقاید اصول میں شاشی نورالانوار توضیح تلویح فقہ میں منیۃ المصلی قدوری کنز شرح وقایہ، حدیث میں مشکوٰۃ ادب میں مقامات ہندی نفحۃ الیمن یہاں تحصیل کیں، اور باقی تکمیل اور جا کی۔ سالانہ امتحانوں میں انعام پایا استعداد جید مناسبت درست طبع وقاد فکر صائب ذہن رسا رکھتے ہیں۔ ان کی خوبی اخلاق اور عمدہ چال چلن سے مدرسین اور مہتمم راضی اور سب طلبا خوش رہے۔ اب بعد تکمیل تحصیل بمشورہ مہتمان مدرسہ سے یہ سند عطا ہوئی۔ ۱۹ ذی قعد ۱۲۹۰ھ (باقی مثل سابق)

اکابروں کے اکابر

دیوبند کے یہ پنجتن جو اکابر تھے یقیناً اس تعریف کے مستحق تھے اور اس توجہ اور فضیلت کے اہل تھے جو بانی دارالعلوم، ارباب دارالعلوم اور اکابر اولیاء کی جانب سے ان پر نچھاور ہوئی۔ یہ پنجتن اس وقت دارالعلوم کے طلباء میں صف اول میں بیٹھنے کے لئے آمادہ و تیار ہوئے۔ جب بقول روداد دارالعلوم ۱۲۸۳ھ مدرسہ کی بنیاد قائم کرتے ہوئے قائم کرنے والوں کو یہ اندیشہ ستارہا تھا کہ "پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آئیں گے (سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۲۸۸)۔ انہوں نے چھتہ کی مسجد فرش اور مسجد میں انار کے درخت کے جلوے دیکھے تھے۔ انہوں نے ۱۲۸۳ھ سے لیکر ۱۲۹۰ھ تک مدرسہ دیوبند کے دس سالہ نصاب تعلیم اور پھر چھ سالہ تربیتی کورس سے اپنی استعداد علمی میں اضافہ کیا تھا۔ جو چھتہ کی مسجد سے جہاں بنائے مدرسہ ڈالی گئی تھی، قاضی کی مسجد اور وہاں سے کرایہ کے مکانوں میں اپنا قیمتی سفر طے کرتے ہوئے آخرکار نوتعمیر جامع مسجد دیوبند میں اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا اختتام کرکے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ہاتھوں اپنے سروں پر دستار فضیلت بندھوائی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سمیت ہزاروں ہزار مسلمانوں کی دعائیں حاصل کیں۔ انہوں نے دارالعلوم کے ابتدائی سالوں کے نشیب و فراز اور ان سالوں کے نت نئے مصائب و مسائل کا سامنا کیا اور مخالفت، غفلت، بے اعتنائی، بے پرواہی کے طوفان کا مقابلہ کیا۔ ان پر جو کچھ بیتی اس کا تذکرہ ۱۲۸۳ھ سے لیکر ۱۲۹۰ھ تک کی سالانہ رودادوں میں نصاب کے سلسلہ میں اکابر دیوبند کی سعی۔ دارالعلوم کے پہلے کانوکیشن اور اس کے کانوکیشن ایڈریس۔ سرسید کے تبصرے۔ اور پھر ان تبصروں پر مزید تبصروں سے ملتا ہے جو تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کئے گئے کہ ان سے ان اکابروں کے اکابر کی تعلیمی زندگی کی صحیح عکاسی ہوجائے۔ جنگ آزادی میں ناکامی اور اس ناکامی کے مقابلہ کے لئے اکابر علماء کی دعائیں اور دوائیں۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے محرکات اس لئے بیان کئے گئے تاکہ ان پنجتن دیوبند کی تعلیم و تربیت کی صحیح غرض و غایت سامنے آجائے۔ اسی بنا پر یہ پانچ فارغ التحصیل و تدریس بزرگ علماء ان ہزاروں ہزار علماء کے سرگروہ ہیں جو ۱۳۸۲ھ تک جس کا ایک سرسری اندازہ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں کیا گیا ہے سے تعلیم حاصل کرکے اپنے اپنے حلقہ میں مقتدا اور امام بنے یا جو آئندہ علمائے اُمت ہم مرتبہ انبیائے اسرائیل کی صف میں شامل ہوں گے۔ ان پانچ بزرگوں میں حضرت مولانا شیخ الہند کی سوانح تو حضرت میاں جی اصغر حسن دیوبندی اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے قلم سے کتابی شکلوں میں شائع ہوچکی ہے اور جن کے بارے میں حضرت مولانا قاری طیب صاحب نے راقم سے فرمایا کہ وہ درس و تدریس میں جانشین قاسم العلوم تھے۔ لیکن اس مختصر سے گروہ کے دوسرے سب سے بڑے رکن فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی کے حالات کے بارے میں جماعت دیوبند کی طرف سے اس بات کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ انہیں بھی ترتیب دیکر شائع کیا جائے۔ حضرت فخر العلماء کے بارے میں قاری محمد طیب نے ایک بار اظہار فرمایا تھا کہ وہ تصنیف و تالیف میں حضرت قاسم العلوم کے صحیح جانشین تھے کم از کم اس حیثیت ہی سے انہیں روشناس کرانا تھا۔ اور یہ صرف حضرت قاری صاحب ہی کی رائے نہیں ہے جناب انوار الحسن

شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۲۹ میں تصنیفات قاسمی کی اشاعت اور ترویج میں مساعی جمیلہ کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ مولانا فخرالحسن صاحب اپنے استاد قاسم العلوم کی کتابوں کی اشاعت اور مناظروں اور تقریروں کی طباعت میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود تاریخ دارالعلوم دیوبند میں ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔

فخرالعلماء فخرالعلماء مولانا فخرالحسن گنگوہی کی سوانح کی ترتیب کی ضرورت پر بہت سے اکابر علماء نے زور دیا ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے تذکرہ بزرگان دیوبند کے سلسلہ میں حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہوی کی حیات مبارک پر اپنے مضمون میں جس کی پہلی قسط دارالعلوم دیوبند کے رسالہ دارالعلوم کی اشاعت دسمبر سنہ ۱۹۵۲ء میں چھپی لکھا ہے کہ "یوں تو حضرت قاسم العلوم والمعارف کے شاگردوں کی تعداد بہت کچھ ہوگی لیکن یہ تین شاگرد بہت ہی مشہور ہوئے ہیں۔ اتنے مشہور کہ جہاں حضرت نانوتوی کا نام نامی آتا ہے ان تینوں کا نام بھی آجاتا ہے۔ (۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی۔ (۲) سید العلماء حضرت مولانا سید احمد حسن محدث امروہی اور (۳) فخرالعلماء حضرت مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی میں، مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں، مولوی عبدالرحمٰن امرتسری نے اپنے "سفرنامہ" میں، نیز دیگر تذکرہ نویسوں نے حضرت مولانا نانوتوی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی ان تینوں شاگردوں کا ذکر حضرت قاسم العلوم کے تذکرہ کے ضمن میں کیا ہے۔ (لیکن ہمارے مصنف تاریخ دارالعلوم دیوبند نے شاید ان کتابوں اور مضامین کا مطالعہ نہیں کیا) ان میں سے اول الذکر دو حضرات نے دیوبند اور امروہہ میں اپنے استاد معظم کے معارف، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حکمت اور حضرت شاہ امداد اللہ چشتی کے سلوک کی اشاعت کی۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور جملہ علوم و فنون کے درس دیئے اور تشنگان علوم کی ایک بڑی جماعت کو سیراب کیا۔ اور بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ہستیوں نے اپنے رفقا اور متوسلین کے ذریعہ سے ہند اور بیرون ہند میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا تعلیمی نظام اور تبلیغی پروگرام زندہ و برقرار رکھا۔ اور ان کی جد وجہد کے اثرات اب تک باقی ہیں ان دونوں نے اپنی تمام عمر درسی مشاغل میں صرف کی اور تادم آخر تعلیمات اسلامیہ کے رائج کرنے میں منہمک رہے اور نازک اوقات میں ملت بیضا کی پوری پوری حمایت وحفاظت کی۔ مولانا فخرالحسن گنگوہی کے کارناموں کا احقر کو پورا علم نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ مدرسہ عبدالرب دہلی میں کچھ عرصہ مدرس رہے۔ ابوداؤد شریف پر حاشیہ لکھا تھا۔ اپنے استاد کی بعض تصانیف کو مرتب کر کے شائع کرایا تھا اور ان کی ایک مبسوط ومکمل سوانح عمری لکھی تھی جس کا آج پتہ نہیں کہ کیا ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی صاحب جو مولانا فخرالحسن صاحب کی سوانح سے واقفیت رکھتے ہوں ان کے سوانح پر بھی ایک مقالہ سپرد قلم کر دیں۔ میرے خیال میں ان تینوں حضرات کی زندگیاں حضرت مولانا نانوتوی کی حیات طیبہ کا نتیجہ ہیں۔"

حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد سوم کے آخر میں ماثر قاسمی کے عنوان کے تحت صفحہ ۱۸۹ پر رقام فرمایا ہے کہ "یوں بھی سیدنا امام الکبیر کے تلامذہ اور شاگردوں کی تعداد خواہ جتنی بھی کم ہو لیکن نہ صرف ایک شیخ الہند بلکہ ان کے رفقائے درس مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخرالحسن گنگوہی رحمہم اللہ جیسے اس

کا بجا حق رکھتے ہیں کہ ایک مستقل جلد میں ان بزرگوں اور ان سے نفع اندوزوں کا ذکر کیا جائے۔"
اسی طرح مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری نقش بندی مجددی انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری حصہ دوم کے صفحہ ۲۴۷ پر "حضرت مولانا الحاج الحافظ الحکیم فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ " افسوس ہے کہ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کے مفصل حالات کسی کتاب میں اب تک شائع نہیں ہوئے جن سے آپ کی زندگی کے حالات پر مزید روشنی پڑتی۔"
ان کے علاوہ مولانا عبد الحئی نے نزہتہ الخواطر میں اور تذکرۂ علمائے حال۔ عربی علوم و فنون کے ممتاز علماء اور مشاہیر علمائے دیوبند کے مصنفین نے بھی حضرت فخر العلماء کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔
ان تین شاگردوں میں جن کا ذکر تواتر کے ساتھ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی سوانح کے سلسلہ میں آیا اور جسے مآثر قاسمی میں اس درجہ اہم مرتبہ دیا گیا کہ صاحب تصنیف نے ان کے کارناموں کے لئے ایک الگ جگہ کی ترتیب کی ضرورت کا اعتراف کیا۔ ان تینوں میں یہ فخر صرف حضرت فخر العلماء ہی کو حاصل ہے کہ وہ بیک وقت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے تحصیل علم کی سعادت حاصل کی۔
حضرت فخر العلماء نے اپنے دونوں متذکرہ بالا ہم سبق احباب کے مقابلہ میں بہت کم عمر پائی مگر آپ نے اپنی ذہانت وصلاحیت۔ علمیت و حکمت۔ تقریر و تحریر اور درس و تدریس کے میدان میں جو کارنامے انجام دیئے وہ کسی طرح کم نہیں اور ان کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔

خاندان

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی صفحہ ۴۲۸ میں تحریر فرمایا ہے کہ "مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی اولاد میں سے تھے"۔ یہی بات انہوں نے قاسم العلوم کے صفحہ ۹۷ میں تحریر فرمائی۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے صفحہ ۹۸ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے حوالہ سے بھی یہی بات دہرائی گئی اور قاری صاحب کے جو الفاظ انہوں نے نقل کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ "مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی خاندان قدوسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت قطب عالم کی اولاد میں سے تھے"۔ حالانکہ یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ حضرت فخر العلماء کی دادی قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی اولاد میں تھیں اور درگاہ قدوسیہ کے سجادہ نشین شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی تھیں۔ اس لحاظ سے آپ خاندان قدوسیہ کے فرد بن سکتے ہیں۔

حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی سے نسبی تعلق

قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی سے آپ کا سلسلۂ نسب نانا اور دادا دونوں کی طرف سے ملتا ہے۔ دادا کی طرف سے سلسلہ نسب یوں ہے۔ فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی بن شاہ عبد الرحمٰن بن مسماۃ فہیم النساء زوجہ شاہ حبیب اللہ بنت شاہ عماد الاسلام (سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ) بن شیخ عماد الدین بن شیخ رکن الدین بن شیخ معین الدین بن شیخ عبد الاحد

بن شیخ محمد طاہر بن شیخ فتح اللہ بن شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالحمید (صاحبزادہ اول صاحب وسجادہ) بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی ؒ۔ نانا کی طرف سے آپ کا سلسلہ حضرت قطب عالم تک اس طرح سے ہے۔ فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی بن الٰہی بیگم زوجہ شاہ عبدالرحمٰن بنت شاہ حسن عسکری بن حبیب النساء (زوجہ سید حسین بخش) بنت شاہ عماد الاسلام سجادہ درگاہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی ؒ۔ گویا حضرت کی دادی اور پرنانی دونوں سگی بہنیں تھیں۔ اور حضرت شاہ عماد الاسلام کی دختر نیک اختر تھیں۔

سیدنا ابو ایوب انصاری

فخر العلماء دراصل سیدنا ابو ایوب انصاری کی اولاد میں تھے۔ سلسلہ نسب یوں ہے:۔
فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی بن شاہ عبدالرحمٰن بن شاہ حبیب اللہ بن شاہ بونی سہارنپوری بن غلام بوعلی بن شرف الدین بن غلام محی الدین بن عبدالرشید بن فضیل محمد بن قاضی محمد کبیر بن قاضی امین الدین عرف قاضی امن شہید بن خواجہ امین الدین۔ بن خواجہ فرید الدین بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاؤ الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن شیخ الاسلام خواجہ ولی اسلام عبداللہ انصاری پیر ہرایت بن خواجہ ابومنصور محمد بن علی بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن منور مست بن سیدنا ابو ایوب انصاری صحابی رسول ﷺ۔

حضرت مولانا رشید احمد سے خاندانی تعلق

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی بھی انصاری خاندان سے وابستہ تھے۔ آپ اپنی والدہ اور والد دونوں کی جانب سے انصاری الاصل تھے مگر والدہ کی جانب سے آپ کا سلسلہ نسب قاضی محمد کبیر بن قاضی امن شہید پر جاکر حضرت فخر العلماء کے شجرۂ جدی سے مل جاتا ہے۔ مولانا گنگوہی کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ مولانا رشید احمد بن مساۃ کریم النساء بنت فرید بخش بن غلام قادر بن محمد صالح بن غلام محمد بن فتح محمد بن تقی محمد بن صالح محمد بن قاضی محمد کبیر الانصاری بن قاضی امین الدین عرف قاضی امن شہید۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت فخر العلماء میں ایک اور قرابت قریبہ بھی تھی جس کا ذکر اپنے مقام پر ہوگا۔

مولانا خلیل احمد اور مولانا صدیق احمد سے نسبی تعلق

حضرت فخر العلماء اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کا جدی سلسلہ بھی حضرت قاضی امین الدین عرف قاضی امن شہید پر جاکر مل جاتا ہے۔ حضرت سہارنپوری کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ مولانا شاہ خلیل احمد بن شاہ طیب علی بن شاہ احمد علی بن شاہ قطب علی بن شاہ غلام محمد بن شرف الدین بن غلام محی الدین بن عبدالرشید بن محمد فضیل بن نظام الدین بن قاضی امین الدین عرف قاضی امن شہید۔

حضرت مولانا صدیق احمد حضرت سہارنپوری کے سگے چچازاد بھائی تھے اور دونوں کے دادا ایک تھے۔ لہٰذا دادا پر حضرت سہارنپوری اور حضرت انبیٹھوی کا سلسلہ نسب ایک ہوجاتا ہے اور قاضی امن شہید پر حضرت فخر العلماء، حضرت سہارنپوری اور حضرت انبیٹھوی کا سلسلہ ایک ہوجاتا ہے۔ حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی صاحبزادے تھے مولوی حبیب احمد کے اور وہ صاحبزادے تھے حضرت شاہ احمد علی صاحب کے جو حضرت

سہارن پوری کے حقیقی دادا تھے۔

حضرت نانوتوی کے داماد مولانا عبداللہ صاحب سے نسبی تعلق

جس طرح حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری اور حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی سے حضرت فخر العلماء کا نسبی تعلق تھا بعینہٖ یہی تعلق حضرت مولانا عبداللہ صاحب ناظم دینیات و داماد حضرت قاسم العلوم و خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب صاحبزادے تھے حضرت مولانا انصار علی صاحب کے اور وہ صاحبزادے تھے شاہ احمد علی صاحب کے جو حضرت سہارن پوری اور حضرت انبیٹھوی کے دادا تھے اور یہاں آکر ان تینوں بزرگوں کا سلسلہ مل جاتا ہے اور آگے قاضی امن شہید پر حضرت فخر العلما کا سلسلہ ان کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے۔

حضرت فخر العلماء کی نانہال اور سلسلہ

حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی بادشاہ دہلی ابو ظفر بہادر شاہ کے پیر طریقت حضرت شاہ حسن عسکری شہید خلیفہ حضرت خواجہ سلمان تونسوی کے سب سے بڑے نواسے تھے آپ کی والدہ الٰہی بیگم حضرت شاہ صاحب کی حقیقی صاحبزادی تھیں۔ والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔ حضرت فخر العلما بن مسماۃ الٰہی بیگم بنت شاہ حسن عسکری شہید بن سید حسین بخشی بن سید شاہ غلام سادات دہلوی بن سید عبدالواحد بن سید احمد بن سید عبدالعلیم زنجانی بن سید حسین بن سید فتح اللہ بن سید حسن بن سید کمال الدین بن سید صدر الدین بن سید امام محمد بن سید زین العابدین بن مخدوم سید لطیف الحسن بن سید اسحاق مدنی المکی بن سید رضی الدین عرف ابراہیم بن سید سراج الدین بن سید ابراہیم بن سید عماد الدین بن سید عماد الاسلام بن سید کمال الدین بن سید نور الدین بن سید شاہ محمد بن سید تاج الدین بن سید ابوالمنصور بن سید ابو بکر بن سید ابو صدیق بن سید ابو محمد جیلانی بن سید ابو محمد حسین بن سید محمد یعقوب بن سید ابو المفرح بن سید امام ابو حمزہ بن سید امام علی رضا بن سید امام موسیٰ کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید امام محمد باقر بن سید امام زین العابدین بن سید نا امام حسین بن حضرت فاطمۃ الزہرا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بن عبداللہ۔

حضرت صابر بخش دہلوی سے تعلق

حضرت فخر العلما کا اپنے نانہالی سلسلہ کی وجہ سے دہلی کے مشہور چشتی صابری سلسلہ کے بزرگوں سے بھی تعلق تھا۔ حضرت شاہ غلام سادات دہلوی سے تو اس بناء پر کہ وہ حضرت شاہ حسن عسکری شہید کے حقیقی دادا تھے سلسلہ نسب میں اس تعلق کو واضح کیا جا چکا ہے۔ لیکن حضرت فخر العلما اسی تعلق سے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے ایک اور بزرگ سے بھی نسبی تعلق رکھتے تھے جن کا نام حضرت شاہ محمد چشتی تھا اور جن کو اکابر دہلی قدوۃ العارفین کے نام سے جانتے ہیں۔ اسی طرح سے آپ کا نانہالی تعلق حضرت شاہ صابر بخش دہلوی سے بھی تھا کہ وہ بھی حضرت شاہ غلام سادات دہلوی کے حقیقی پوتے اور حضرت شاہ حسن عسکری شہید کے حقیقی چچا حضرت شاہ غلام نصیر الدین کے فرزند ارجمند تھے۔ اسی تعلق سے آپ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی والدہ مسماۃ امت اللہ حضرت فخر العلما کی والدہ الٰہی بیگم کی

حقیقی بہن تھیں اور حضرت شاہ حسن عسکری ان دونوں بزرگوں کے حقیقی نانا تھے۔

شیخ المشائخ حضرت منشی حافظ علی سے قرابت قریبہ

حضرت فخر العلما کے دادھیالی سلسلہ میں حضرت منشی حافظ علی صاحب ایک مشہور صاحب تصوف بزرگ گذرے ہیں جو آپ کے حقیقی پھوپھا۔ آپ کے والد کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی اور آپ کے پردادا شاہ یونس کے حقیقی نواسے تھے۔ ان کے سوانح نگار جناب محمود علی نے آپ کو شاہ ولایت گجرات دکن کے خطاب سے بھی یاد کیا ہے۔ حضرت منشی حافظ علی صاحب کی ولادت سنہ ۱۲۱۱ھ میں ہوئی۔ آپ کی والدہ کا نام حکیم النسا تھا جن کا انتقال حضرت الا کی صغیر سنی میں ہو گیا ہوگا۔ آپ کے والد ماجد سید شاہ امام علی صاحب بن سید شاہ ظفر علی نبیرہ قطب الاقطاب فرد الاحباب بندگی سید شاہ ابو المعالی قدس سرہ تھے۔ آپ نے بچپن اپنے والد اور چچا سید شاہ غلام ضامن صاحب رحمۃ اللہ کی نگرانی میں گذارا اور ان ہی سے علوم ظاہری کی تحصیل فرمائی۔ آپ کی شادی جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے اپنے حقیقی ماموں اور حضرت فخر العلماء کے دادا شاہ حبیب اللہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ اس کے بعد آپ بسلسلہ ملازمت پٹیالہ چلے گئے جہاں میر منشی کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد راجہ اجیت سنگھ والی ریاست لاڈورہ ضلع انبالہ کے سپہ سالار ہو گئے۔ راجہ اجیت سنگھ کو آپ سے اتنی محبت تھی کہ جب راجہ رنجیت سنگھ نے انھیں اپنے پاس بلانے کی خواہش ظاہر کی تو راجہ اجیت سنگھ نے کہا "میری سب دھن دولت راج پاٹ کے آپ مالک و مختار ہیں مگر منشی حافظ علی کو آپ مجھ سے نہ طلب فرمائیں۔ لیکن جب راجہ اجیت سنگھ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تو آپ انبیٹھ لوٹ آئے۔ مگر جب راجہ مذکور کو گرفتار کر کے لاہور کے قلعہ میں نظر بند کیا گیا تو آپ نے فوراً لاہور کا قصد کیا اور راجہ صاحب کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ قلعہ سے نکال کر کشمیر پہنچا یا۔ جس کی پاداش میں آپ کو راجہ موصوف کے اہل و عیال کے ساتھ گرفتار کر کے سہارنپور کے قلعہ میں بند کر دیا گیا اور پھانسی کا حکم ہو گیا لیکن بفضل خداوندی آپ بچ گئے اور آپ کو دہلی لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ یہاں آپ اپنے ہی سلسلہ کے ایک بزرگ دین علی شاہ صاحب سے بیعت ہوئے اور ان ہی سے خلافت پائی۔ حضرت دین علی شاہ خاندانی روایات کے مطابق کالو شاہ کے اور وہ چاند علی شاہ کے اور وہ خواجہ عبد اللہ شاہ کے اور وہ شاہ میراں بھیک علی شاہ کے مرید تھے جو حضرت شاہ ابو المعالی کے بڑے خلفا میں تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضرت شاہ ابو المعالی حضرت بندگی شیخ داؤد گنگوہی کے خلیفہ تھے جن کا تعلق سلسلہ صابریہ چشتیہ سے ہے۔ وہاں سے حسب الحکم مرشد جودھپور تشریف لے گئے جہاں آپ نے دو سال قیام فرمایا۔ وہاں سے آپ ماؤنٹ ابو گئے اور تین سال تک وہاں قیام فرمایا۔ ابو سے آپ پالن پور تشریف لے گئے اور وہاں سے منتقل ہوتے ہوئے رادھن پور پہنچے جہاں آنے انتقال فرمایا۔ آپ کا انتقال حسب بیان صاحب "آئینۂ کرامت" ۲۷ شوال المکرم سنہ ۱۲۹۴ھ کو ہوا اور رادھن پور میں ہی آپ کے جسد خاکی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

شجرہ کی اور اہم باتیں

حضرت فخر العلما کے جدی سلسلۂ نسب میں دو حضرات قابل ذکر ہیں۔ ایک حضرت شیخ الاسلام محمد عبد اللہ انصاری اور ان کے والد ابو محمد الانصاری۔ دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا کے صفحہ ۱۹۵ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت ابو المنصور محمد الانصاری حضرت تشریف

حمزہ عقیل کے مریدوں میں تھے۔ آپ نے حضرت ابوالمظفر ترمذی سے کسب فیض کیا۔ آپ کے صاحبزادے شیخ الاسلام نے فرمایا کہ شیخ احمد کی نانی نے مجھ سے" ایک بار کہا کہ تم نے تمام دنیا کی سیر کی لیکن اپنے باپ جیسا کسی کو بھی نہ پایا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ میں نے کچھ اوپر ستّر سال حصول علم پر صرف کئے" اصلاح اعتقاد اور کسب علم کے سلسلہ میں بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں لیکن یہ سب کچھ میں نے اپنے والد ماجد سے حاصل کیا۔ آپ نے ماہ شعبان ۴۳۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک حضرت شریف حمزہ عقیل کے مزار کے قریب بلخ میں واقع ہے۔ آپ کے صاحبزادے اور حضرت فخر العلما کے مورث اعلیٰ شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری تھے۔ تاریخ مشائخ چشت میں درج ہے کہ شیخ عبداللہ انصاری، پیر ہروی کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور محدث اور صوفی تھے۔ حنبلی مذہب کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اتباع سنت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اہل بدعت سے ہمیشہ برسر پیکار رہے اور اسی وجہ سے پانچ مرتبہ ان کو لوگوں نے دھمکی دی کہ آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ آپ نے تصوف کو مقبول عام بنانے میں بڑا کام کیا۔ آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف منازل السائرین۔ طبقات الصوفیہ۔ کتاب جامع الکلام اور مناجات؛ منازل السائرین عربی زبان میں ہے اور تصوف کے مسائل پر اس قدر مقبول عام کتاب ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ طبقات الصوفیہ عبدالرحمٰن سلمی کی تصنیف سے ماخوذ ہے۔ جامع الکلام میں دینیات کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ پیر ہروی کی مناجات بڑی پُر درد اور پُر تاثیر ہے اس کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے۔ جامع الکلام کا نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے شیخ عبداللہ ہروی کی تصانیف کو ہندوستان میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی سرور الصدور ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری خلیفہ خواجہ معین الدین چشتی میں متعدد جگہ ان کی تصانیف کا ذکر ہے۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ آپ کی ارادت اپنے والد بزرگوار سے تھی۔ آپ کا اصلی وطن ہرات ہے۔ آپ اولاد منصور مست انصاری بن ابو ایوب انصاری میں سے ہیں۔ کہ صاحب دل اور عالم تھے حضرت مست انصاری زمانہ خلافت حضرت عمرؓ میں خراسان پہنچ کر ہرات میں سکونت پذیر ہوئے اور حضرت شیخ الاسلام بزرگان و محدثان و مفسران میں عظیم المرتبہ تھے۔ صاحب نفحات الانس نے جہاں کہیں شیخ الاسلام کا تذکرہ کیا ہے وہاں مراد آپ ہی ہیں اور طریقت میں مقامات بلند و مدارج ارجمند کے مالک تھے۔ آپ کا اپنا فرمودہ ہے کہ نو برس کی عمر میں نوشت و خواند کے لائق ہو گیا تھا اور چودہ سال کی عمر میں مجلس میں بٹھا دیا تھا۔ اور اشعار عربی میرے زیادہ چھ ہزار سے ہیں و اشعار تازی و فارسی بقدر ایک لاکھ یاد ہیں اور سہ صد ہزار حدیث نبویؐ حفظ ہیں ہزارہا ہزار اسناد بھی۔ الجواہر المرقیہ میں درج ہے کہ شیخ الاسلام امام ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری مشہور محدث و صوفی ہیں۔ امام ترمذی سے انھیں دو واسطوں سے تلمذ حاصل ہے۔ سال ولادت ۳۹۶ھ اور سال وفات ۴۸۱ھ ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا نہایت مبسوط تذکرہ لکھا ہے جو ان لفظوں سے شروع ہوتا ہے "شیخ الاسلام الحافظ الامام الزاہد" یہ تذکرہ سات سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے امام ابوحنیفہ کی ایک مسند بھی لکھی تھی جس کا نام جمیع احادیث ابی حنیفہ ہے۔ اس مسند کو حافظ سمعانی آپ سے دو واسطوں سے روایت کرتے ہیں۔ اور حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مندسی لکھتے ہیں کہ ایک بار ہرات میں امام ابو اسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری سے امام ترمذی اور ان کی جامع کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ " ان کی کتاب میرے نزدیک بخاری و مسلم کی

کتاب سے زیادہ نافع ہے کیونکہ بخاری و مسلم کی کتابوں سے تو صرف عالم متبحر ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن ابو عیسیٰ (یعنی امام ترمذی) کی کتاب سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔"
شہزادہ دارا شکوہ نے اپنی مشہور تصنیف سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ آپ کی کنیت ابو اسمٰعیل ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت ابو منصور محمد الانصاری تھے۔ لقب شیخ الاسلام ہے نفحات الانس اور اس کتاب (سفینۃ الاولیا) میں جہاں کہیں بھی صرف شیخ الاسلام مذکور ہے اس سے آپ ہی کی شخصیت مراد ہے۔ اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے خرقۂ طریقت پہنا تھا ہرات کے باشندے تھے۔ آپ حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں سے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور میزبان تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ عہد عثمانی میں احنف بن قیس کے ہمراہ خراسان آئے اور ہرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ شیخ الاسلام کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے۔ آپ سے متعدد خوارق و کرامات کا ظہور ہوا۔ اپنے زمانہ میں بے مثل و بے مثال شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جب میری عمر ۹ سال کی تھی تو قاضی مجھے املا بولتے تھے۔ جب میں چودہ سال کا ہوا تو مجھے درسگاہ ادب میں داخل کر دیا گیا۔ اس درسگاہ میں سب سے کم عمر میری تھی۔ میں عربی میں شعر کہتا تھا۔ لوگ مجھ سے حسد کرتے تھے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ چند ہزار ابیات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ کو ایک لاکھ اشعار حفظ تھے۔ تین لاکھ حدیثیں نوک زبان تھیں جو آپ نے ہزاروں اساتذۂ فن سے حاصل کی تھیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ کسی نے بھی میرے زمانہ میں وہ کچھ نہیں کیا جس کا ظہور مجھ سے ہوا۔ اگر کوئی اپنے جسم پر ہاتھ رکھ دیتا اور مجھ سے دریافت کرتا کہ یہ کیا ہے تو میں اس کے جواب میں حدیث سے سند پیش کر سکتا تھا۔ فرمایا میں نے تین سو اشخاص سے حدیث کی سماعت و کتابت کی اور یہ سب علم حدیث میں اصحاب فن تھے۔ فرمایا کہ قاضی ابراہیم نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی خواب میں زیارت کی۔ میں نے عرض کی۔ اے خدا بندہ تجھ تک کیسے رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ فرمایا کہ۔ اس وقت کہ کوئی مانع نہ ہو۔ یعنی کوئی ایسی بات نہ ہو جو میرے اور بندے کے درمیان حجاب نہ بن جائے۔ آپ بروز جمعہ غروب آفتاب کے وقت ماہ شعبان میں جبکہ بہار کا موسم تھا اور سن ۳۹۶ھ تھا متولد ہوئے۔
آپ نے ربیع الآخر کے وسط میں ۴۸۱ھ میں وفات پائی اور ۸۵ سال کی عمر پائی۔
آپ کا مزار عالیہ اور درگاہ ہرات میں مرجع خاص و عام ہے۔ علمائے فرنگی محل اور جلندھر کے امام ناصر الدین بھی آپ ہی کی اولاد تھے۔ جناب اسمٰعیل انصاری نے حضرت فخر العلما کے جدی سلسلۂ نسب کے بارے میں لکھا ہے کہ "نسب کے اعتبار سے آپ انصاری تھے۔ اور آپ کا سلسلہ چند واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ میں نے وہ شجرہ جس کو بعض خواہد و شواہد اور دلائل کی بنا پر صحیح اور درست بتایا جاتا ہے (اور جس کا متعلقہ حصہ اوپر نقل ہو چکا ہے) خود دیکھا ہے۔ افسوس ہے کہ تقسیم کے بعد وہ پھر باوجود سعی کے نہ مل سکا۔ بظاہر بعض کتب قدیم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چار بھائی جن میں سے دو کے نام حافظہ میں رہ گئے اور دو کے نہیں یہاں تشریف لائے تھے اور ضلع سہارنپور۔ پانی پت۔ کرنال اور دوسری جگہ ان چاروں بھائیوں کی اولاد پھیلی ہے۔ یہ سب حضرات شیخ زادگان کے نام سے موسوم ہیں اور ان کو منصب قضا ملا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ شاہان وقت کے یہاں برگزیدہ اور معتمد الیہ رہے ہیں کیونکہ اسلاف کو بہت سی معافیاں اور جاگیریں ملی تھیں جو ختم ہوتے ہوتے اب بھی جزوی طور پر باقی ہیں۔ حضرت فخر العلما کی دادی کا سلسلہ نسب جیسا

کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ملتا ہے۔ اس تعلق سے حضرت شیخ احمد سعید گنگوہی خلیفہ خاص حضرت نظام الدین تھانیسری بلخی، بندگی حضرت شیخ داود حضرت شیخ عبدالنبی صدرالصدور۔ اکبر بادشاہ کا بھی آپ سے نسلی تعلق تھا۔

حضرت فخرالعلماء کی ولادت

خاندانی روایات کے مطابق جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت حضرت فخرالعلماء کی عمر بارہ سال کے قریب تھی۔ اس حساب سے آپ کا سن ولادت ۱۸۴۶ء قرار پاتا ہے۔ یہ اُس ممکنہ سن سے مختلف ہے جس کا قیاس پروفیسر انوارالحسن شیرکوٹی نے قاسم العلوم کے صفحہ ۹۸ میں کیا ہے۔ انہوں نے حضرت فخرالعلماء کے سن پیدائش کو حضرت شیخ الہند کے سن پیدائش ۱۸۵۳ء ہی کو قرار دیا ہے۔ حضرت فخرالعلماء کی پیدائش کا سن قرار دینے کے سلسلہ میں ان کے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کی پیدائش سے اندازہ لگانا پڑے گا۔ آپ کے سب سے چھوٹے بھائی شاہ مظہر حسین کی عمر آپ کی صاحبزادی حمیدہ بیگم اہلیہ جناب اشفاق حسین قدوسی کے بقول جنگ آزادی کے وقت ڈیڑھ سال کی تھی اور دونوں کے درمیان تین بہنیں اور پیدا ہوئیں۔ گویا اولاد اوّل میں حضرت فخرالعلماء کے بعد اولاد پنجم یعنی مولوی مظہر حسین کی پیدائش جنگ آزادی سے ۱½ سال قبل کی ہے۔ اس لحاظ سے بھی خاندانی روایات کی تائید ہوتی ہے جس سے آپ کا سن ولادت ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔ دوسرے حضرت شیخ الہند کے سن ولادت کو حضرت فخرالعلماء کے سن ولادت پر قیاس کرنا اس لئے ٹھیک نہیں کہ حضرت فخرالعلماء نے اپنی تعلیم کا آغاز حضرت شیخ الہند کی طرح دیوبند میں نہیں کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نے سوانح قاسمی میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت فخرالعلماء نے اول مولانا رشید احمد گنگوہی سے تحصیل علم کی جس کے واضح مطلب یہ ہیں کہ حضرت فخرالعلماء جب مدرسہ دیوبند میں پہنچے تو علمی حیثیت سے ان کی استعداد نئے طالب علموں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ پھر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنے کانووکیشن ایڈریس میں دیوبند کے پنجتن کی علمی کاوشوں اور استعداد کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ ان میں سے اکثر نے مدرسہ دیوبند میں تحصیل علم کی۔ اس اشارہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان پانچوں میں سب کے سب نے مکمل طور پر دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم نہیں کی۔ ان میں سے کم از کم دو یعنی حضرت شیخ الہند نے حضرت قاسم العلوم سے میرٹھ میں اور حضرت فخرالعلماء نے گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد سے تحصیل علم کی تھی۔ ان حالات کی روشنی میں حضرت فخرالعلماء کا سن ولادت ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔

حضرت فخرالعلماء کے دادا

حضرت فخرالعلماء کے دادا شاہ حبیب اللہ سہارن پور کے رہنے والے تھے اور شاہ بونبی سہارن پوری کے فرزند ارجمند تھے لیکن چونکہ آپ کی شادی قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے سجادے حضرت شاہ عمادالاسلام کی صاحبزادی فہیم النساء کے ساتھ ہوئی تھی اس لئے وہ آخیر وقت میں سہارن پور سے گنگوہ تشریف لاکر آباد ہوگئے تھے۔ حضرت شاہ حبیب اللہ کے والد شاہ بونبی جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے سہارن پور کے رئیس

تھے اور اس شہر کی بوبنی کی مسجد آپ ہی کی تعمیر کردہ تھی جو حضرت حاجی امداد اللہ کے دادا پیر
حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کا مرکز تھی۔ حضرت سید احمد شہید جب سہارن پور تشریف
لائے تو اس مسجد میں ان دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوئی اور اسی مسجد میں ان دنوں حضرت
سید صاحب نے قیام فرمایا۔ حضرت سید مولانا محمد میاں نے علمائے ہند کے شاندار ماضی
کی جلد دوم کے صفحہ ۱۱۸ میں "سہارن پور مسجد بوبنی میں قیام ہوا" کے عنوان کے تحت ارقام
فرمایا ہے کہ ولی محمد صاحب رئیس سہارن پور۔ مفتی شرف الدین صاحب۔ محمد یار خاں صاحب
الٰہی بخش صاحب۔ امام الدین صاحب۔ کریم الدین صاحب۔ سمن خاں۔ محمد حسین۔ مولوی شاہ
رمضان رڑکی والے جو بعد میں مجاہدین کا قافلہ لیکر سرحد پہنچے تھے یہیں (مسجد بوبنی) بیعت
ہوئے۔ سید صاحب نے بیعت کے بعد آپ کو خلافت عطا فرمائی۔ حکایات اولیاء مصنفہ
مولوی اشرف علی تھانوی کے صفحہ ۱۷۸ پر بھی بوبنی کی مسجد کا ذکر ہے جس سے اس کے اہم
ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت امیر شاہ خاں صاحب نے اسی صفحہ پر حضرت مولانا
محمد قاسم صاحب نانوتوی کے حوالہ سے اس مسجد میں حضرت سید احمد شہید بریلوی اور
حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی شہید کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔

حکایت ۱۴۵۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ میں نے مولانا نانوتوی سے سُنا ہے
کہ سید صاحب تشریف لائے تو بوبنی کی مسجد کی طرف جانکلے۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالرحیم
صاحب ولایتی رحمۃ اللہ علیہ اسی مسجد میں رہتے تھے۔ جب آپ مسجد کے نیچے تشریف لائے
تو آپ نے فرمایا کہ اس مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہیں، ہمراہیوں نے عرض کیا کہ ہاں حضور!
ایک بزرگ رہتے ہیں۔ سید صاحب یہ سن کر مسجد میں تشریف لے گئے اور حجرہ میں جاکر کواڑ
لگالئے۔ جب باہر نکلے تو سید صاحب ہنستے ہوئے نکلے اور شاہ عبدالرحیم صاحب روتے
ہوئے نکلے۔ اس قسم کے دو یا تین اور جلسے ہوئے کہ سید صاحب ہنستے ہوئے اور شاہ
عبدالرحیم صاحب روتے ہوئے نکلے۔ چوتھے یا پانچویں جلسہ میں سید صاحب اپنی حالت
پر نکلے اور شاہ صاحب روتے ہوئے نکلے۔ اس کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب سید صاحب
سے بیعت ہوگئے۔ یہ قصہ بیان کرکے مولانا نانوتوی نے فرمایا کہ اول کے جلسوں میں
جو سید صاحب ہنستے ہوئے اور شاہ صاحب روتے ہوئے نکلے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ سید
صاحب کی نسبت شاہ صاحب پر غالب تھی اور شاہ صاحب کی نسبت سید صاحب پر
اور آخر مرتبہ جو سید صاحب اپنی حالت پر اور شاہ صاحب روتے ہوئے نکلے تو اس کی
وجہ یہ تھی کہ سید صاحب کی نسبت کو غلبہ ہوگیا تھا۔ بہرحال یہ مسجد بوبنی جو حضرت فخر العلما
کے پردادا شاہ بوبنی نے سہارن پور میں تعمیر کرائی تھی بڑے بڑے بزرگوں کا مسکن رہی
ہے۔ حضرت کے دادا شاہ حبیب اللہ نے حضرت شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی سے
شادی کرکے فوراً بعد نقل مکانی نہیں کی۔ آپ نے اپنی صاحبزادی کی شادی حضرت منشی
حافظ علی صاحب سے سہارن پور ہی میں کی۔ جناب حافظ محمود علی نے "آئینہ کرامت"
کے عنوان سے حضرت حافظ صاحب کی جو سوانح شائع کی ہے اس کے صفحہ ۶ پر یہ تحریر ہے
کہ "آپ کی شادی شاہ حبیب اللہ بن شاہ بوبنی صاحب مرحوم جو آپ کے حقیقی ماموں
تھے ان کی صاحبزادی سے حسب رواج خاندان بڑی دھوم دھام سے ہوئی"۔ بہرحال
حضرت شاہ حبیب اللہ اواخر عمر میں گنگوہ آکر آباد ہوگئے۔ آپ نہایت متقی، پرہیزگار،
شریف اور سیدھے بزرگ تھے۔ حضرت مولانا عاشق علی میرٹھی نے اپنی مشہور تصنیف
تذکرۃ الرشید میں حضرت شاہ حبیب اللہ کا ایک واقعہ حضرت گنگوہی کی زبانی نقل کیا ہے

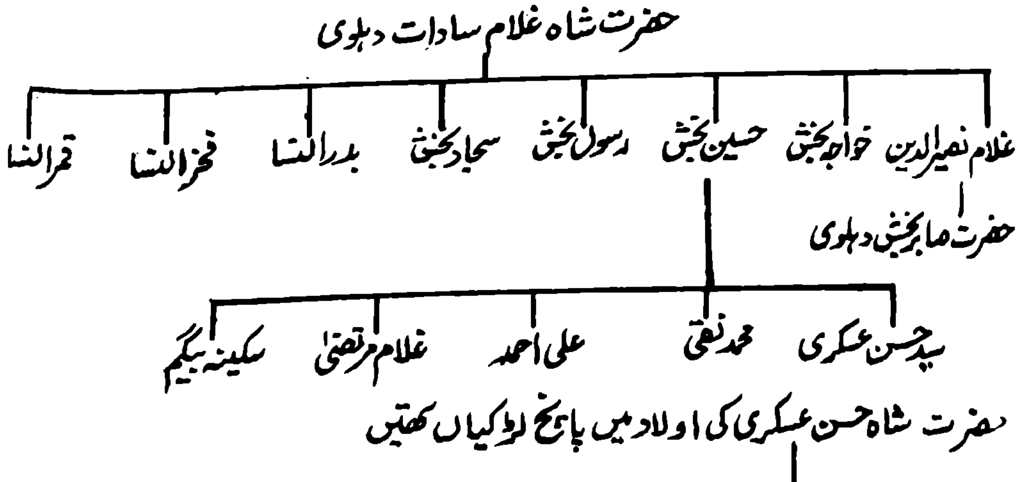
۲؎ اس تصنیف کے صفحہ ۲۷۷ پر ملفوظات کے تحت درج ہے۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ "مولوی مظہر حسین (برادر خورد حضرت فخر العلما) صاحب کے دادے ایک بھولے آدمی تھے۔ ان کے لڑکے عبدالرحمٰن نے (حضرت فخر العلما کے والد) جن کی قبر دیوار غربی احاطہ خانقاہ (قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی) کے قریب ہے۔ ایک دن رمضان کی ستائیس یا اٹھائیس تھی اپنے والد سے کہا کہ ابا جی میں نے چاند دیکھا۔ انہیں یقین آگیا اور کہتے پھرے کہ بھئی چاند ہوگیا کل کو عید ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولوی صاحب غضب کرتے ہو بھلا ستائیس یا اٹھائیس کو بھی چاند دکھائی دیتا ہے۔ وہ بولے کہ میرا بیٹا عبدالرحمٰن چھوٹا نہیں اس کی بالی نگاہ ہے دیکھ لیا ہوگا۔"

حضرت فخر العلماء کے والد کی شادی

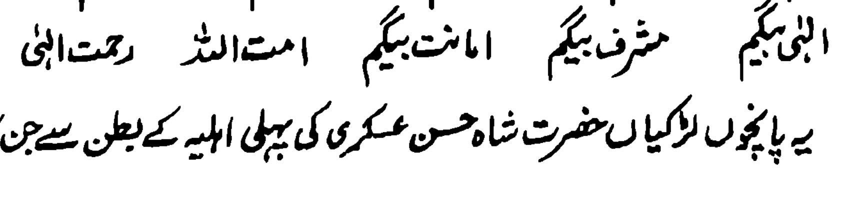
حضرت شاہ حسن عسکری کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ان کی کم از کم ایک اولاد ضرور ان کے پاس رہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی لڑکی کے لئے ایک ایسے نوجوان کی تلاش کی جو ان کے یہاں قیام پر رضامند ہو۔ خوش قسمتی سے انہیں زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑا اور اپنی گھر داماد کے لئے خود اپنے سگے خالہ زاد بھائی کے روپ میں بڑا داماد مل گیا۔ یہ سگے خالہ زاد بھائی شاہ عبدالرحمٰن بن شاہ حبیب اللہ بن شاہ بو بنی سہارنپوری تھے۔ شاہ عبدالرحمٰن کی والدہ اور حضرت شاہ حسن عسکری شہید کی والدہ سگی بہنیں تھیں اور شاہ عمادالاسلام سجادہ نشین درگاہ قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی صاحبزادیاں تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بڑی لڑکی الٰہی بیگم کا عقد شاہ عبدالرحمٰن کے ساتھ کر دیا جو خاندانی روایات کے بقول حسن سیرت اور حسن صورت دونوں خصوصیتوں سے مالا مال تھے۔

حضرت فخر العلماء کے نانا

شاہ حسن عسکری جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے حضرت شاہ غلام سادات دہلوی کے پوتے تھے جن کی اولاد حسب ذیل تھی۔



حضرت شاہ حسن عسکری کی اولاد میں پانچ لڑکیاں تھیں



یہ پانچوں لڑکیاں حضرت شاہ حسن عسکری کی پہلی اہلیہ کے بطن سے جن کا تعلق انبیٹھے

کے انصاری خاندان سے تھا پیدا ہوئی تھیں۔ حضرت شاہ حسن عسکری کی پہلی صاحبزادی الٰہی بیگم کی شادی جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے شاہ عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ ہوئی تھی۔ آپ کی دوسری صاحبزادی امت اللہ کی شادی انبیٹھے میں شاہ حبیب محمد کے ساتھ ہوئی جن کے بطن سے حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی پیدا ہوئے۔ حضرت کی تیسری صاحبزادی رحمت الٰہی کی اولاد میں حضرت مولانا اسرارالحق صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بہادیپور تھے۔ حضرت کی چوتھی صاحبزادی مشرف بیگم کی شادی جناب عنایت الدین ولد سعیدالدین ولد محمد تقی برادر شاہ حسن عسکری سے ہوئی اور پانچویں صاحبزادی امانت بیگم کے بطن سے دو صاحبزادے یعقوب اور اسحٰق تولد ہوئے۔

شاہ عبدالرحمٰن کی اولاد

شاہ عبدالرحمٰن نے شادی کے بعد سے لیکر جنگ آزادی کے وقت تک حضرت شاہ حسن عسکری ہی کے ساتھ اپنا وقت گذارا۔ شاہ حسن عسکری اس زمانہ میں دہلی میں ترکمان دروازہ کے پاس رہا کرتے تھے۔ یہ مکان حویلی نما تھا اور حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے جو حضرت شاہ صاحب کے نواسے تھے قیام دہلی تک موجود تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مکان کی دیواریں دوہری تھیں۔ جنگ آزادی کے موقعہ پر جب دہلی میں افراتفری ہوئی تو قرب وجوار کے سینکڑوں افراد نے اپنا مال و زر حضرت شاہ صاحب کے مکان میں بطور امانت جمع کرادیا۔ لیکن جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حضرت شاہ صاحب اور ان کے متوسلین نہایت پریشانی کے عالم میں دہلی سے نکلے اور یہ امانتیں اسی مکان میں محفوظ رہیں۔ جب شاہ حسن عسکری پر مقدمہ چلا تو انہیں پھانسی کی سزا دی گئی اور ان کی ساری املاک ضبط کرلی گئی۔ چنانچہ یہ مکان بھی ضبط ہوا اور جب دہلی کی کسی توسیعی اسکیم کے تحت اسے منہدم کیا گیا تو اس مکان سے لاکھوں روپیہ کی متمکات امانتیں نقد اور زیورات کی صورت میں نکلیں بہرحال شاہ عبدالرحمان اپنی اہلیہ الٰہی بیگم کے ہمراہ جنگ آزادی کے وقت تک اسی مکان میں حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ قیام پذیر رہے۔ یہیں ان کی تمام اولادیں ہوئیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

شاہ عبدالرحمٰن

فخرالعلماء حضرت مولانا فخرالحسن — پیرجی مظہر حسین — اولیا بیگم — انبیا بیگم — قطبی بیگم

اولاد کی تفصیل

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۹۴ اور ۹۵ میں شاہ عبدالرحمٰن کی اولاد کے بارے میں بعض تفصیلات دی ہیں۔ مولانا میرٹھی فرماتے ہیں کہ "حضرت قدس سرہٗ (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری) کا رشتہ مصاہرت قصبہ گنگوہ کے انصاری خاندان سے وابستہ ہے کہ شاہ حسن عسکری شہید کی جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک حضرت کے عم بزرگوار شاہ حبیب محمد کو منسوب ہوئیں جو کہ مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی والدہ تھیں اور دوسری صاحبزادی جن کا نام الٰہی بیگم تھا گنگوہ میں شاہ عبدالرحمٰن بن شاہ حبیب اللہ گنگوہی سے بیاہی گئیں۔ شاہ عبدالرحمٰن کی تین صاحبزادیاں ہوئیں جن میں سے ایک حضرت مولانا حکیم اسمٰعیل گنگوہی کلاجمیری) کے نکاح میں آئیں اور ان

کے بطن سے فخر خاندان حکیم سعید احمد صاحب تولد ہوئے جو آج اپنے باپ کے ہر امر میں سچے جانشین ہیں۔ اور بمبئی کے مشہور طبیب ہیں۔ دوسری صاحبزادی کا شاہ محمد صادق صادق صاحب سجادہ نشین انبیٹھہ سے رشتہ ہوا۔ اور تیسری صاحبزادی جن کا نام انبیا بیگم تھا حضرت قدس سرہٗ کے نکاح میں آئیں (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری)۔ ان بہنوں کے دو بھائی تھے۔ شاہ مظہر حسین اور (فخر العلما) مولانا حکیم فخر الحسن صاحب کے ثانی الذکر کی یادگار حضرت مولانا حافظ فیض الحسن صاحب مدظلہ ہیں جن کا شمار حضرت قدس سرہٗ (حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری) کے خلفا میں ہے اور اپنے موقعہ پر تذکرہ ہوگا۔" لیکن حضرت فخر العلما کی بھتیجی رشیدہ بیگم کے شوہر شاہ ضیاء الحق کے مطابق شاہ عبدالرحمٰن کی صاحبزادی اولیا بیگم کی شادی شاہ عزیز علی ساکن انبیٹھہ سے بھی ہوئی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق شاہ عبدالرحمٰن اور مسماۃ الٰہی بیگم کی یہ پانچوں اولادیں دو دو سال کے وقفہ سے دہلی ہی میں ہوئیں۔ اور جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب شاہ عبدالرحمٰن اپنی اہلیہ کے ساتھ گنگوہ پہنچے تو ان کی سب سے چھوٹی اولاد شاہ مظہر حسین کی عمر مشکل سے ڈیڑھ سال کی تھی۔

حضرت فخر العلماء کے والد

حضرت فخر العلما کے والد شاہ عبدالرحمٰن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے فرشتہ صورت اور فرشتہ سیرت تھے۔ اور حضرت شاہ حسن عسکری انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ لیکن جب جنگ آزادی ناکام ہوئی اور حضرت شاہ حسن عسکری نے دہلی کو خیرباد کہا تو ان کے داماد اور لڑکی بھی ان کے ہمراہ دہلی سے ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ عجب افراتفری کا دور تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق حضرت شاہ عبدالرحمٰن زنانے لباس میں دہلی سے روانہ ہوئے اور بڑی دقتوں اور دشواریوں کے بعد گنگوہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر اس قومی سانحہ نے ان کی زندگی کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا اور آپ کا انتقال جنگ آزادی کے تیسرے سال یعنی ۱۸۶۰ء میں ہوگیا۔ ان کا کم عمری میں انتقال بھی ایک سانحہ سے کم نہیں تھا۔ مگر ان کی جواں سال اہلیہ جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا سانحہ بھی مشکل سے دو سال ہوئے دیکھا تھا اب اس دنیا میں یکہ و تنہا رہ گئیں اور ان کی مدد کے لئے سوائے ان کے پندرہ سالہ فرزند فخر الحسن کے اس دنیا میں کوئی موجود نہیں تھا۔ حکومت وقت کے معتوب کی دختر ہونے کی وجہ سے جان پہچان والے تو کیا اعزا و اقربا بھی ان سے ملنے سے کتراتے تھے۔

حضرت فخر العلما کا بچپن

حضرت مولانا فخر الحسن کی ولادت دہلی میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارہ سال دہلی میں اپنے محترم و مقدس نانا اور اپنے فرشتہ خصلت والد کی زیر نگرانی گزارے اور یہیں انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کا بچپن کا یہ دور خوشیوں اور شادمانیوں سے مملو تھا۔ ایک طرف نانا۔ نانی دوسری طرف باپ ماں۔ تیسری جانب خالائیں۔ چوتھی جانب چھوٹے بھائی بہن۔ دولت۔ عزت۔ راحت سب ان کو میسر تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق صبح سے شام تک ڈیوڑھی پر عقیدت مندوں کا ہجوم اور غربا و فقرا کی یورش رہا کرتی تھی۔ ایک طرف لوگ برکت حاصل کرنے۔ دعائیں کرانے اور اپنی روحانی تربیت کے لئے دیوانہ وار آرہے ہیں اور ان میں امیر و غریب۔ شہزادے شہزادیاں امرا اور با اقتدار طبقہ کے لوگ سب شامل تھے۔ دوسری جانب صبح سے شام تک کھانا اور خیرات تقسیم ہو رہی ہے۔ حضرت فخر العلما اس ماحول میں خراب ہو سکتے تھے؟ کبر و نخوت کا شکار ہو سکتے تھے؟ طلب علم اور جد و جہد زندگی سے بے نیاز اور بیگانہ ہو سکتے تھے؟۔ مگر انہوں نے دیکھا کہ اس ہجوم عقیدت مندان اور اس کثرت خیرات و بخشش کے ماحول میں ان کے مقدس نانا جو اور جوار کی روٹی پر اکتفا کرتے ہیں اور پستہ پلاؤ۔ بادام پلاؤ۔ متنجن اور اسی قسم کے انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کی موجودگی میں بھی سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے موٹے جھوٹے کھانوں کو پسند فرماتے

اور کم گوئی اور کم خوری کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ اس لئے ان کے کردار پر اگر اثر پڑا تو اسی تقدس۔ پاکیزگی۔ بے نفسی۔ ایمان داری۔ انکسار اور حلم کا۔ اور یہی خصوصیات آگے جا کر ان کی زندگی کے سفر میں رفیق اور معاون ثابت ہوئیں جب حالات نے تبدیل ہو کر انہیں مصائب و شدائد زمانہ کا شکار بنا دیا۔

والدہ محترمہ

مگر ان کی زندگی پر سب سے گہری چھاپ ان کی والدہ محترمہ کی ہے انہوں نے اپنی والدہ سے ہمت و جرأت۔ استقلال و بہادری کا سبق لیا۔ ایک تو وہ یہ الٰہی بیگم تھیں جنہوں نے اپنے والد کے دور عروج میں سکون۔ نظم۔ خوشحالی اور فارغ البالی کے مزے لوٹے۔ انہوں نے وہ دور بھی دیکھا جس میں ان کی شادی شدہ زندگی کے تیرہ چودہ سال بھی تھے جب ان کا سب سے اہم کام والد۔ والدہ۔ شوہر اور بچوں کی خبر گیری کے بعد غربا و مساکین میں کھانا اور خیرات تقسیم کرنا تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق یہ کام صبح سے شام تک جاری رہتا تھا اور اس میں اس کھانے کی تقسیم بھی شامل تھی جو شاہ وقت بیگمات شاہی۔ شہزادوں اور شہزادیوں اور امرا کے یہاں سے پیر و مرشد کی خدمت میں بطور نذر آتا تھا۔ مگر جس کے بارے میں حضرت شاہ حسن عسکری کی ہدایت تھی کہ اسے بھی غربا اور مساکین میں بانٹ دیا جائے۔ لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا۔ فارغ البالی عسرت میں بدل گئی۔ دوست دشمن اور اپنے بیگانے بن گئے تو انہوں نے اپنے بیمار شوہر اور اپنے پانچ بچوں کی زندگی کی پوری ذمہ داری قبول کی اور اس ذمہ داری کو کماحقہٗ پورا کیا۔ ناز و نعم میں پلنے والی یہ پردہ نشین خاتون وقت پڑنے پر کوہ ثبات اور ہمت و جرأت کی چٹان ثابت ہوئی۔ آپ جب اپنے بیمار شوہر اور بچوں کو لے کر جن میں ایک شیر خوار بچہ بھی شامل تھا در بدر کی ٹھوکریں کھاتی۔ قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں پھرتی گنگوہ پہنچیں تو ایسا کوئی سہارا بظاہر نہیں تھا کہ جو گذر اوقات کے لئے کافی ہوتا۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ کے پاس ہیرے کی ایک انگوٹھی تھی جو اس دور ابتلا میں اپنی قیمت سے بہت کم پر فروخت کی گئی اور اس سے قوت لایموت کا سلسلہ چلا۔ تین سال کے اندر شوہر نامدار نے وفات پائی اور بحوالہ مولانا رشید احمد گنگوہی اپنی والدہ کے جد اعلیٰ قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خانقاہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ اب یہ خاتون محترم تھیں اور ان کی پانچ اولادیں جن میں سب سے بڑے حضرت فخر العلما صرف پندرہ برس کے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق دونوں نے مل کر گھریلو معاملات کو سنبھالا اور والدہ محترمہ نے کپڑے سی سی کر اپنے بچوں کی پرورش کی۔ یہ خاتون جن کی ابتدائی زندگی جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے انتہائی آرام سے گذری تھی اب ایک شہید کی بیٹی اور ایک مجاہد کی بیوہ تھیں۔ اسی عالم میں ان کی باقی تمام زندگی گذری اسی ماحول میں بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی ہوئی اور اس عالم میں بڑے بیٹے اور دو بیٹیوں کی مستقل جدائی اور رحلت کا غم انہوں نے اٹھایا۔ مگر ہر صدمہ اور ہر آفت کا انتہائی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ حضرت فخر العلما کی سیرت پر اپنے ابتدائی دنوں میں جس طرح اپنے نانا شاہ حسن عسکری کا اثر پڑا اسی طرح اپنی بہادر، دبنگ، جرأت مند، باحوصلہ اور نیک سیرت ماں کا بھی اثر پڑا۔ الٰہی بیگم نے اپنے بچوں کو بڑی مشکل سے پالا تھا اس لئے وہ انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھے اور ان بچوں کے بچے بھی۔ خاندانی روایات کے مطابق جب ان کی لڑکی قطبی بیگم اہلیہ حکیم محمد اسمٰعیل گنگوہی اجمیری کا وصال ہوا تو ان کے ایک صاحبزادے حکیم محمد سعید اور دو صاحبزادیاں امت ایمان اور میمونہ حیات تھیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادے شاہ مظہر حسین کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بڑی بیٹی ام سلمہ کا

نکاح حکیم اسمٰعیل سے کر دیں تاکہ ان کے نواسے اور نواسیاں تکلیف میں نہ رہیں۔ حکیم صاحب اور مساۃ ام سلمہ کی عمر میں بڑا تفاوت تھا اس لئے مولوی مظہر حسین کو تردد تھا۔ مگر والدہ مرحومہ کا یہ کہنا کہ اگر تم نے میرا کہنا نہیں مانا تو میں تمہارا دودھ نہیں بخشوں گی بہت بڑی وارننگ تھی۔ لہذا یہ نکاح ہو کر رہا۔ اسی طرح جب ان ہی قطبی بیگم کی لڑکی امت ایمان کا جن کی شادی مولوی محمد صاحب رام پوری سے ہوئی تھی عین عالم جوانی میں انتقال ہو گیا تو پھر ان کے حکم پر مولوی مظہر حسین کی دوسری بیٹی ام کلثوم کی شادی مولوی محمد صاحب سے کی گئی۔ اور یہاں بھی اسی قسم کا مسئلہ درپیش تھا۔

الٰہی بیگم نے جوانی ہی میں حوادث کا مقابلہ ہنسی خوشی کرنا سیکھا تھا۔ لہذا وہ بڑی سے بڑی افتاد سے نہیں گھبراتی تھیں۔ جس وقت ان کے بڑے بیٹے فخر العلما حضرت مولانا فخر الحسن کا وصال ہوا تو ان کے نواسے حکیم محمد سعید کے نکاح کی تیاریاں تھیں جب حضرت والا کے انتقال کی خبر کانپور سے گنگوہ پہنچی تو خاندانی روایات کے مطابق سارے شہر میں کہرام مچ گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ شادی ملتوی کر دی جائے۔ مگر واہ رے الٰہی بیگم کا حوصلہ کہ بڑے بیٹے کے انتقال کا صدمہ بھی ہے اور اولاد کے ساتھ محبت کا اندازہ متذکرہ بالا سطور سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود فرمایا کہ جو ہونا تھا ہو کر رہا اب شادی کو ملتوی کرنے سے فائدہ۔ چنانچہ شادی وقت مقررہ پر ہوئی مگر بشریت کے اپنے تقاضے تھے اس لئے اس میں وہ دھوم دھام نہ ہو سکی جس کا یہ موقعہ تھا۔ ان کی ہمت اور بہادری کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک آزادی کے رکن رکین حضرت شاہ حسن عسکری کی یہ بڑی بیٹی ہمت و استقلال صبر و شکر، جرأت و جوش کا ایک ایسا پیکر تھیں جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اور ان کے بڑے فرزند حضرت فخر العلماء نے اپنی مختصر مگر بھرپور زندگی میں ملک و ملت اور دین اسلام کی جو خدمت کی ان کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

گنگوہ کی تاریخی حیثیت

حضرت فخر العلماء کی گنگوہ واپسی ہر چند ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے باعث تھی لیکن جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے آپ کی دادی حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی درگاہ کے متولی اور سجادہ نشین حضرت شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی تھیں اس لئے دہلی سے گنگوہ منتقل خلاف توقع نہیں تھی۔ گنگوہ کا تاریخی قصبہ جو ضلع سہارنپور میں ضلع کے صدر مقام سے ۲۶ میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی شاہ آباد (مشرقی پنجاب) سے گنگوہ منتقل ہونے کے بعد برصغیر کا ایک اہم علمی اور روحانی مرکز بن چکا تھا۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی دراصل ردولی کے رہنے والے تھے لیکن آپ نے ۸۹۶ھ میں ردولی سے ہجرت فرما کر شاہ آباد ضلع کرنال کو اپنا مستقر بنایا۔ جہاں آپ سینتیس سال قیام فرما رہے۔ اس کے بعد آپ وہاں سے گنگوہ منتقل ہو گئے اور سلطان ابراہیم لودھی کی شکست سے ایک سال قبل یعنی ۱۵۲۴ء میں وہاں قیام پذیر ہو چکے تھے حضرت شیخ کا جس مقام پر اب روضہ ہے اس زمانہ میں وہ جگہ دریائے جمنا کی گذرگاہ تھی لیکن دریائے جمنا حضرت شیخ کے حکم پر وہاں سے تین میل دور ہٹ گئی اور اب سرائے پیرزادگان سے تین میل ہی کے فاصلے پر بہتی ہے۔ حضرت دالالکے جو مرید آپ کو شاہ آباد سے گنگوہ لائے تھے انہوں نے آپ کو نہایت عزت واحترام سے اپنے یہاں ٹھہرایا اور گنگوہ کا یہ محلہ جو اس زمانہ میں شہر کے قریب آباد تھا اور سرائے کہلاتا تھا اب سرائے پیرزادگان کے نام سے مشہور ہے اور اس میں زیادہ تر حضرت شیخ کی اولاد آباد ہے اسی محلہ میں مگر کسی قدر فاصلہ پر حضرت شیخ کی اولاد میں سے مگر حضرت نظام الدین بلخی تھانیسری کے خلیفہ اجل حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی کا مزار پر انوار بھی ہے جن کے مشہور خلیفہ شاہ محب اللہ الہ آبادی کے سلسلہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پیرادر دادا پیر بیعت تھے۔ جناب محمد اسمٰعیل انصاری نے جو خود گنگوہ شریف کے رہنے والے ہیں۔ اور جن کا خاندان حضرت فخر العلماء کے عقیدت مندوں میں شمار کیا جاتا ہے لکھا ہے کہ "مجھے اتنا معلوم ہے کہ گنگوہ ایک قدیم اور پرانی بستی ہے بچپن سے سنتا چلا آیا ہوں کہ قدیم زمانہ میں یہاں کسی ہندو راجہ گنگ کی حکمرانی تھی۔ اس زمانہ میں ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جنھیں اس زمانہ میں سلطنتیں کہا جاتا تھا بٹا ہوا تھا۔ اب کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان حملہ آور ہوئے یا تبلیغ کے لئے آئے جن کی مزاحمت کی گئی اور قتال بھی ہوا۔ اس اطلاع کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قصبہ (گنگوہ) سے باہر ایک میل کے فاصلہ پر سات قبریں ہیں، جو ہفت شہید کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ قبریں آجکل کی قبور سے زیادہ دراز اور لمبی ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں لوگ زیادہ قوی، زیادہ لمبے اور زیادہ قوی الجثہ ہوتے تھے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہاب الدین غوری کے زمانہ میں آئے کیونکہ اس سے پہلے کسی مسلمان فاتح کی اس طرف آنے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی اور کسی جدال میں یہ لوگ شہید ہوئے تھے۔ قصبہ کے وسط میں ایک علاقہ کوٹ کہلاتا ہے جو قصبہ کی سطح سے تقریباً ۷۰، ۸۰ فٹ بلند ہے۔ یہ آبادی خالصتاً ہندو آبادی ہے۔ اور اسی جگہ گنگوہ کی جامع مسجد ہے۔ بلندی کی وجہ سے مسجد کا کنواں اتنا گہرا ہے کہ پانی دیکھنے سے تارے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقہ میں راجہ گنگ کے قلعے اور محلات تھے، جو کسی بزرگ کی بددعا سے الٹ دیئے گئے۔ محلات کا ہونا غیر یقینی نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس علاقہ کے نشیبی حصہ میں اب جو مکانات تھے ان میں پرانی تعمیرات کے آثار اور نشانات بالکل نمایاں تھے۔ اگرچہ اب تک کوئی ایسے آثار نہیں ملے جنھیں آثار الصنادید کہا جا سکے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس حصہ میں خاص تعمیرات ہو سکتی ہیں وہاں پر مزید تعمیرات بن چکی ہیں۔ اور کسی شخص نے اس عنوان پر نہ تحقیق کی اور نہ کھدائی وغیرہ ہوئی۔ البتہ بالکل وسط میں ایک بزرگ کا مزار ہے جسے شاہ تلک کا مزار کہا جاتا ہے اس مزار کے بالکل متصل تقریباً ایک دو گز کے فاصلہ پر ہندوؤں کی عالیشان عمارات کھڑی ہو گئی ہیں۔

اور اسی جگہ کسی زمانہ میں پولیس اسٹیشن تھا جو اب پولیس چوکی میں تبدیل ہوگیا ہے کیونکہ پولیس اسٹیشن کی نئی تعمیر قصبہ سے باہر ہو چکی ہے۔ شاہ تمک کا تذکرہ بالا مزار ہند و عمارات اور سرکاری اردو اسکول کے درمیان واقع ہے۔

گنگوہ کی تاریخی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس کی اہمیت کی اصل وجہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا قیام گنگوہ ہے جس کے باعث یہ سرزمین اولیائے کبار کے لئے مقدس اور شایان اسلام کے لئے محترم بن گئی۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی تاریخی سوانح " تذکرۃ الرشید " میں لکھا ہے کہ "دسویں صدی ہجری میں عالم کے دماغ معطر کرنے والا شاداب پھول یعنی شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس سرہ کا وجود باجود ارض ہندوستان کے لئے مایہ ناز اور نسل نعمانی و ذریت بو حنیفہ کوفی میں وہ آفتاب ہدایت تھا جس نے دنیا میں چھائی ہوئی ظلمت و تاریکی پر نور عرفان و ضیائے ایقان کی چمکدار شعاعیں ڈالیں اور دل آویز مہک سے عالم کے دل موہ لئے" حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے بعد جس عظیم شخصیت نے گنگوہ کی شہرت وعظمت میں چار چاند لگائے وہ حضرت فخر العلماء کے پیر و مرشد اور استاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی دل آویز شخصیت تھی۔ جو خاندانی اعتبار سے بھی حضرت فخر العلماءؒ کے ہم جد تھے کہ دونوں ہی انصاری الانسل اور حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے جب معرفت اور شریعت کے علوم سے دنیا کو منور کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کی نگاہ انتخاب اسی قدوسی خانقاہ پر پڑی جہاں حضرت فخر العلماء کے والد اور دادا مدفون ہیں اور جہاں سے فرنگیوں نے حضرت فخر العلماء کے حقیقی نانا اور جنگ آزادی کے ہیرو شاہ حسن عسکری شہید کو گرفتار کیا تھا حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید مطبوعہ محبوب المطابع دہلی کے صفحہ ۱۵ پر کیا خوب کہا ہے ، کہ " شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۳ جمادی الآخر ۹۴۵ھ میں وصال پایا اور اس عالم سے جسمانی انقطاع فرمایا۔ اور تیرہویں صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان اولیاء کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نونہال نے اپنے وجود مسعود سے خانہ عالم معمور کیا اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خانقاہ اپنے شیخ کے سچے جانشین کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال اور ویران پڑی تھی۔" حضرت مولانا رشید احمد کے وجود بابرکت نے گنگوہ کو ایک نئی تازگی اور خانقاہ قدوسیہ کو ایک نئی زندگی بخشی اور گنگوہ تین سو سال کے بعد پھر دنیائے اسلام کا ایک اہم دینی اور علمی مرکز بن گیا۔ حضرت فخر العلماء اس تاریخی اور اہم دینی اور علمی مرکز کے وہ سپوت ہیں جن پر شیخ عبد القدوس گنگوہی کی خانقاہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی شفقت و محبت بجا طور پر ناز کر سکتی ہے بلکہ حضرت فخر العلماء کی یہ ایک اہم خصوصیت بھی ہے کہ جہاں وہ انصاری الانسل ہونے پر فخر کر سکتے ہیں وہاں انہیں یہ فخر بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی دادی حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی اولاد میں تھیں۔ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے بعد جس شخصیت کے نام سے گنگوہ کی عظمت میں اضافہ ہوا وہ یہی حضرت فخر العلماء کی شخصیت ہے جو دنیائے اسلام میں حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

حضرت فخر العلماء گنگوہ میں

حضرت فخر العلماء اپنے والد اور والدہ کے ہمراہ جب گنگوہ تشریف لائے تو عیش و عشرت کی بجائے تنگی اور تنگدستی کا دور دورہ تھا۔ دہلی سے گنگوہ کا سفر، بھیس بدل کر مسافت طے کرنا۔ آزادی کی جد وجہد میں جس کا شاہدہ اپنی آنکھوں سے انہوں نے دیکھا جس میں ان کے نانا نے بیش از بیش حصہ لیا تھا۔ دہلی کی تباہی، فرنگیوں کی فتح، یہ وہ سارے نظارے تھے جو ان کے سامنے سے گزرے پھر وہ اس آتش سیال سے گزر کر گنگوہ کے نسبتاً پرسکون ماحول میں داخل ہوئے ان کے والد جو خطیب عالم حضرت شیخ عبد القدوس کے سجادہ شاہ عماد الاسلام کے حقیقی نواسے تھے یار تھے

ایک والدہ کا دم تھا جو حوصلہ اور ہمت کا مینار تھیں۔ لیکن جیسا کہ ہر دور میں ہوتا ہے۔ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ مسلمانوں کو اگر اس دور میں آسرا تھا تو وہ صرف خدا کی ذات سے تھا۔ لہٰذا ہر شخص اللہ سے رجوع کر رہا تھا۔ پھر حضرت فخر العلماء کا خاندان تو اہل اللہ کا خاندان تھا لہٰذا جب حضرت کی تعلیم و تربیت کو پھر جاری کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا جو اسی افراتفری کے باعث چھ مہینوں معطل ہی تھی تو یہی فیصلہ ہوا کہ دینی تعلیم کا جو سلسلہ دہلی میں جاری تھا اسے از سر نو شروع کیا جائے۔ والدہ ماجدہ نے ہیرے کی انگشتری بیچ کر جو رقم حاصل کی تھی اسی سے سرائے پیرزادگان میں ایک مکان خرید لیا گیا تاکہ سر چھپانے کی جگہ تو میسر ہو اور بیمار شوہر کی تیمارداری کی جائے۔

حفظ قرآن پاک کی سعادت

حضرت والا کے والدین کو سب سے پہلے تو اسی بات کی فکر ہوئی کہ انہیں کلام پاک حفظ کیا جائے جیسا کہ حضرت قاسم العلوم کے کانووکیشن ایڈریس میں ذکر ہو چکا ہے مسلمانوں میں خواہ وہ طبقہ امراء میں ہوں یا طبقہ متوسط میں علوم دینیہ کا شغل بالکل نہیں تھا۔ اور یہی حال گنگوہ کا تھا۔ اگرچہ اس قصبہ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس سرزمین میں قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی ابدی استراحت فرما رہے تھے۔ آپ کا مزار اور خانقاہ سرائے پیرزادگان میں واقع تھے اور حضرت والا کی اولاد یہاں بہت بڑی تعداد میں شاد و آباد تھی اور آپ ہی کے مزار اور خانقاہ سے تھوڑے فاصلہ پر محلہ سرائے پیرزادگان ہی میں آپ کے پوتے اور حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری بلخی کا مزار بھی تھا لیکن یہاں بھی اور حضرت قطب عالم کی اولاد میں علم کا ذوق و شوق نہیں تھا۔ حضرت فخر العلماء اگرچہ براہ راست قطب عالم کی اولاد میں نہیں تھے مگر ان کی دادی حضرت شیخ کی اولاد میں تھیں رحمہ اللہ دینی علوم کی طرف مائل تھے اور حضرت والا کے والد ماجد شاہ عبدالرحمٰن جو براہ راست حضرت شاہ عمادالاسلام کے نواسے تھے اپنے فرزند کی اس طبعی اور فطری میلان سے خوش تھے اس لئے انہوں نے حضرت فخر العلماء کو دینی علوم کی تعلیم کی راہ پر لگا دیا اور خوش قسمتی سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ذات گرامی جو کہ اس وقت تک جیل کی صعوبتوں کو چھ ماہ تک برداشت کرنے کے بعد آزاد ہو کر گنگوہ میں طالبان دین حق اور خادمان اہل حق کے متلاشیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی اور جن سے تعلق خاطر بھی تھا اس لئے حضرت فخر العلماء ان کی خدمت میں علوم دینیہ کے حصول کے لئے حاضر خدمت ہو گئے لیکن اس زمانہ میں گنگوہ میں حفاظ کی بڑی کمی تھی اس لئے قرآن پڑھانے کیلئے حفاظ بڑی مشکل سے ہاتھ آتے تھے۔ لہٰذا والدین کی رضامندی اور اجازت سے حفظ قرآن کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا اور حضرت فخر العلماء نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت سے قرآن پاک حفظ کر کے محراب سنانا شروع کر دی مگر حضرت والا کی عمر شریف بہت زیادہ نہیں تھی اس لئے کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا مگر ان کی خوش الحانی اور قرآن پاک کو نہایت صاف صاف الفاظ اور روانی کے ساتھ سنانے کی وجہ سے قصبہ کے لوگ انہیں بہت چاہتے تھے۔

حضرت گنگوہی کی شاگردی

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ حضرت فخر العلماء نے انہی ایام میں حضرت مولانا رشید احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ خاندانی روایات میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۷ء میں دیوبند جانے سے پہلے آپ نے گنگوہ میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے پڑھا۔ آپ نے اس زمانہ میں حضرت گنگوہی سے کیا تعلیم حاصل کی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر چونکہ گنگوہ میں حضرت فخر العلماء کی آمد کے بعد جو ۱۸۵۷ء کے آواخر یا ۱۸۵۸ء کے اوائل میں ہوئی اور ان کی دیوبند روانگی جو ۱۸۶۷ء میں ہوئی کے درمیان کافی وقفہ ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے حدیث کی کتابیں

یقیناً پڑھ لی ہوں گی اور اگر پورا دورہ مکمل نہ کیا ہوگا تو دو چار اہم کتابوں کا مطالعہ تو ضرور حضرت گنگوہی کی خدمت میں رہ کر کیا ہوگا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی حصہ اول کے صفحہ ۴۷ میں حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں کے ذکر کے تحت حضرت فخر العلماء کا جو ذکر کیا ہے اس کے الفاظ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت والا نے مدرسہ دیوبند میں داخلہ سے قبل حضرت گنگوہی کی شاگردی کی تھی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ دوسرے مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی ہیں۔ وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں۔ عمدہ استعداد ہے۔ انہوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے۔ اور اول جناب مولوی رشید احمد سے تحصیل کی تھی" ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت فخر العلماء نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے مکمل طور پر تحصیل علم کی تھی۔ خود تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف کی جلد اول میں جو حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سوانح حیات ہے۔ یہ تحریر فرمایا کہ "حافظ امیر حسین گنگوہی، مولوی مومن علی گنگوہی، مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی، پیر جی عبد الرزاق گنگوہی، مولوی نذیر احمد انبیٹھوی، مولوی اللہ رکھے انبیٹھوی، مولوی عبد الرحمٰن کرنالی، مولانا نفع محمد تھانوی، مولانا محمود حسن سادھوڑوی، اور مولوی امیر حسن انبیٹھوی کو بھی حضرت سے تلمذ حاصل ہے (صفحہ ۱۹۷)

حضرت گنگوہی کا درس اور اس کی نوعیت

حضرت گنگوہی نے بقول مولانا عاشق علی میرٹھی ۱۸۴۹ء کے لگ بھگ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو کم از کم انچاس پچاس سال یعنی ۱۸۹۷ء تک جاری رہا ان کے الفاظ یہ ہیں "دینی تعلیم و تدریس کا سلسلہ امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) کے گھر بار دربار میں اسی وقت شروع ہو گیا تھا جبکہ آپ دہلی سے فارغ التحصیل ہو کر گنگوہ پہنچے تھے اور سب سے اول مولوی سید مومن علی گنگوہی کو (جن کا ذکر حضرت فخر العلماء کے ساتھ اوپر مذکور ہو چکا ہے) شرح جامی کا سبق شروع کر دیا۔ اس زمانہ یعنی ۱۲۶۵ھ سے لے کر ۱۳۱۴ھ تک جس کی مدت دو قمری حساب سے) ایک کم پچاس سال ہوتی ہے آپ کے پاس اور اس دور کے طالب علم آتے رہے حضرت مولانا عاشق علی صاحب میرٹھی نے اپنی اس تصنیف میں آگے چل کر فرمایا کہ اس مدت میں حضرت گنگوہی نے تین سو سے زیادہ طلبہ کو عالم بنایا اور پھر ان ہی سے چند مشاہیر حضرات کے نام گنائے ہیں ان ناموں میں صفحہ ۱۹۷ پر حضرت فخر العلماء کا نام نامی ۲۵ نمبر پر ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا میرٹھی نے جو الفاظ ارقام فرمائے وہ یہ ہیں "حق تعالیٰ نے محدث گنگوہی قدس سرہ کو چونکہ جامع بین الشریعت و الطریقت امام بنا کر دنیا میں بھیجا تھا اس لئے دین کے دونوں پہلو آپ کی ــــ وہ صفات ذات سے ترقی پذیر اور بارونق بنے۔ آپ نے مشکاۃ نبوت سے دونوں رو[شن] [د]نیا [کو] اس درجہ حاصل کیں جو ہندوستان کے وسیع ملک کو چمکا دینے کے لئے کافی ہو گئیں اور از[اں بعد] [مد]ت کی صدیوں تک اپنی چمک دمک سے ظلمت و جہالت میں پڑی ہوئی مخلوق کو نور کی طرف [لانے] [کا] کام دیتی رہیں گی۔ آپ نے تین سو سے زیادہ طلبہ کو عالم بنایا جن میں بہتیرے حضرات متفرق بلاد میں پھیلے ہوئے ترویج دین اور تدریس علم میں آج تک مشغول ہیں۔" مگر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے خود اپنے شاگردوں کی تعداد دو سو سے زیادہ بتائی ہے۔ آپ نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کو ۱۳۰۶ھ میں جو خط لکھا اس میں یہی تعداد بتائی ہے ممکن ہے کہ بعد میں شاگردوں کی تعداد اتنی ہی ہو گئی ہو جتنی مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اندازہ کیا ہے۔ حضرت گنگوہی نے یہ انکشاف حضرت حاجی صاحب کے استفسار پر کیا تھا۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ حضور نے جو بندہ نالائق سے استفسار فرمایا ہے۔ میرے ماورائے وارین اس ناقص کے کیا حالات اور کس درجہ کی کوئی خوبی ہے جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں۔

بخدا سخت شرمندہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوں مگر جو ارشاد خدمت ہے تو کیا کروں بناچاری کچھ لکھنا پڑتا ہے حضرت مرشدمن علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا ہے۔ دس سال تک دوسو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ اور کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جائے۔ اور حضرت کے اقدام نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خلاصہ ہے کہ حذر قلب میں غیر اللہ سے نفع وضرر کا التفات نہیں" (مکتوبات رشیدیہ۔ صفحہ ۱۰)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے آپ کے طرز تعلیم کے ذکر میں فرمایا کہ "آپ کے تدریس میں ایسا محویت کا عالم ہوتا کہ بے اختیار دل یہ خواہش کرتا کہ کاش تقریر کا سلسلہ دیر تک ختم نہ ہو۔ حضرت کی تقریر ایسی سلیس وعام فہم ہوتی کہ پاس بیٹھے ہوئے عامی لوگوں کو بھی حرفاً حرفاً سمجھ میں آتی اور دل کے کواڑ کھولے چلی جاتی"۔ "آپ کی تقریر میں یہ کرامت ہوتی کہ وسیع تقریر اور بلیغ تحقیق کی طرف دیکھا جاتا تو خیال ہوتا تھا کہ سبق بہت کم ہوا لیکن اوراق وصفحات شمار کئے جائیں تو حیرت ہوتی تھی کہ اس قدر سبق کیونکر ہو گیا"۔ "حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) صحاح میں سب سے پہلے عموماً ترمذی شروع کراتے تھے اور وہ طلبہ کی تحقیق کے ساتھ واضح تقریر میں فرما کر طلبہ کے ذہن نشین کر دیا کرتے تھے۔ ہر ہر حدیث کا ترجمہ اور معانی سلیس اور عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے اور نفس مطلب کو ایسا کھول دیا کرتے تھے کہ گویا پوست اور چھلکے سے مغز اور گودے کو نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد احادیث کا باہم یا حدیث کا کسی آیت قرآن سے تعارض ہوتا تو اس کو رفع فرماتے اور مطابقت اور موافقت ظاہر فرماتے تھے بقدر ضرورت اسماء الرجال ذکر فرماتے روایت کی تحقیق اور توثیق وتفصیل کرتے تھے۔ اسناد میں ضروری جرح و بحث فرماتے اور اس کے بعد حدیث کی بات سے مناسبت بیان کرتے تھے۔ باہم عبارت اور سیاق وسباق میں ارتباط مخفی ہوتا تو اس کو کھولتے اور ایک مضمون کا دوسرے مضمون سے ربط دیتے جاتے۔ اگر کوئی حدیث دیگر کتب کی کسی حدیث سے متعارض ہوتی تو ان کی بھی تطبیق کرتے۔ اصول حدیث اور اصول فقہ کے نکات اور عبارت کے اشارات بھی بیان فرماتے تھے اور مشکل مقامات کو تنبیہ کر کے کئی کئی بار بیان فرماتے۔ اور اس پر بھی اگر طلبہ مکرر پوچھتے یا بے جا سوال اور اپنی غلطی پر ناحق اصرار کرتے تو ہرگز چیں بہ چیں نہ ہوتے (صفحہ ۸۹-۹۰)" ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کے درس میں حدیث کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا۔ صرف جو حدیث نئی ہو یا مولف کی عبارت آتی ہو اس کی توضیح مثل بیان گذشتہ فرماتے اور باقی حدیثوں کی قراءت پر اکتفا فرماتے" (صفحہ ۹۰) مولانا عاشق الٰہی آگے تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت امام ربانی قدس سرہ کا درس کچھ عجیب ہی درس تھا۔ ہمیشہ طلبہ کی استعداد کے مطابق کلام کرتے اور ہر شاگرد کی قابلیت اور سمجھ کے انداز پر گفتگو فرماتے"۔ "دورہ حدیث کے علاوہ تفسیر وفقہ اور اصول فقہ اور اصول احادیث کا بھی درس جاری تھا۔ گو آخر میں طبعی مناسبت کے تحت تحدیث ہی پر اکتفا کیا تھا مگر ابتداء میں جملہ علوم دینیہ کو رغبت وشوق کے ساتھ پڑھاتے تھے"۔ "حضرت امام ربانی آنے والے طلبہ میں اہلیت وصلاحیت کا بھی بہت زیادہ خیال رکھتے۔ اور جن مہمانان رسول میں طلب صادق اور قابلیت وسعادت مندی پاتے ان کو اپنا عزیز رشتہ دار سمجھ کر تا لبدار رضا بنا کر رکھتے۔ کتابیں دیتے۔ حجرہ یا دوسری جائے قیام بناتے، کھانے کا انتظام فرماتے اور جب تک وہ آپ کی خدمت میں پڑھتا رہتا برابر اس کی خبر گیری رکھتے"۔ ظاہر ہے کہ ایسے مراحب حال بزرگ سے اپنی زندگی کے ان ایام میں جسے نوجوانی کا زمانہ کہنا چاہیئے۔ حضرت فخر العلماء نے اکتساب علم کیا یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا مگر استاد اور شاگرد کا یہ تعلق صرف اسی زمانہ تک محدود نہ رہا بلکہ

اس کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھا۔ اور کیوں نہ ہو جب حضرت گنگوہی کے درس میں تعلیم و تعلم کے ساتھ تزکیۂ روحانی کا بندوبست بھی تھا۔ حضرت فخر العلماء نے حضرت گنگوہی کے درس کی اس خصوصیت کا ذکر اپنی ایک مجلس میں کیا جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بھی تھے۔ یہ غالباً کانپور کی بات ہے۔ جہاں یہ دونوں حضرات گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں باہم یکجا تھے۔ حضرت تھانوی کی زبانی حضرت فخر العلماء کی اس روایت کو سنیے یہ روایت اس حدیث شریف سے متعلق ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ "مجھے یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ جب یہ حدیث حضرت گنگوہی کے درس میں آئی تو طلبہ نے اپنے اشکال بیان کیے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ "میں نے اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت سنائی جو مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے بیان کی تھی، کہ جب بخاری (شریف) کے درس میں یہ حدیث آئی تو شاگردوں نے یہ اشکال پیش کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت یونس علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام سے یقیناً افضل تھے۔ پھر آپ نے اس کی نفی کیوں فرمائی۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ یہی تو افضل ہونے کی دلیل ہے۔ جو افضل ہوتے ہیں وہ یہی کہا کرتے ہیں کہ میں افضل نہیں۔ شاگردوں نے پھر اشکال کیا۔ حضرت مولانا نے پھر سمجھایا۔ لیکن طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر مولانا نے دوسری قوت سے کام لینا چاہا۔ فرمایا۔ اچھا میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ اپنے سے افضل یا کمتر۔ سب نے عرض کیا کہ حضرت چہ نسبت خاک را با عالم پاک ہماری حقیقت ہی کیا ہے، حضرت کے سامنے۔ پھر فرمایا کہ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔ عرض کیا بالکل سچا۔ پھر فرمایا کہ اگر میں کسی بات کی قسم کھا کر کہوں۔ پھر تم مجھے سچا سمجھو گے یا نہیں۔ کہا کہ تب تو اور بھی زیادہ آپ کی بات کا یقین کریں گے۔ جب ان سب باتوں کا اقرار کرا چکے تو فرمایا کہ تو اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میں سے ہر ہر شخص کو میں اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں۔ بس یہ فرمانا تھا کہ ساری مجلس تڑپ گئی۔ سب بے تاب ہو گئے۔ لوٹنے لگے۔ اور مولانا چپکے سے اٹھ کر حجرے میں جا بیٹھے۔ درس وغیرہ ختم ہو گیا۔ اگلے دن جب پھر سبق شروع ہوا تو فرمایا کہ کہو بھئی اب بھی اس حدیث میں کچھ شبہ ہے۔ سب نے بالاتفاق عرض کیا کہ حضرت اب تو کوئی شبہ نہیں رہا۔" اس حکایت کو بیان کرنے کے بعد پھر حکیم الامت (مولانا تھانوی) نے فرمایا کہ حضرت گنگوہی نے یہ تصرف کے مقصد سے نہیں کیا۔ ہمارے حضرات اس کا قصد نہیں کرتے تھے۔ مگر ہر شے میں ایک خاصیت ہے صدق میں بھی خاصیت ہے کہ از دل خیزد بر دل ریزد (یہ واقعہ خدام الدین لاہور سے پیش کیا گیا)

حضرت گنگوہی سے تعلق خاطر

جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے حضرت فخر العلماء کو حضرت گنگوہی سے بڑا گہرا تعلق خاطر تھا۔ جو حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد اور بھی گہرا ہو گیا جب آپ نے حضرت گنگوہی سے تجدید بیعت کی۔ اس بات کا تفصیلی تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔ لیکن جیسا کہ اپنی جگہ پر ذکر کیا گیا استاد اور شاگرد کے درمیان قرابت قریبہ کا سلسلہ بھی تھا اور وہ اس طرح کہ آپ کے چھوٹے بھائی کا عقد حضرت گنگوہی کی سگی ماموں زاد بہن سے ہوا۔ مگر جس طرح کہ شاگرد کو استاد سے عقیدت و محبت تھی۔ اسی طرح استاد کو بھی شاگرد سے پیار تھا۔ اور اس کا اظہار اکثر ان خطوں میں ہوا ہے جو آپ نے اپنے مخصوص خلیفہ اور حضرت فخر العلماء کے سگے خالہ زاد بھائی حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کو تحریر فرمائے ہیں اور جو اکثر مکتوبات رشیدیہ میں طبع ہو چکے ہیں۔ حضرت گنگوہی نے حضرت فخر العلماء کا ذکر ان خطوں میں بھی کیا ہے۔ جو انہوں نے مفتی
۸ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یاسین مدرس دارالعلوم دیوبند کو تحریر فرمائے اور "میرے والد ماجد اور ان کے محبوب عملیات" کے عنوان سے مولانا مفتی محمد شفیع نے جو کتاب شائع فرمائی ہے اس کے صفحہ ۲۵ پر حضرت گنگوہی کا ایک خط جو مولانا محمد یاسین کے نام ہے شائع ہوا ہے۔ اس خط میں تحریر ہے کہ "مولوی محمود حسین صاحب کو بعد اسلام کہہ دیں کہ کتاب کے بارہ نسخے مولوی

فخر الحسن صاحب کے پاس فوراً سہارنپور روانہ فرمادیں۔ اور پھر تاکید سے لکھ دیں کہ بہت جلد گنگوہ پہنچا دیویں۔" ان الفاظ سے جو محبت اور اعتماد جھلک رہا ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ حضرت گنگوہی کو اس حادثہ کا بھی بہت غم تھا جس کے باعث حضرت فخر العلماء نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گنگوہ کو خیرباد کہدیا۔ اور جب حضرت فخر العلماء کی وفات کے بعد ان کے دونوں صاحبزادے حافظ نور الحسن گنگوہی اور حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی اپنی بیویوں کے ہمراہ اپنی دادی اور چچا سے ملنے کے لئے کانپور سے گنگوہ گئے۔ اور ان دونوں صاحبزادوں نے حضرت گنگوہی سے عرض کیا کہ وہ ان کی شریک حیات کو بیعت فرمالیں، تو حضرت گنگوہی نے بلاعذر یہ درخواست قبول فرمالی۔ اور حضرت مولانا حافظ نور الحسن گنگوہی، اور حضرت مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی کی اہلیہ حضرت گنگوہی سے بیعت ہوئیں۔ حضرت گنگوہی کے اہل خاندان کو بھی حضرت فخر العلماء کی علمیت اور قابلیت کا بڑا احساس تھا۔ چنانچہ جب جناب حسن راشد ابن شاہ ظریف حسین گنگوہی نے حضرت گنگوہی کے پوتے حضرت عبدالرشید محمود سے حضرت فخر العلماء کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ" انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس طرح جب جناب حسن راشد نے ان سے سوال کیا کہ حضرت مولانا فخر الحسن زیادہ بڑے حکیم تھے یا زیادہ بڑے عالم تھے تو انہوں نے جواب دیا کہ حضرت فخر العلماء کو" حکمت سے زیادہ علمیت میں دخل تھا"

دارالعلوم دیوبند سے وابستگی

حضرت گنگوہی کی خدمت میں اکتساب علم کا سلسلہ جاری تھا جس میں اس مدت کے دوران جب آپ حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین کے ہمراہ حج پر تشریف لے گئے یعنی ۱۲۸۰ھ سے لے کر ۱۲۸۲ھ تک فخر العلماء حضرت گنگوہی سے علوم دینی کا درس حاصل کرتے رہے۔ لیکن اگلے سال یعنی محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں جب مدرسہ دیوبند کا باقاعدہ آغاز ہوا تو آپ اپنے استاد اور اپنی والدہ محترمہ سے اجازت لیکر دیوبند پہنچے۔ آپ کی والدہ ماجدہ جو آپ کے والد کے انتقال کے بعد اپنے تمام بچوں کی تعلیم وتربیت اور نگہداشت کی نگراں تھیں۔ اپنے بڑے صاحبزادے کو اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن جب انہوں نے فخر العلماء کے طلب علم کے جذبہ کو دیکھا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی رضامندی پائی تو پھر حضرت والا کو دیوبند روانہ کرنے اور حصول علم کے جذبہ اعلیٰ کی تسکین کی خاطر انہیں اپنے سے الگ کرنے پر رضامند ہوگئیں۔ یہ بھی الٰہی بیگم کی زندگی میں بڑی کڑی آزمائش کا مرحلہ تھا لیکن ان کے بے مثال جذبہ ایثار نے اُن کی مامتا پر غلبہ حاصل کرکے نور نظر کو اپنے سے جدا کرنے پر راضی کرلیا اگرچہ گھر کے مالی حالات اور بے دلی اور بے مرہبی خاندان کی ذمہ داریاں اس بات کی متقاضی تھیں کہ بڑا بیٹا جو مرحوم باپ کا قائمقام ہوتا ہے اسے اپنے پاس ہی رکھا جائے۔ مگر آفریں ہے شاہ حسن عسکری شہید کی بیٹی اور شاہ عبدالرحمٰن کی بیوہ پر کہ اس نے اپنے بڑے بیٹے کے جذبہ علم اور جوش جہاد کی قدر کی اور اسے اپنے سے جدا ہوکر دارالعلوم دیوبند کے سابقون الاولون کی صف میں شامل ہونے کی اجازت دیکر انہیں (حضرت فخر العلماء) دیوبند کے پہنچنے میں شامل کرنیکی عزت بخشی۔

دارالعلوم دیوبند میں گنگوہ کا پہلا متعلم

خاندانی روایات کے مطابق حضرت فخر العلماء مدرسہ دیوبند کے قیام کے فوراً بعد ہی حضرت گنگوہی کے ایماء اور اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت سے مدرسہ دیوبند میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔ وہ اس مقدس ومتبرک تعلیمی ادارے میں گنگوہ کے پہلے طالب علم تھے دیوبند کے ابتدائی سالوں کی رپورٹ اگر مطالعہ میں آتیں تو پتہ چلتا کہ حضرت فخر العلماء نے کب داخلہ لیا مگر یہاں بھی امنوعین دیوبندی نے اپنی مشہور تصنیف حیات شیخ الہند کے صفحہ ۱۶۷ پر حضرت فخر العلماء کو حضرت شیخ الہند کا پہلا ہم سبق

بتایا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت فخر العلماء اول سال ہی سے مدرسہ دیوبند میں حضرت شیخ الہند کے ہم سبق تھے۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے قاسم العلوم ترجمہ انوار العلوم کے صفحہ ۹۶ پر لکھا ہے کہ "دارالعلوم کا افتتاح سنہ ۱۲۸۳ھ میں ہوا اور مولانا فخر الحسن نے سنہ ۱۲۸۹ھ میں دارالعلوم سے علوم معقولات و منقولات کی تکمیل کی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آغاز دارالعلوم میں آکر داخل ہوئے۔ آپ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کے ہم سبق تھے۔" ان کا نام حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے شاگردوں میں بھی شامل ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ دیوبند از جناب محبوب علی رضوی۔ صفحہ ۴۱ حیات یعقوب و مملوک صفحہ ۴۷) دارالعلوم کے تیسرے سال کی رپورٹ میں جو فتاوی دارالعلوم کی جلد اول میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بطور تمہید شائع فرمائی ہے اور جس کا ذکر اپنے مقام پر ہو چکا ہے یہ درج ہے کہ اس سال حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی نے کتب حدیث ترمذی وغیرہ کا امتحان دیا۔ اسی طرح مفتی صاحب قبلہ نے سنہ ۱۸۸۹ء کی رپورٹ کے حوالہ سے سندات فضلا کے عنوان کے تحت فرمایا کہ اس سال حضرت فخر العلماء نے چھ دیگر طلبہ کے ساتھ دارالعلوم سے سند فراغ حاصل کی۔ مگر اس میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کا نام نہیں ہے۔ ان سات طلبہ کا نام اپنے مقام پر دیا جا چکا ہے اور یہ تو دارالعلوم دیوبند کی سنہ ۱۲۹۰ھ کی رپورٹ سے اور اس سال کے کانووکیشن اور حضرت قاسم العلوم کے کانووکیشن ایڈریس سے ظاہر ہے کہ اس کانووکیشن میں جن پانچ قابل فخر علماء نے دستار فضیلت حاصل کی اور جنہیں دیوبند کے پنجتن کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس میں حضرت فخر العلماء کا نام نامی شامل تھا۔ مگر ان پانچ خوش قسمت، خوش بخت اور صاحب استعداد بزرگوں میں صرف حضرت فخر العلماء اور مولانا فتح محمد تھانوی کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی اکتساب علم کیا تھا۔ اور جو بیک وقت حضرت قاسم العلوم، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے شاگرد رشید تھے۔

حضرت قاسم العلوم کی شاگردی

یہ دیوبند ہی کا قیام تھا جس میں حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کے شاگرد بنے، زیر اثر آئے اور ان کی ذاتی توجہ، محبت اور شفقت ہی نے حضرت مولانا کو فخر العلماء بنایا۔ حالانکہ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے قاسم العلوم اور ترجمہ انوار القیوم کے صفحہ ۹۰ پر ارقام فرمایا ہے کہ مولانا فخر الحسن نے سفر و حضر میں دارالعلوم دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے حدیث اور دیگر علوم کی کتابیں بھی پڑھیں۔ میرٹھ، نانوتہ اور دیوبند میں مولانا (حضرت قاسم العلوم) کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

حضرت فخر العلماء نے دہلی میں جب اپنے نانا کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی تو ان کی پاکیزگی، انکساری، دیانت اور روحانیت نے انہیں بہت متاثر کیا۔ وہ حضرت شاہ حسن عسکری کے جذبہ حریت اور حب الوطنی سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دہلی کی بربادی اور انگریزوں کے مظالم کا مطالعہ کیا اور وہ جس کے سایہ میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ہوش میں آنے کے بعد جن کو انہوں نے اپنا پیر دسمجھا۔ وہ انہیں ظالم انگریزوں کے ہاتھوں توپ کے دہانے کے منہ پر باندھ کر اڑا دیئے گئے۔ اس سانحہ نے حضرت فخر العلماء کی روح کو جھنجھوڑ دیا اور انگریزوں کے خلاف ان کے دل میں قدرتی طور پر وہ نفرت پیدا ہوئی جو حضرت شیخ الہند میں مالٹا کی اسیری کے دوران پیدا ہوئی۔ ان کے جذبہ حریت اور طلب جہاد میں ان کے نانا کے علاوہ ایک اور شخصیت کے کارناموں کی بھی جھلک ملتی ہے۔ جو انگریز دشمنی کے سبب اپنے وطن سے ہجرت کر کے گجرات چلے گئے تھے اور جن کے بارے میں خاندانی روایات کے مطابق حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں شمولیت کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ وہ شخصیت حضرت منشی حافظ علی کی ہے جو ان کے حقیقی پھوپھا اور ان کے والد ماجد شاہ

عبدالرحمن کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے وہ گنگوہ آئے تو انہوں نے اپنی والدہ ماجدہ کے جراتِ بے خوفی زمانہ کے مصائب و شدائد میں مسکرانے سے ایک نیا عزم اور حوصلہ پایا۔ والدِ ماجد جو تحریکِ آزادی میں اپنے خسر اور اپنے خالہ زاد بھائی شاہ حسن عسکری کے ہمدم و معاون تھے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد اور اس سے پیدا ہونے والے انقلابات زمانہ کی تاب نہ لاکر دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے مگر ان کی قربانیوں نے بھی حضرت مولانا فخرالحسن کی زندگی کو جو بچپن سے نوجوانی میں قدم رکھ چکے تھے ایک نئی توانائی عطا کی اور پھر سب سے بڑھ کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی صحبت بابرکت نے ان کو خود اعتمادی اور خداوند قدوس پر کمل اعتماد کے جذبہ سے سرشار کر دیا تھا۔

وہ جب اس پس منظر میں گنگوہ سے دیوبند آئے تو انہیں ذہنی طور پر حضرت قاسم العلوم کے سب سے قریب ہونا چاہیئے تھا جو جنگ شاملی کے سپرد ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی تلوار اور قلم بھی تھے اور جنہیں قدرت کو جنگ آزادی کی ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے ایک گروہ مجاہدین پیدا کرنے کا کام لینا تھا۔ حضرت فخرالعلماء جب دیوبند آئے تو وہ ہر طرح قاسم العلوم کے شاگرد بنے اور وہ تحریکِ دیوبند کے رکن رکین بننے کے اہل بھی تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے بلاوجہ سوانح قاسمی میں یہ نہیں لکھا کہ وہ (حضرت فخرالعلماء) وارفتگیٔ مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم بلکہ بڑھ کر ہیں۔ جب استاد اپنے شاگرد کے بارے میں یہ الفاظ لکھے تو یہ اندازہ لگا لینا زیادہ دشوار نہیں کہ حضرت فخرالعلماء دیوبند تحریک کے رموز و نکات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ وہ اس معاملہ میں تحریک کے محرکِ اول اور سربراہ کے قدم بہ قدم بلکہ اسے کامیاب بنانے میں ان سے بھی بڑھ کر تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں میں سے صرف یہ خصوصیت انہیں ہی حاصل ہے کہ وہ ابتدائے تحریک ہی سے اس کو کامیاب بنانے کیلئے اپنے تمام ساتھیوں کے مقابلہ میں نہایت بہتر طور پر تیار تھے۔ اور ان کی تیاری کا ذہنی و فکری پوری صلاحیتوں کے ساتھ تھی۔ ان کے استاد کو بھی ان کی ان خداداد صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ تھا۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد اول میں حضرت قاسم العلوم کے نامہ دہم کا کئی بار تذکرہ فرمایا۔ جس سے حضرت قاسم العلوم اور حضرت فخرالعلماء کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ (اب یہ مجموعہ خطوط جس میں متذکرہ بالا خط بھی شامل ہے۔ پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے قاسم العلوم۔ انوار النجوم کے نام سے شائع فرما دیا ہے)

اس خط میں دو جگہ حضرت قاسم العلوم نے جس اخلاص و محبت سے حضرت فخرالعلماء کا ذکر کیا اس سے استاد اور شاگرد کے خصوصی تعلقات کی نوعیت کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے۔ جناب مناظر احسن گیلانی متذکرہ بالا تصنیف کے صفحہ ۳۴۴ پر ارقام فرماتے ہیں کہ "اس سے بھی زیادہ دل گداز حضرت والا کا وہ فقرہ ہے جو ان ہی شاگردوں میں سے ایک شاگرد مولانا فخرالحسن گنگوہی مرحوم کے موسولہ ایک خط میں پایا جاتا ہے۔ خط کیا ہے ایک علمی موضوع پر رسالہ ہے (جس کا ذکر اپنی جگہ پر ہوگا) قاسم العلوم کے مجموعہ خطوط میں اس کا نمبر دسواں ہے۔ بہرحال اس خط کی تمہیدی عبارت ختم کرتے ہوئے اپنے شاگرد مولوی فخرالحسن صاحب کو خطاب کر کے ارقام فرمایا کہ مقصود اس مضمون کو لکھنے سے یہ ہے کہ "زیر قلم کشیدہ نزد آں عزیز [illegible] بدر دعائے یاد کنند (میری رائے یہ ہوتی کہ اس کے تمام مضامین کا جواب لکھ کر آپ [illegible]۔ شاید آپ کے دل سے میرے لئے دعا نکل جائے) اور اس کے بعد سیدنا امام الکبیر [illegible] شمامہ سے بے ساختہ یہ الفاظ بھی نکل پڑے کہ "آئے عزیز دست امید افتادہ [illegible] یارکناہ اندازم کجا برد" (اے عزیز اس عاجز کا ہاتھ پکڑنا چاہئے۔ گناہوں کے بوجھ [illegible] خدا جانے مجھے کہاں پہنچا دیا ہے)۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے آگے چل کر اس مکتوب کے حوالہ ہی سے یہ ارقام فرمایا کہ "خود سیدنا امام الکبیر نے قاسم العلوم کے اسی نامہ دہم میں جو مولانا فخرالحسن گنگوہی کے نام ہے۔ خط کے آخر میں لکھ کر کہ مدا یکے از مشتاقان دیدار شما باز [illegible]

(مجھے اپنے مشتاقان ملاقات میں سے ایک سمجھیں) اپنے قلم سے ارقام فرمایا کہ "من ندانم از طرف شما مولوی احمد حسن و مولوی محمود حسن بدلم چہ نہادہ اند اکثر ہو کشاں لبکار پر وازی شمامی کشند" (مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری اور مولوی احمد حسن اور مولوی محمود حسن کی طرف سے میرے دل میں کیا رکھ دیا ہے کہ اکثر ہوکشاں آپ لوگوں کے کام کی طرف کھنچتے ہیں۔"

حضرت قاسم العلوم کا انتقال کے بعد اپنے اصلی جسم میں تشریف لانا

حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے بعد اپنے اصلی جسم میں تشریف لانا حضرت قاسم العلوم کو حضرت فخر العلما سے جو محبت تھی وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد تھی۔ حضرت قاسم العلوم اپنے ان شاگردوں کے حالات سے رحلت فرمانے کے بعد بھی باخبر رہے اور جب آپ نے اس سلسلہ میں مداخلت کی ضرورت محسوس کی تو آپ نے مداخلت فرمائی۔ اس مداخلت کا واقعہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے حوالہ سے حکایات اولیاء کے صفحہ ۲۷۰ اور حکایت نمبر (۲۴۵) میں موجود ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں حضرت محترم مولانا حبیب الرحمن مرحوم نے فرمایا کہ مولوی احمد حسن امروہوی اور مولوی فخر الحسن گنگوہی میں باہم معاصرانہ چشمک تھی اور اس نے بعض حالات کی بناء پر ایک مخاصمت اور تنازعہ کی صورت اختیار کر لی۔ اور مولانا محمود حسن اصل جھگڑے میں شریک نہیں تھے نہ انہیں اس قسم کے امور سے دلچسپی تھی مگر صورتحال ایسی پیش آئی کہ مولانا بھی بجائے غیر جانبدار رہنے کے کسی ایک جانب جھک گئے اور یہ واقعہ کچھ طول پکڑ گیا۔ اسی دوران میں ایک دن علی الصباح بعد نماز فجر مولانا محمد رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمود حسن صاحب کو اپنے حجرے میں بلایا (جو دار العلوم دیوبند میں ہے) مولانا حاضر ہوئے اور بند حجرے کے کواڑ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ موسم سخت سردی کا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلے یہ میرا روئی کا لبادہ دیکھ لو۔ مولانا نے لبادہ دیکھا تو تر تھا۔ اور خوب بھیگ رہا تھا۔ فرمایا کہ واقعہ یہ ہے کہ ابھی ابھی مولانا نانوتوی جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے جس سے میں ایک دم پسینہ پسینہ ہو گیا اور میرا لبادہ تر بتر ہو گیا اور یہ فرمایا کہ محمود حسن سے کہہ دو کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑے۔ بس میں نے یہ کہنے کیلئے بلایا ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد میں اس قصہ میں کچھ نہیں بولوں گا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس حکایت پر حاشیہ قلمبند فرمایا ہے اور جو اس کتاب کے صفحہ ۲۶۱ پر ہے جو یہ ہے "یہ واقعہ روح کا تمثل تھا اور اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جسد مثالی تھا مگر مشابہ جسد عنصری کے دوسری صورت یہ کہ روح نے خود عناصر میں تصرف کر کے جسد عنصری تیار کر لیا ہو۔ مگر وقت گزرنے پر پھر اس مرکب کو تحلیل کر دیا جاتا ہے"۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس واقعہ کو منجملہ اور واقعات کے حضرت قاسم العلوم کی روحانی امداد سے تعبیر کیا ہے اور اس کی جستہ جستہ باتیں سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۳۳۲ کے حاشیہ پر تحریر فرمائی ہیں۔" اس واقعہ کے راوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے پوتے حکیم عبد الرشید محمود بھی ہیں۔ انہوں نے شاہ لطیف حسین کے دوسرے صاحبزادے پیرزادہ حسن راشد سے فرمایا کہ ایک مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب اور ان کے ایک ہم عصر مولانا احمد حسن کے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی اور کچھ عرصہ تک جاری رہی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا احمد حسن صاحب کی طرفداری فرمائی۔ ایک دن شیخ الہند مولانا محمود حسن کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے استاد حضرت نانوتوی جن کا انتقال ہو چکا تھا آئے اور کہنے لگے کہ تم (شیخ الہند) مولانا فخر الحسن صاحب اور مولانا احمد حسن صاحب کے جھگڑے میں نہ پڑو، ان لوگوں کو اپنا جھگڑا خود چکانے دو۔ تمہیں دخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسی وقت شیخ الہند مولانا محمود حسن پر اس درجہ رقت طاری ہوئی کہ اس وقت انہوں نے دونوں کو بلایا اور کہا کہ میں تم دونوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ میں کسی کی طرفداری نہ کروں گا۔ تم اپنا فیصلہ خود کر لو۔ میں اس معاملہ میں بالکل الگ ہوں۔ شیخ الہند کا یہ عالم تھا کہ وہ بات کرتے جا رہے تھے اور سر سے پاؤں تک لرزہ طاری تھا۔" لیکن خاندانی روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت نانوتوی نے اس وقت شاہ

رفیع الدین سے یہ کہا کہ ہم نے تبلیغ اور مناظرہ کے لئے مولوی فخر الحسن کی خود تربیت کی ہے اور اس لئے اس بارے میں کسی اور کو ان کے کام میں مداخلت نہیں کرنا چاہیئے۔ اس حکایت کے نقل کرنے اور اس سے قبل مولانا مناظر احسن گیلانی کے حوالہ سے قاسم العلوم کے مکتوب دہم سے بعض جملے نقل کرنے سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ دیوبند میں قیام کے دوران حضرت فخر العلماء نے جس ادب اور توجہ سے حضرت قاسم العلوم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اس کا حضرت قاسم العلوم پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انہیں اپنے اس ذہین، مستعد، بہادر اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا جذبہ رکھنے والے شاگرد سے ایسی محبت ہوئی جو قیامت تک قائم رہے گی۔

حضرت نانوتوی سے عشق

مگر یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی حضرت فخر العلماء کو بھی حضرت قاسم العلوم سے ایسی محبت تھی سو انہوں نے بھی اپنی ساری زندگی استاد پر تج دی۔ انہوں نے کہا کہ تم نگینہ چلے جاؤ تو یہ بے چون و چرا نگینہ چلے گئے۔ انہیں حکم ہوا کہ مدرسہ عبد الرب چلے جاؤ تو یہ وہاں چلے گئے۔ انہیں ہدایت فرمائی کہ تم خورجہ جاؤ تو یہ خورجہ چلے گئے۔ ان سے کہا کہ تم ابن ماجہ کی تصحیح کے لئے دہلی جاؤ تو یہ دہلی چلے گئے۔ غرضیکہ ان کی زندگی اس طرح بسر ہونے لگی جس طرح پروانہ کی زندگی شمع کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ انہوں نے حضرت قاسم العلوم کی محبت میں اپنی خانگی زندگی تک تباہ کر لی اور حضرت قاسم العلوم کی وفات تک ان سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ جو کام بھی کرتے تھے حضرت قاسم العلوم کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں فنا فی الاستاد کا درجہ حاصل تھا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکے کا نام بھی حضرت قاسم العلوم کے مشورہ سے رکھا۔ قاسم العلوم کے مکتوب دہم میں اس واقعہ کا تذکرہ موجود ہے۔ اس خط میں حضرت قاسم العلوم اپنے چہیتے شاگرد حضرت فخر العلماء کو لکھتے ہیں (اصل خط فارسی میں ہے، یہاں اس کا سادہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو قاسم العلوم مع ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۱۰۲ پر ہے) "پہلی گذارش تو یہ ہے کہ لڑکے کی پیدائش مبارک ہو، بہت بخشنے والا خدا عمر دراز کرے اور بخت نیک کو مددگار بنائے اور علم و عمل سے بہرہ وافر عطا فرمائے۔ آمین! اس کا نام محمد نور الحسن یا محمد حسن اچھا لگتا ہے۔ مگر ان کے خاندان میں اگر کوئی اس نام کا ہو تو اس صورت میں عورتوں کو غالباً یہ نام پسند نہیں آئیں گے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں عرض کریں (ولادت گنگوہ میں ہوئی تھی) جو کچھ وہ فرمائیں وہی نام رکھ دیں۔ حضرت قاسم العلوم نے نام تجویز کرنے کے ساتھ حضرت گنگوہی سے مشورہ کا حکم دیا تھا مگر شاگرد رشید کیلئے تو حضرت قاسم العلوم کی تجویز ہی کافی تھی لہٰذا فرزند اول کا نام نور الحسن ہی رکھا گیا۔

حضرت فخر العلماء کی زندگی کو اس لئے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو قیام دار العلوم سے شروع ہو کر حضرت قاسم العلوم کی دیوبند میں تدفین پر ختم ہوا۔ دوسرا زندگی کا وہ دور جو حضرت قاسم العلوم کی رحلت سے شروع ہو کر کانپور میں بساطیوں کے قبرستان میں خود ان کی تدفین پر ختم ہوا دور اول میں حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کی تلوار اور قلم تھے اور دور ثانی میں آپ اپنے استاد گرامی کے ارشادات کے مبلغ، آپ کی تحریروں کی مرتب، آپ کی سوانح کے مولف، اور فیوض قاسمی کے پیکر نظر آتے ہیں گویا طالب علمی کے دور سے لیکر لحد کی آغوش میں جانے کے وقت تک حضرت فخر العلماء نے اپنے استاد کی مرضی اور منشاء کے مطابق زندگی کا سفر طے کیا اور ان ہی کی محبت کو متاع عزیز سمجھتے ہوئے اپنی زندگی کو مالک حقیقی کے سپرد کیا!

حضرت قاسم العلوم کا سلسلہ تدریس اور نظریہ تعلیم

حضرت قاسم العلوم کا شاگرد بننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جس طرح حضرت مولانا رشید احمد کے

یہاں اچھے شاگردوں کا استقبال ہوتا تھا اور خراب طالب علموں کو یہ لطائف الحیل ٹالا جاتا تھا۔ بعینہٖ یہی حضرت قاسم العلوم کے درس کا دستور تھا۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید کے صفحہ ۹۵ پر ارقام فرمایا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد جس طالب علم میں کمی پاتے یا یہ سمجھ جاتے تھے کہ پڑھنے کے بعد اس سے نقصان کا اندیشہ غالب ہے اس کو کبھی سبق شروع نہ کراتے۔ بلکہ لطائف الحیل سے اسے ٹال دیتے یا ذرہ روکھا برتاؤ فرماتے تھے جس سے وہ خود بد دل ہو کر چلا جائے۔ حضرت قاسم العلوم کی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد اول کے صفحہ ۲۳۳ میں ارقام فرمایا ہے کہ ”حضرت والا کے ارشادات و علوم سے مستفید ہونے کے لئے علاوہ طباع ہونے کے یہ شرط بھی تھی کہ طالب علم پہلے سے کتاب کو سمجھے اور پڑھے ہوئے ہو۔ مولانا مناظر احسن نے اس سلسلہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے حوالہ سے سوانح قاسمی حصہ اول صفحہ ۲۴۱ پر ارقام فرمایا کہ ”براہ راست اس فاکسار نے علامہ عثمانی سے یہ بات سنی ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی یہ فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی اجتماعی تعلیم سے علم کی کمیت اور مقدار میں اضافہ ہوتا تھا۔ یعنی اہل علم کی تعداد بڑھانا اگر مقصود ہو تو اس کی عملی تدبیر یہی ہے کہ اجتماعی درس کو رواج دیا جائے۔ لیکن نقصان کا پہلو درس کے اس اجتماعی طریقہ میں یہ ہے کہ علم کی کیفیت روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ بایں معنی کہ طلبہ کی استعداد انحطاط و ضعف کا شکار ہو جاتی ہے۔ گویا تعداد تو مولویوں کی مدرسوں کے ذریعہ بڑھ جاتی ہے لیکن بالغ استعداد اور غیر معمولی قابلیت اور لیاقت رکھنے والے افراد کی پیدائش میں اجتماعی درس کی وجہ سے کمی پڑ جاتی ہے۔“ مولانا عثمانی نے حضرت نانوتوی کے اس استدلال کو اور زیادہ بہتر طریقہ سے اس مضمون میں بیان کیا ہے جو دارالعلوم کی اشاعت اپریل ۱۹۵۳ء میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے متعلقہ پیراگراف جو صفحہ ۴۰ پر شائع ہوا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:“ اسی سلسلہ میں حضرت نانوتوی سیدنا امام الکبیرؒ کے اسی تعلیمی نظریہ کا بھی مولانا نے ذکر کیا کہ علم کی اشاعت کی دو مستقل شکلیں ہیں۔ یعنی اہل علم کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلانے کی صورت یہی ہے جو مدرسوں کی اختیار کی گئی ہے لیکن علم کی کیفیت میں ترقی اگر مقصود ہو تو بجائے جماعتی تعلیم کے چند خاص طالب علموں کو پڑھانا چاہیے اور شخصی طور پر ان کی تربیت اور پرداخت میں کوشش کی جائے۔ فرماتے تھے کہ حضرت نانوتوی نے اسی اصول کے تحت خود مدرسہ میں نہیں پڑھایا بلکہ اپنے چند طلبہ کا انتخاب کر لیا تھا، ان ہی کو آپ نے پڑھایا جیسے حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی وغیرہم حضرات تھے۔“

حضرت قاسم العلوم کے تعلیمی نظریہ کی وضاحت

سیدنا امام الکبیر کے اس تعلیمی نظریہ کی مزید وضاحت آپ کے پوتے حضرت مولانا قاری محمد طیب نے اپنے ایک مضمون میں جو حضرت والا کی سیاسی زندگی پر تحریر کیا گیا تھا، کی ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسی مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۴۲۱-۴۲۲ اور ۴۲۳ میں اسی مضمون کا جا بجا حوالہ دیا ہے۔ جناب مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ ”سیدنا امام الکبیر کا یہ علمی نظریہ تعلیمی سلسلہ میں ایک ایسا تجرباتی نظریہ ہے جس کی تائید مشاہدات سے ہو رہی ہے۔ حضرت والا کے حفید سعید مولانا محمد طیب صاحب نے جو مقالہ آپ کی سیاسی زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں بھی ایک موقع پر یہ فرماتے ہوئے کہ ”یہ ایک فطری امر ہے کہ شخصی تقویٰ سے جماعتیں بن ہیں۔ لیکن جماعتی گٹھ جوڑ سے افراد تیار نہیں ہوتے۔ یعنی فرد اس طرح کبھی صالح اور متقی نہیں بن سکتا کہ کوئی جماعت باہمی مشورے سے اس کے متقی ہو جانے کے بارے میں ریزولیشن پاس کر دے یا اس کے تقویٰ و طہارت کا کوئی رسمی پروگرام بنا کر اس پر باقاعدہ ضابطہ میں اس کو چلائے۔ بلکہ صرف اسی طرح بن سکتا ہے، کہ وہ

یک خاص مطلب کے ساتھ ایک مربی کا رنگ قبول کرے اور اس کے چلے ہوئے راستہ پر اس کی نگرانی و رہنمائی میں چل کر منزل مقصود تک جا پہنچے" آخر میں لکھتے ہیں کہ " یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی تربیتی احاطہ میں جماعتی افکار و خیالات یا شورائی طرز عمل کا ترتیب میں دخل ہوا اور شخصی تربیت باقی نہ رہی جب ہی وہ احاطہ بھی بے عمل یا بے روح بن گیا" بہر حال اس اہم تجرباتی حقیقت کا اظہار فرمانے کے بعد مولانا طیب سلمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی اطلاع دی کہ "حضرت وسیدنا امام الکبیر کو جہاں علم کی ترویج اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ عام منظور تھی وہیں اپنے مخصوص جذبات و احساسات اور اپنے مخصوص رنگ اخلاق و عمل سے ترتیب دیکر ایک خاص جماعت بھی بنانی تھی۔ اس لئے ایک طرف تو تعلیمی ادارہ قائم فرمایا (یعنی دار العلوم دیوبند) جس کے اصول اساسی میں عمومیت اور طریق عمل میں ہمہ گیری اور وسعت رکھی اس کے لئے شورائی حلقہ تجویز فرمایا۔ اور اس کے احاطہ میں اہل علم و فضل کی ایک جماعت لاکر بٹھا دی" اور اس کے بعد وہ ارقام فرماتے ہیں کہ " اور دوسری طرف تربیت خاص کی حد تک اپنی ذات گرامی کو مرکز بنایا۔ مخصوص طلاب اور افراد اپنے لئے چھانٹ لئے۔ تربیت کی جگہ بھی تعلیمی احاطہ سے الگ رکھی۔ چھتہ کی مسجد کا حجرہ اپنے لئے مختص فرمایا اور ان معتمد طالبوں کو سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھ کر انہیں اپنے رنگ میں رنگا" جس ضرورت احساس کی طرف میں نے (جناب گیلانی) اشارہ کیا تھا۔ وہ یہی ضرورت تھی۔ یہ مدرسہ نمارفت و لے برندش والی ضرب المثل کا تعلق اگر چہ اس طفل سے تھا جو پڑھنا نہیں چاہتا تھا لیکن بہر حال بے چارے کو لوگ مدرسہ لے گئے تھے۔ لیکن تاریخ کی یہ بھی ایک ایسا بھی دور آیا کہ پڑھنے والا نہیں بلکہ پڑھانے والا پڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اور گو اصطلاحی مدرسہ میں پڑھانے کیلئے وہ کبھی پھر داخل نہ ہوا۔ لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ بنا جس مدرسہ کا عذر تھا، اسی کے پڑوس کی مسجد کے ایک حجرے میں درس دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ قصبہ دیوبند کی مشہور تاریخی مسجد چھتہ والی مسجد تھی جس کے ایک حجرے کو حضرت والا کے قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا طیب صاحب اپنے سیاسی مقالہ میں اس حجرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ " حضرت کی درسگاہ اور تربیت گاہ اور جائے قیام چھتہ کی مسجد کا ایک حجرہ تھا جو اب تک محفوظ ہے" آگے اس کے بعد وہی رقمطراز ہیں۔ کہ "اسی میں شب و روز گزرتے تھے اور اس میں علمی اضافہ اور باطنی توجہات کا بازار گرم تھا۔ شاگرد اپنے لئے مخصوص منتخب فرمالئے تھے۔ مولوی محمد طیب صاحب کے قلم سے بے ساختہ اس موقع پر یہ فقرہ بھی آگیا کہ "بلکہ من جانب اللہ یہ سب ان (حضرت قاسم العلوم) کے لئے مخصوص کردیئے گئے تھے۔ بہر حال مولانا طیب صاحب نے ان ہی چیدہ و برگزیدہ معدودے چند طلبہ کی خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا کہ " بجائے خود ذکی، مستعد، طالب حق اور علم و دین میں نفاست کے جذبات رکھتے تھے" ان میں سے چند کے نام کی تصریح بھی مولانا نے فرمائی ہے لکھتے ہیں کہ جیسے حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ محدث دار العلوم دیوبند، حضرت اقدس مولانا احمد حسن محدث امروہوی۔ حضرت اقدس مولانا عبد العلی صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مولانا محی الدین مرادآبادی، قاضی ریاست بھوپال، مولانا حبیب الحق صاحب جے پور، قاضوی، غیرہ وغیرہ۔"

درس وتدریس کی تفصیلات

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی نے درس و تدریس کا آغاز اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ سے کر دیا تھا۔ اور اس کی تصدیق حضرت قاسم العلوم کے شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یعقوب نے سوانح قاسمی میں کی ہے۔ گویا متعلم اور معلم ہونے کا سن ۱۲۶۰ھ ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں کہ " ۲ محرم سن سا ٹھ کو دہلی پہنچے، چوتھے کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کافیہ شروع

کی اور احقر نے میزان اور گلستان۔ والد مرحوم نے (مولانا مملوک علی نے) میرے ابواب کا سننا اور تفصیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا"۔ جنگ آزادی کے دوران جب حضرت مولانا محمد یعقوب کا سلسلۂ تعلیم منقطع ہوا تو نانوتہ میں قیام کے دوران حضرت قاسم العلوم نے حضرت مولانا محمد یعقوب کو بخاری کا درس دیا۔ نانوتہ کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب نے میرٹھ میں حضرت قاسم العلوم سے صحیح مسلم پڑھی اور ان کے بقول ایک جماعت نے حضرت قاسم العلوم سے صحیح مسلم پڑھی اور ان کے بیان کے مطابق "منشی جی کے تھے (منشی امتیاز علی) میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا۔ اس زمانہ میں پڑھانا اکثر تھا۔ سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے۔ اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے نہ سمجھے اور عجائب و غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے تھے۔" یہی مولانا یعقوب صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ایک بار مولوی صاحب (جناب قاسم العلوم) نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضامین ہوتے" اس کے بعد آپ نے دیوبند میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد آخر میں "الحاصل" کے عنوان کے تحت انوار قاسمی کے صفحہ ۱۴۴ میں یہ ارشاد فرمایا کہ "حضرت قاسم العلوم کے یوں تو بہت سے شاگرد تھے مگر ان میں خصوصی شاگرد یہی چند حضرات یعنی مولانا محمود حسن صاحب، مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا احمد حسن صاحب، مولانا عبداللہ صاحب، مولانا محی الدین مراد آبادی، قاضی ریاست بھوپال اور مولانا محمد عبدالحق صاحب ساکن پور قاضی تھے"۔

شاگردوں کے انتخاب کی وجہ

حضرت قاسم العلوم بلا وجہ شاگردوں کے انتخاب میں محتاط نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ گنجینۂ علم تھے اور آپ کی تقریروں کو سمجھنے کے لئے بھی اعلیٰ استعداد درکار تھی۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۴۶ میں لکھا ہے کہ "یہ شاگردوں کا انتخاب اور صدائے عام سے پرہیز اس لئے تھا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کو مرکز تعلیم بنا کر کچھ خاص طلبہ کو مختلف رنگوں میں رنگنا چاہتے تھے یعنی وہی رنگ جو دربار نبوی میں تھا کہ بعض اصحاب سند علم و فقہ اور حکمت و اسرار میں کمال رکھتے تھے تو بعض پر علم کے ساتھ جہاد کا رنگ غالب تھا۔ پھر چونکہ حضرت قاسم العلوم کی علمی پرواز بہت بلند تھی۔ اس لئے جب تک طلبہ بھی بلند پرواز نہ ہوں، ان سے استفادہ مشکل تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے براہ راست مولانا محمد یعقوب صاحب سے سنا کہ انہوں نے فرمایا، "ایک دفعہ میں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا۔ اس وقت حضرت والا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرے میں تھے اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی۔ مولانا نے اس مسئلہ پر تقریر شروع کی لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس جن کو میں قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ میں نے کہا کہ کچھ نازل ہو کر تقریر فرمائیے۔ میں قطعی نہیں سمجھا تو پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو کچھ نازل (آسان) تھی۔ جس کے الفاظ مانوس تھے مگر معانی قطعاً بلند اور غیر مانوس جن کو میں نہیں سمجھا۔ تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا۔ کچھ اور نازل ہو کر فرمائیے۔ پھر اس سے اتر کر اور نازل (آسان) تقریر فرمائی جو کچھ قریب الفہم آ گئی تھی مگر پھر بھی نہیں سمجھا، اور میں نے عرض کی کہ میں نہیں سمجھا تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی دوسرے وقت پوچھ لیجئے گا۔" دراصل حضرت قاسم العلوم کے دل پر فیضان ربانی ہوتا تھا اور وہ چشموں کی صورت میں قلب قاسمی سے ابل پڑتا تھا۔ قاسم العلوم پر معانی کا اس قدر نزول ہوتا تھا کہ علوم سمندر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اور کثرت معانی و اسرار کے جلووں کا دل پر اس قدر ظہور ہوتا تھا کہ ان اسرار کو سمیٹنا ان کیلئے دشوار ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتنی ہی مرتبہ تقریر کرتے کرتے رک جاتے تھے اور جب پوچھا جاتا کہ اثنائے تقریر میں

آپ کیوں رک جاتے ہیں تو فرماتے تھے کہ دل پر مضامین اتنے وارد ہوتے ہیں کہ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ کس کو بیان کروں اور کس کو بیان نہ کروں (ارواح ثلاثہ بروایت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا وہ واقعہ بھی یاد کیجئے جب حضرت قاسم العلوم نے میرٹھ میں ان پر توجہ دی اور وہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔ عارف باللہ کے الفاظ یہ ہیں "آج صبح کی نماز میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر سے گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ روح پرواز کر جائے مگر وہ دریا جیسا کہ وہ آیا تھا ویسا ہی نکلا چلا گیا"۔ آگے چل کر عارف باللہ فرماتے ہیں کہ "اللہ اکبر جس شخص کی توجہ کا یہ اثر ہے کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے تو خود اس شخص کے قلب کی وسعت و قوت کا کیا حال ہو گا جس میں خود وہ علوم سماتے ہوں۔ حضرت قاسم العلوم کا دل جہاں علوم کا سمندر تھا وہاں ان کا دماغ اس قدر بلند پرواز تھا کہ آسمان علم سے مضامین کے بے شمار تارے توڑ کر لاتا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک قول بیان فرمایا کہ "ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک مضمون نیا بیان فرمایا۔ کسی نے حاضرین میں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمایا تھا۔ ارشاد فرمایا کہ جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ فرماتے تھے۔ مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کی برابر کھلتا تھا اور ہمارے لئے سوئی کے ناکہ (سوراخ) کے برابر کھلتا ہے"۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی نے فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب تو کتاب سے کچھ کہتے ہی نہیں تھے اسی فہم خداداد سے کہتے تھے جس کی نسبت وارد ہے (ترجمہ آیت) جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں سمجھ عنایت کرتا ہے" اس طویل اقتباس کے نقل کا باعث یہ ہے کہ حضرت قاسم العلوم اپنے شاگردوں کے انتخاب میں بغیر کسی سبب کے محتاط نہیں تھے۔ متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی احتیاط برمحل اور مناسب تھی۔ جیسا کہ مولانا انوار الحسن شیر کوٹی نے فرمایا کہ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو مختلف انداز اور مختلف سمتیں عنایت کرتے تھے مگر ان کے شاگردوں میں حضرت شیخ الہند اور حضرت فخر العلماء رحمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یعنی انہیں درس و تدریس اور تحریر و تقریر میں حضرت قاسم العلوم سے مناسبت خاص ہونے کے ساتھ ان کے اندر وہی جذبۂ جہاد کارفرما تھا جس کے سوتے حضرت قاسم العلوم کے ذہن سے پھوٹتے تھے پھر بھی ان دو شاگردوں کی صلاحیتوں میں فرق تھا اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب کے بقول جب حضرت شیخ الہند درس و تدریس اور حضرت فخر العلماء تصنیف و تالیف کے میدانوں میں الگ الگ حضرت قاسم العلوم کے جانشین تھے۔ حضرت شیخ الہند آگے چل کر اور حضرت قاسم العلوم کی صحبت اختیار کرنے کے بعد جذبۂ جہاد میں حضرت قاسم العلوم ثانی ثابت ہوئے مگر حضرت فخر العلماء جنگ آزادی کے جن حوادث سے گزر کر حضرت قاسم العلوم کی خدمت میں داخل ہوئے تھے ان حوادث نے انہیں پہلے ہی جذبۂ جہاد سے سرشار کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے حضرت فخر العلماء کا اپنی ترتیب شدہ سوانح قاسمی میں تذکرہ کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا کہ مولوی فخر الحسن "وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم ہیں۔ بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں" تو اس کا ضرور کچھ نہ کچھ سبب ہو گا۔

حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں کے نام

حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں اور حضرت فخر العلماء کے استاد بھائیوں تو بہت کافی تھے

مگر انوار قاسمی اور تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مطالعہ سے جن اہل علم حضرات کا پتہ چلتا ہے ان کی تعداد اٹھارہ ہے۔ ان میں دس شاگردوں نے اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور تین شاگردوں نے تحریر و تقریر میں معارف قاسمی کی تشہیر کی اور بہت سی اہم کتب حدیث اور قرآن پاک کی تفسیر لکھ کر اہم دینی خدمت انجام دی۔ ان تین شاگردوں کا حضرت قاسم کے سوانح نگار نے تذکرہ کیا ہے۔ یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت فخر العلماء مولانا فخر الحسن اور حضرت سید العلماء مولانا احمد حسن۔ جن گیارہ علماء نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا ان کے نام یہ ہیں ۱۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ۲۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی ۳۔ حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی ۴۔ حضرت مولانا احمد حسن امروہوی ۵۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن دیوبندی ۶۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی ۷۔ حضرت مولانا عبد العلی صاحب میرٹھی، ۸۔ حضرت مولانا عبد الغنی صاحب پھلاوری ۹۔ حضرت مولانا عبد الرحمن امروہوی ۱۰۔ حضرت مولانا عبد العدل صاحب میرٹھی ۱۱۔ حضرت مولانا عبد اللہ صاحب انبیٹھوی۔ ان کے علاوہ ۱۔ حضرت مولانا منصور علی خان ۲۔ حضرت مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری ۳۔ حضرت مولانا خلیل الرحمن امروہوی ۴۔ حضرت مولانا علاؤ الدین صاحب نانوتوی ۵۔ حضرت مولانا محی الدین صاحب مراد آبادی ۶۔ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب علیگڑھی اور ۷۔ مولانا سعید بن سردار کھڑک سنگھ بھی حضرت نانوتوی کے شاگرد شمار کئے جاتے ہیں۔ ان ۱۸ شاگردوں میں سے مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا حبیب الرحمن دیوبندی حضرت مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی، حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی، حضرت مولانا عبد العلی صاحب میرٹھی اور حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب امروہوی کسی نہ کسی عنوان دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے۔ ان میں حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی نے مدرسہ اسلامی عربی گلاوٹھی ضلع بلندشہر، مدرسہ اسلامی عربی شاہی مسجد مراد آباد، مدرسہ عربی امروہہ، مدرسہ عبد الرب دہلی اور خورجہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت مولانا عبد العلی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے علاوہ مدرسہ شاہی مراد آباد اور مدرسہ عبد الرب دہلی میں تعلیم دی اور محدث دہلوی کہلائے۔ اور مولانا عبد الرحمن امروہوی نے دیوبند، امروہہ اور مراد آباد کے مدارس میں تعلیم دی۔ ان شاگردان قاسم العلوم کے علاوہ جو دیوبند سے متعلق رہنے کے باوجود دوسرے عربی مدارس میں بھی پڑھاتے رہے مولانا عبد الغنی پھلاوری نے مدرسہ عربیہ شاہی مراد آباد میں اور مولانا عبد اللہ انبیٹھوی نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور حضرت فخر العلماء نے کہ جو اس کتاب کے صاحب سوانح ہیں مدرسہ اسلامی عربی نگینہ بجنور اور مدرسہ عبد الرب دہلی میں اپنے استاد کے حسب الحکم درس و تدریس کا بازار گرم کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے خورجہ میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ دراز کیا جس کا اس سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اور آپ نے سہارنپور میں پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کا ذکر مولانا گنگوہی کے ایک خط میں جو مفتی محمد شفیع کے والد کے نام ہے ملتا ہے۔

مدرسہ اسلامی عربی نگینہ بجنور

دارالعلوم دیوبند کی شاخوں میں جو مدرسہ اسلامی عربی میرٹھ، مدرسہ اسلامی عربی کیرانہ ضلع مظفر نگر، مدرسہ اسلامی عربی گلاوٹھی ضلع بلندشہر، مدرسہ اسلامی ہرکی ضلع سہارنپور، مدرسہ عربی اسلامی انبیٹھہ ضلع سہارنپور، مدرسہ عربی شہر مظفر نگر، مدرسہ عربی اسلامی شاہی مسجد مراد آباد، مدرسہ عربیہ تھانہ بھون، مدرسہ عربی اسلامی قصبہ دانپور ضلع بلندشہر اور مدرسہ اسلامی عربی نگینہ ضلع بجنور تھے۔ ان میں آخر الذکر مدرسہ کو ہر لحاظ سے فوقیت حاصل تھی اس لئے کہ یہ مدرسہ خاص

حضرت قاسم العلوم کی تحریک پر قائم کیا گیا تھا اور اس کے صدر مدرس کے عہدے پر حضرت قاسم العلوم کے حکم پر حضرت فخر العلماء کا تقرر کیا گیا تھا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۹۷ پر ارقام فرمایا ہے کہ حضرت فخر العلماء" نے تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسہ عربیہ قاسم العلوم جامع مسجد نگینہ میں ملازمت کی جیسا کہ مجموعہ قاسم العلوم کے خطوط میں حضرت قاسم العلوم کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے"۔ حضرت فخر العلماء کی نگینہ میں آمد و قیام سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۴ء کے اواخر یا سنہ ۱۲۹۱ھ مطابق سنہ ۱۸۷۵ء کے اوائل میں ہوا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے "قاسم العلوم" کے صفحہ ۱۰۲ پر مدرسہ اسلامیہ عربیہ نگینہ کے بارے میں بعض معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "مولانا فخر الحسن کو غالباً حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے نگینہ کے عربی مدرسہ کے لئے بھیجا ہوگا۔ یہ مدرسہ قاسم العلوم کے نام سے مولانا محمد قاسم صاحب کے ایما سے جاری کیا گیا شہر کی عالیشان جامع مسجد میں قائم ہے۔ میں نے بھی اس میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک سال تعلیم پائی ہے اس وقت مولانا بشیر احمد مرحوم بڈھانوی عربی مدرس تھے۔ اور میاں جی سراج الدین سیوہاروی فارسی پڑھاتے تھے۔ میں نے ان سے مصدر فیوض، پند نامہ، رقعات عنایت علی پڑھے تھے مولوی شوکت علی رئیس اسی زمانہ میں مہتمم تھے۔ مولانا فخر الحسن صدر مدرس مدرسہ قاسم العلوم نگینہ رہے ہیں۔ ماہنامہ البلاغ بمبئی بابت دسمبر سنہ ۱۹۵۳ء شمارہ نمبر ۹، ۸، ۷ میں بھی مدرسہ قاسمیہ عربیہ کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے مطابق یہ مدرسہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں قائم ہوا۔ رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں "مدرسہ قاسمیہ عربیہ نگینہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں شیخ قادر بخش مرحوم نے جامع مسجد نگینہ میں ایک مختصر مکتب کے طور پر اس کی بنیاد رکھی۔ جب اس کو ایک انتظامیہ کمیٹی کے تحت باقاعدہ تشکیل دی جانے لگی تو قادر بخش صاحب نے اس کا نام مدرسہ قادریہ رکھنے پر زور دیا مگر اراکین نے اسے مناسب خیال نہیں کیا۔ اسی دوران میں مولانا حکیم عبد العلی صاحب رئیس محلہ قاضی سرائے کے بڑے صاحبزادے مولوی شوکت علی کو شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ تو شیخ نے (حضرت قاسم العلوم) انہیں ایک عربی مدرسہ قائم کرنے کی ہدایت فرمائی جس کے بعد مدرسہ مذکور کی زمام اہتمام مولوی شوکت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں آگئی۔ موصوف نے شیخ الاسلام کی ہدایت کے فائدہ میں مدرسہ کا نام مدرسہ قاسمیہ عربیہ نگینہ رکھا اور اس کی ترقی کے لئے سعی شروع کی تو مدرسہ میں عربی، فارسی اور قرآن عزیز کی درسیات اس قدر مکمل اور وسیع دائرہ میں ہو گئے کہ ضلع بجنور میں یہی مدرسہ مذہبی علوم کے لئے واحد درسگاہ کی حیثیت سے شہرت پا گیا۔ یہاں تک کہ اطراف و جوانب کے علاوہ بلخ، بخارا وغیرہ ولایات بیرون ہند کے طلبہ بھی یہاں جوق در جوق آتے رہے۔ پس مدرسہ نے اپنا مرکز دار العلوم دیوبند کو ہی قرار دیا۔ پھر بھی یہاں سے براہ راست طور پر ۱۲ افراد عربی میں علوم کی سند فراغت حاصل کر کے رخصت ہوئے۔ ... و حدیث کی ابتدائی کتابوں کو پڑھ کر دیوبند جانے والے طلبہ کے علاوہ فارسی کی تکمیل جس میں مکمل فقہ بھی شامل ہے۔ صدہا طلبہ نے کی اور حفظ و ناظرہ قرآن عزیز پڑھنے والے طلبہ کا شمار بہت زیادہ ہے۔ الحمد للہ آج بھی مولانا الحاج محمد سعید کے زیر اہتمام مدرسہ کے تمام مذکورہ فیوض برقرار ہیں اور حالات کی ناساعدت کا مقابلہ کرتے ہوئے ضلع بجنور کے جدید اسلامی مدارس سے زیادہ مفید و نیک شہرت کے مالک ہیں۔ مدرسہ کی اپنی عمارات ہیں اور ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں مختلف علوم و فنون پر چار ہزار کتب موجود ہیں۔

لیکن ابتدائی زمانہ میں ایک وقت مدرسہ قاسمیہ عربیہ نگینہ پر ایسا آیا کہ اس کے اولین صدر مدرس کو اسے خیرباد کہنا پڑا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے استاد مکرم کو جو خط لکھا اس کا جواب حضرت نانوتوی کے مکتوب یازدہم میں موجود ہے۔ یہ مکتوب مجموعہ قاسم العلوم کے چوتھے حصہ

میں ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی۔ جلد دوم کے صفحہ ۳۰۰، ۳۰۱ اور ۳۰۲ میں اس مکتوب کے حوالہ سے مدرسہ عربیہ قاسمیہ کی اس افسوسناک حالت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ جناب گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ "دیوبند میں قیام مدرسہ کے بعد روہیل کھنڈ کی متعدد چھوٹی بڑی آبادیوں میں بتدریج عربی مدارس کے گویا جال ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچھتے چلے جاتے ہیں۔ مظفر نگر، مراد آباد، رڑکی، خورجہ، بنگلور، نگینہ وغیرہ میں آگے پیچھے مدرسے جو قائم ہوئے اور بحمد اللہ اس وقت ان میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں۔ ان کی تاسیس زیادہ تر سیدنا امام الکبیر (حضرت مولانا نانوتوی) رحمۃ اللہ علیہ کے چشم و ابرو کے اشاروں ہی کی رہین منت ہے۔ نئے قائم ہونیوالے ان مدرسوں کے ساتھ حضرت والا کے غیر معمولی تعلق و توجہ کی نوعیت کیا تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ نگینہ میں عربی کا جو مدرسہ قائم ہوا تھا اور صدارت کے لئے حضرت والا ہی نے اپنے تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہی کا انتخاب فرمایا تھا۔" کچھ دن بعد اپنے ایک خط میں مولانا فخر الحسن مرحوم نے حضرت نانوتوی کو خبر دی کہ مدرسہ باشندگان نگینہ کی لاپرواہیوں کا شکار بنتا چلا جا رہا ہے، شاید یہ بھی لکھا کہ ان حالات میں اب میرا قیام نگینہ میں مشکل ہے۔ اس کے جواب میں حضرت والا کے قلم سے جو الفاظ نکلے ہیں، انہیں پڑھیئے جواب کی زبان جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا۔ فارسی تھی، ارقام فرمایا گیا کہ "باتمہ بہ اطلاع تنزلزل بنا مدرسہ نگینہ بدرجہ رنج دارم، یکے از طرف آں عزیز دوئم از طرف اہل نگینہ کہ چہ کم حوصلگی کردند" لیکن اس کے بعد کافی تند و تیز ہو جاتا ہے۔ بے ساختہ نوک قلم سے یہ فقرہ نکل پڑا ہے" اے ہر نعمتے کہ بے سابقہ جد و جہد می رسد ناقدر شناساں بہمیں ساں ضائع می کنند" بے چین ہو کر اپنی قلبی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا "یا رب! ایں چہ زمانہ ہست کہ از شرفاء فہم برگرفتند" آخر میں نگینہ کے انہی شرفاء کے مرض کی تشخیص ان الفاظ میں فرماتے ہوئے کہ" چوں بہ نظر غور بہ نگرم ایں ہمہ تغیر نتیجہائے بے نیازی ہست صدق رسول الکریم بہ رفع العلم" مطلب یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے ذریعہ سے جو علم کا نیا اور قیمتی سرمایہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا اس کی ضرورت کا احساس لوگوں میں باقی نہیں رہا ہے، اس لئے باور کر لیا گیا کہ سامان علم کے اس نبوی سرمایہ سے بے نیاز اور مستغنی ہو چکے ہیں مشہور حدیث جس میں پیشن گوئی کی گئی ہے کہ ایک وقت ایسا بھی مسلمانوں پر آئے گا، کہ نبوت کی راہ سے علم کی جو دولت ان کو ملی تھی، دینے والا اس کو واپس لے لیگا۔ وہی پیشن گوئی پوری ہو رہی ہے گویا علم ہی مسلمانوں کو چھوڑ رہا ہے لیکن وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اس کو چھوڑ رہے ہیں۔ آخر میں نگینہ والوں کو اسی خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ" بظاہر برحنیاں می فاید کہ اگر ایں خوان نعمت را از نگینہ خواہند برداشت ما نخواہند گسترانید انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مکتوب قاسمی کا ترجمہ

مولانا انوار الحسن شیر کوٹی کی تصنیف

"قاسم العلوم ہے مع ترجمہ انوار النجوم" سے اس مذکورہ بالا خط کا لفظی ترجمہ پیش خدمت ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہ خط حضرت فخر العلماء کے نام ہے۔ خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے" رہین منت ہائے بے پایاں احباب محمد قاسم عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا مکرمت جامع کمالات عزیزم مولوی فخر الحسن صاحب (۱) کمالاتہ۔ اس کے بعد خط کا متعلقہ حصہ حاضر خدمت ہے۔ یہ "تذکرہ" مولانا انوار الحسن کی متذکرہ بالا تصنیف کے صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳ اور ۱۰۴ پر ہے۔" اتی نگینہ (ضلع بجنور۔ یو۔ پی) کی بنیاد کے اندر خرابی آنے سے مجھے دو وجہ سے رنج ہوا۔ ایک تو تمہاری طرف سے اور دوسرے نگینہ والوں کی طرف سے کہ کیا حوصلے کے پست ہیں۔ ہاں ہر نعمت کہ بہلے کی ہوئی کوشش کے بغیر مل جاتی ہے ناقدر شناس لوگ اس کو اس قدر ضائع کر دیتے ہیں۔ یا رب یہ کیا زمانہ ہے کہ شریفوں سے سمجھ

کا مادہ بھی لے لیا۔ باوجودیکہ انسان کو فرشتوں پر برتری حاصل ہے جیسا کہ رکوع "اور جبکہ آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں" (پارہ ۱۔ سورہ بقرہ رکوع ۴۔) اس دعوی پر گواہ ہے۔ یہ انسان اس قدر بے قدر ہو جائے۔ جب ہم غور کی نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ سب قدرت کی نیرنگیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا کہ علم اٹھا لیا جائے گا (یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے) پوری حدیث یہ ہے۔ حضرت انس سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرماتے تھے کہ قیامت کی شرطوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھا لیا جائے گا اور جہالت بڑھ جائے گی۔ اور بہت ہوگا زنا اور شراب نوشی بہت ہو جائے گی۔ مرد کم ہوں گے اور عورتیں زیادہ ہوں گی۔ تا آنکہ پچاس عورتوں پر ایک خبر گیری کرنے والا ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ علم قلیل ہوگا اور جہل پیدا ہوگا۔ (بخاری و مسلم نے علامات قیامت میں مشکوۃ شریف نے اس حدیث کو نقل کیا) خیر خدا پر نظر رکھیں اور بالکل ہراساں نہ ہوں تنگی کے ساتھ خدا کی رضا ہے (یہ مشہور تیسویں پارے کی سورت الم نشرح میں ہے) اگر ایک دروازہ حکمت سے بند فرماتے ہیں تو کیا خوف ہے کہ دوسرے دروازے کھول دیں گے (بقول شیخ سعدی علیہ الرحمۃ (حکمت خدا اگر بہ بندد درے بہ رحمت کشاید در دیگرے) لیکن ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوان نعمت کو نگینہ سے اٹھائیں گے تو کچھ نہیں بچا تیں گے انا للہ وانا الیہ راجعون" حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں کہ شاید یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا اور نگینہ والے اسے کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے (سوانح قاسمی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۳) مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ مدرسہ بحمد اللہ اب تک قائم و دائم ہے اور اسے ضلع بجنور یو۔ پی کے دینی مدرسوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے والد مولانا حکیم سید عبدالحیٔ سابق ناظم ندوۃ العلماء نے نگینہ کے قیام کے دوران ۱۲ شعبان ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں مدرسہ عربیہ قاسمیہ کا معائنہ کیا تھا۔ اور اسی روز حضرت مولانا احمد حسن امروہوی سے جو مدرسہ کے سالانہ امتحانات کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے ملاقات کی۔ اس کا ذکر ان کے سفرنامہ" دہلی اور اس کے اطراف کے صفحہ ۱۷۰-۱۶۹ میں موجود ہے۔

ابن ماجہ کی تصحیح وتشریح

مدرسہ اسلامیہ عربیہ قاسمیہ نگینہ تو بفضل خداوندی چلتا رہا اور بحمد اللہ اب تک زندہ اور سلامت ہے لیکن حضرت فخر العلماء کا نگینہ میں رزق پورا ہو چکا تھا۔ لہذا آپ نے نگینہ سے رخت سفر باندھا اور دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی جانے کا سبب بھی حضرت قاسم العلوم کی ذات تھی۔ آپ نے اپنے اسی خط میں آگے چل کر حضرت فخر العلماء کو دہلی جانے کا مشورہ دیا تھا اس خط کے متعلقہ حصہ کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ "میرے عزیز گرامی اگر اپنی ملازمت کی جگہ (نگینہ) سے اٹھیں تو اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اول دہلی پہنچیں اور منشی ممتاز علی صاحب اور منشی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کریں شاید مطبع کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔" حضرت قاسم العلوم کے ایک اور خط میں جو فیوض قاسمیہ کے خطوط میں گیارہویں نمبر پر ہے حضرت فخر العلماء کے دہلی جانے کا تذکرہ ہے۔ یہ خط فیوض قاسمیہ کے صفحہ ۴۱ اور ۴۰، ۳۹، ۳۸ پر ہے۔ اس خط میں حضرت قاسم العلوم اپنے سفر دہلی کی افواہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کی" بات صرف اتنی ہے کہ مولوی فخر الحسن دہلی کے ارادہ سے روانہ ہو رہے ہیں اگر انہیں مدرسہ حافظ عزیز الدین میں کوئی مناسب ملازمت مل گئی تو وہاں قیام کریں گے ورنہ کچھ روز تصحیح ابن ماجہ کے سلسلہ میں جو مطبع میں شروع ہو گئی ہے قیام کریں گے۔" جناب انوار قاسمی نے قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم کے صفحہ ۹۰ پر تحریر فرمایا ہے کہ" نگینہ کے مدرسہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مطبع مجتبائی دہلی میں جو

اس وقت منشی ممتاز علی میرٹھی کی ملکیت میں تھا (آپ نے) تصحیح کتب پر ملازمت کی" بہر حال ان مذکرہ بالا باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت فخر العلماء ۱۲۹۲ھ سے لیکر ۱۲۹۴ھ تک دہلی میں مقیم رہے۔ اولاً آپ نے ابن ماجہ کی تصحیح کا کام کیا۔ جو یقیناً ان کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اور اپنے مقام پر اس کا تذکرہ ہے لیکن بعد ازاں انہیں مدرسہ عبدالرب میں ملازمت مل گئی۔

مدرسہ عبدالرب

جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے "قاسم العلوم مع ترجمہ انوار النجوم" میں اسی مکتوب یاز دہم کے سلسلہ میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے صفحہ ۱۰۳ کے فٹ نوٹ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ "اس عبارت کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نگینہ کی ملازمت کے بعد مولانا فخر الحسن صاحب حسب مشورہ مولانا محمد قاسم صاحب دہلی پہنچے ہوں گے اور منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کیا ہوگا بعد ازاں دہلی میں قیام کے باعث مدرسہ عبدالرب میں ملازمت ملی"۔ انہی مولانا انوار الحسن نے اپنی متذکرہ بالا تصنیف کے صفحہ ۷۹ پر مولانا فخر الحسن گنگوہی کے تعارف کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مطبع مجتبائی میں تصحیح کے کام کے بعد آپ نے مدرسہ عبدالرب میں ملازمت کی۔ مولانا شیر کوٹی فرماتے ہیں کہ "بعد ازاں مدرسہ دہلی میں بھی ملازم رہے جیسا کہ قاسم العلوم کے مکتوب ہنم میں آپ کے نام کے ساتھ مدرس مدرسہ دہلی لکھا ہوا ہے۔ (یہ مکتوب قاسم العلوم کے چوتھے نمبر میں جس پر ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۹۴ھ کی تاریخ پڑی ہے شائع ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نگینہ سے واپس آنے کے بعد اور ابن ماجہ کی تصحیح سے فارغ ہونے کے بعد آپ اس وقت تک مدرسہ عبدالرب میں مدرس ہو گئے تھے۔ اور جب حضرت قاسم العلوم ربیع الاول ۱۲۹۴ھ میں دہلی تشریف لائے تو آپ مدرسہ عبدالرب میں نہ صرف ملازم تھے بلکہ وہیں احاطہ مدرسہ میں مقیم تھے۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے اپنی متذکرہ بالا تصنیف میں قاسم العلوم کے اشتہار کے حوالہ سے جو اس کی اشاعت سے قبل منشی ممتاز علی نے چھاپ کر شائع کیا تھا یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی نے خود دہلی تشریف لا کر ان مکاتیب کی اشاعت سے قبل خود کتابت کے بعد تصحیح کی تھی۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے لکھا ہے کہ مذکورہ اشتہار سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا ربیع الاول ۱۲۹۴ھ سے کچھ پہلے دہلی میں آکر مقیم ہونا۔ خود منشی صاحب کے مکان پر مولانا کا قیام پذیر ہونا (جو بازار چاوڑی میں رہتے تھے۔) قاسم العلوم کے مکتوبات مولانا سے حاصل کرنا۔ مولانا کا مکتوبات اور کتابت کردہ کاپیوں پر نظر ثانی اور ان کی تصحیح کرنا ثابت ہے۔) یہ مدرسہ عبدالرب دہلی میں واقع تھا۔ امیر الروایات میں امیر شاہ خان صاحب سے روایت ہے کہ "مدرسہ عبدالرب پہلے املام گلی کی طرف تھا اور اس میں مولوی احمد حسن صاحب امروہوی اور مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی مدرس تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب اس زمانہ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کرتے تھے مگر مولوی احمد حسن اور مولوی فخر الحسن صاحب کی وجہ سے مدرسہ میں سویا کرتے تھے (امیر الروایات صفحہ ۲۵) اتنا لکھنے کے بعد جناب شیر کوٹی نے آگے بیان فرمایا کہ "اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ مولانا فخر الحسن صاحب مدرسہ عبدالرب دہلی میں ملازم تھے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے قیام کا زمانہ جو ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں قاسم العلوم کی تصحیح کا وقت تھا جیسا کہ قاسم العلوم کے ٹائیٹل سے واضح ہے مدرسہ عبدالرب کا اس زمانہ میں نام مدرسہ دہلی تھا۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے حضرت مولانا احمد حسن کے حالات پر جو مقالہ رسالہ دار العلوم میں شائع فرمایا اس کی پہلی قسط میں جو دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارہ میں شائع ہوئی آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ مدرسہ عبدالرب کا پہلا نام مدرسہ دہلی تھا اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی نے "مولانا خلیل الرحمن امروہی کو جو قلم خاص سے لکھی ہوئی سند عطا فرمائی (جو راقم کے پاس محفوظ ہے) اس میں اپنے دستخط کے ساتھ جو عبارت تحریر فرمائی ہے اس میں "المدرسۃ العربیۃ الواقعۃ فی الدہلی

لکھا ہوا ہے۔ تحفۂ سعید میں جو مولوی محمد سعید صاحب کی تصنیف ہے تحریر ہے کہ مدرسہ عبد الرب" پرانا مدرسہ اور مسجد ہے اور مولوی صاحب موصوف کی یادگار ہے کشمیری دروازہ کے علاقہ میں واقع ہے۔ دینی تعلیم بخوبی ہوتی ہے۔ ہر سال ماہ شعبان میں فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کی جاتی ہے اور یہاں کے سند یافتہ اطراف ہند میں پھیل کر دینی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بڑے بڑے نامور علما اس مدرسہ میں تعلیم دے چکے ہیں۔ مولوی عبد الرب صاحب شہر دہلی کے خاندانی مولوی تھے۔ واعظ شیریں بیان بھی تھے۔ ان کے وعظ میں خاصہ اثر تھا۔ مسجد کی عمارت پہلے سے دو چند کردی گئی ہے۔ جناب امیر الدین نے بھی تفسیر ابر کرم میں مولوی عبد الرب کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ یادش بخیر بدر العلماء مولانا و مخدومنا مولوی عبد الرب صاحب فخر ہند علیہ رحمۃ۔ یہ بزرگ نیک نام جامع کمالات صوری و معنوی ذکتہ سنج حدیث بندی تھے۔ آپ کے اوصاف میں نہ زبان کو طاقت تحریر ہے اور نہ قلم کو یارائے تحریر۔ دلائل عقلیہ اور فنون حکمیہ کو آپ کی ذات گرامی پر ناز تھا اور علوم عربیہ کو آپ کی زبان دانی سے افتخار تھا۔ خلق و علم و حلم کا کچھ حساب نہ تھا۔ سحر البیانی میں روئے زمین پر ان کا جواب نہ تھا۔ حضرت مرحوم راقم کے کرم اعظمی استاد شفیق تھے۔ وعظ جو کچھ فقیر نے حاصل کیا وہ حضرت ہی کا فیض تھا۔ الٰہی اس مرحوم علیہ رحمۃ کو جنت میں خوش رکھے۔ اس سے پہلے ان کی سحر البیانی کا ذکر جامع مسجد دیوبند کی تعمیر اور دار العلوم دیوبند کی تاسیس کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ مرحوم حضرت قاسم العلوم کے دوست بھی تھے۔ جس کا ثبوت موصوف قاسمیہ کے خطوط سے ہوتا ہے۔ بہرحال ان کا مدرسہ بہت مشہور تھا۔ یادگار دہلی کے مصنف ظہیر الدین سید احمد ولی الدین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "تار گھر سے دو سڑکیں جاتی ہیں ایک جانب مغرب جو مدرسہ مولوی عبد الرب مرحوم کو جاتی ہے اور پھر گنہنے نالے ہوتی ہوئی ریل کی سڑک کے برابر سیدھی چھوٹے دروازے سے نکل جاتی ہے۔ یہ مدرسہ نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے۔ غربی جانب میں مسجد کا دوہرا دالان ہے۔ اس کے شمال میں دو حجرے ایک میں مدرسہ کا دفتر رہتا ہے دوسرے میں استاد اور طالب علم رہتے ہیں، جنوب میں نہایت پاکیزہ کمرہ، موزوں صحن، ادہر، ادہر حجرے بیچ میں حوض، دروازہ کے متصل کنواں۔ اس کو مولوی عبد الرب صاحب نے اس غرض سے بنایا تھا کہ اس میں مدرسہ جاری رہے اور علوم دینیہ کی تعلیم ہوا کرے۔ تاریخ دار العلوم دیوبند میں بھی حضرت مولانا عبد العلی کے حوالہ سے مدرسہ عبد الرب کا ذکر ہے اور حضرت شیخ الہند کی سوانح میں جو میاں جی اصغر حسین دیوبندی نے تحریر فرمائی اس حوالہ سے مدرسہ اور مسجد کا ذکر ہے۔ بہرحال یہ وہ مدرسہ ہے جس نے حضرت مولانا عبد العلی میرٹھی کو محدث دہلوی کے خطاب سے نوازا اور اس میں قریب قریب دو سال حضرت فخر العلماء نے درس دیا۔

حضرت فخر العلماء نے جہاں اپنے استاد کی مہربانی سے مدرسہ قاسمیہ نگینہ کی صدارت فرمائی۔

حج بیت اللہ

اور اس کے بعد مطبع مجتبائی میں ابن ماجہ کی تصحیح فرمائی اور اس کے بعد مدرسہ عبد الرب دہلی میں درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ اسی طرح اپنے استاد کی مہربانی سے حج بیت اللہ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ خاندانی روایات میں اس حج کا بہت ذکر ہے اور حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی نے ابو داؤد کا جو حاشیہ مطبع نامی کانپور جس کے مالک خلیل منشی رحمت اللہ رعد تھے۔ میں چھپوایا۔ اس میں بھی انہوں نے حضرت فخر العلماء کے نام کے ساتھ الحاج کا خطاب تحریر فرمایا ہے۔ اس حج میں حضرت قاسم العلوم کے ہمراہ جو لوگ تھے ان کا اور اس سفر حج کا تذکرہ سوانح قاسمی حیات یعقوب و مملوک اور تذکرۃ الرشید میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جناب مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حج شوال ۱۲۹۴ھ میں شروع [illegible] ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں تمام حضرات حج سے واپس اپنے

اپنے وطن واپس آگئے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ یہ ہیں: "پھر اسی سال ارادہ جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کو ہوا۔ احقر بھی تیار ہوا اور چلتے ہی مولانا کو بھی ساتھ لے لیا۔ اور مولوی صاحب کے ساتھ اور کچھ کتنے ہی معتقد اور خادم آپ کے روانہ ہوتے۔ شوال سنہ ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے اور ربیع الاول سنہ ۱۲۹۵ھ کے اول میں اپنے وطن واپس تک۔ اس سفر میں تمام قافلہ علماء کا تھا۔ اٹھارہ بیس مولوی فاضل ساتھ تھے۔ اور عجب لطف کا مجمع تھا۔" جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد سوم کے صفحہ ۱۵ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جس کے مطابق عیسوی سن کے حساب سے یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۷۷ء اوائل ماہ اکتوبر یا اواخر ستمبر کی کسی تاریخ میں روانہ ہوئے اور سنہ ۱۸۷۸ء ماہ فروری کی کسی تاریخ میں ہندوستان واپس لوٹے۔ (صفحہ ۲۲۹)

تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الٰہی کا کہنا تھا کہ "سارا قافلہ کچھ اوپر سو کا تھا۔" اور مولانا مناظر احسن کا کہنا ہے کہ "ان بزرگوں میں سے بڑی تعداد تو سہارن پور ہی کے اسٹیشن پر پہنچ کر رفاقت کا حق ادا کرنے کیلئے حاضر ہوگئی تھی۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے جو پہلے ہی سے راہی بمبئی ہو چکے تھے۔ اور جو لوگ نہ آگے روانہ ہو سکے اور جو نہ سہارن پور پہنچنے کا موقع ان کے لئے باقی رہا۔ انہی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے لیے جس ریلوے اسٹیشن سے ساتھ ہونا آسان ہوا سوار ہوئے اور آگے پیچھے بھی روانگی بہ نیت معیت وہمرکابی کا سلسلہ بندھا رہا۔" جناب مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ "سیدنا امام الکبیر ریل پر جس وقت سوار ہوئے اس وقت آپ کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن جونہی کہ سہارنپور سے گاڑی آگے بڑھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ کچھ نہیں معلوم کہ کس نے یہ خبر پھیلا دی کہ فلاں گاڑی سے مولانا نانوتوی سفر حج کے لئے جا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس قابل ذکر اسٹیشن پر بھی گاڑی ٹھہرتی تھی خلق اللہ کا ایک ہجوم اس پر نظر آتا تھا۔ لوگ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے اس ڈبہ تک پہنچتے تھے جس میں آپ جلوہ فرما ہوتے تھے۔ ملاقات و مصافحہ کے بعد ملنے والے ہدایا اور تحائف کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق حضرت والا کی خدمت میں رقمیں بھی پیش کرتے چلے جا رہے تھے۔ کہتے تھے کہ پھلوں اور مٹھائیوں کا ڈھیر تھا جو جمع ہو گیا تھا۔ غازی آباد پہنچنے پر گاڑی بدلنی پڑی وہاں سے الہ آباد جانے والی ٹرین پر لوگ سوار ہوئے۔ رات میں پھر وہ تماشہ پیش نظر تھا۔ حضرت فخر العلماء غالباً غازی آباد سے ہمراہ ہوئے اس کے بعد یہ قافلہ بمبئی میں ۱۲،۱۳ روز قیام کرنے کے بعد بمبئی سے جدہ روانہ ہوا اور تیرہ دن بعد جدہ پہنچ گیا۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی لکھتے ہیں کہ "گھر سے جو کچھ لیکر نہیں نکلا تھا۔ کیا عجیب تماشہ ہے کہ بمبئی پہنچنے تک اسی کے پاس اتنا کچھ جمع ہو گیا کہ خود ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتنوں کو حج و زیارت کی سعادت سے شرف اندوز ہونے کا موقع اس کی وجہ سے مل گیا۔" مولانا منصور علی خان حیدر آبادی نے جو اتفاقاً حضرت نانوتوی کے ہمراہ اس قافلہ میں شامل ہو گئے تھے لکھا ہے کہ "جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا پڑا۔ سواری نہیں ملی (مذہب منصور) اس دشواری کے باعث قافلہ دو حصوں میں بٹ گیا مگر حضرت قاسم العلوم اور ان کے ہمراہی مولانا منصور علی خان کے بیان کے مطابق قریب صبح صادق کے وہاں (مکہ میں) داخل ہوئے۔ "مکہ شریف جب قریب آیا۔ غسل فرمایا۔" "جناب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بطور استقبال کے تشریف لائے (مذہب منصور صفحہ ۱۷۹) اور یہ سارا قافلہ، بقول مولانا عاشق الٰہی "اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ) کی اس رباط میں مقیم رہا۔ جو بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ایک مخلص نے خرید کر حارۃ الباب میں حضرت الیشان (یعنی حاجی صاحب) کی نذر کی تھی۔ اور اسی رباط کے" دروازے کے اوپر مولانا صاحب (مولانا نانوتوی) اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے قیام کیا۔" (صفحہ ۱۷۹، مذہب منصور)۔ یہیں مولانا منصور علی خان حیدر آبادی آگے چل کر رقمطراز ہیں کہ دروازہ کے اوپر کے بالاخانہ پر ٹھہر گئے

کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دستور تھا کہ اپنے دونوں عزیز مہمانوں سے ملنے کے لئے کبھی کبھی خود اوپر تشریف لے جایا کرتے اور جوں ہی حاجی صاحب پر دونوں کی نظر پڑتی کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے اور نہایت مودب روزانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ جاتے۔"[۷] مولانا منصور علی خاں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عموماً تشریف لاتے اور تصوف کے عام مسائل کے سوا مسئلہ وحدت الوجود پر تقریر فرماتے۔ اکثریت اس قافلہ میں مولویوں کی تھی۔ ان کے سامنے اور وحدت الوجود جیسے متوحش مسئلہ پر تقریر ایک خاص رنگ پیدا کرتی۔ حکیم صاحب (مولانا منصور علی خاں) کا بیان ہے کہ "جناب مولوی محمد مظہر صاحب نانوتوی صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور اس تقریر پر شبہات پیش کرتے۔ ان کا جواب بھی حاجی صاحب نہایت متانت اور آسان طریق پر ادا کرتے" لیکن تقریر کا واقعی روئے سخن جن کی طرف تھا۔ سنیے مسئلہ وحدت الوجود کی ان تقریروں کے متعلق ان کا کیا حال تھا حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ "مولانا مرحوم (سیدنا امام الکبیر) کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح مولانا رشید احمد صاحب بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے تھے اور کچھ چون و چرا نہ کرتے" [۱۸] مولانا عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ قافلہ بعد حج سلطانی راستے سے مدینۃ الرسول روانہ ہوا۔ اور منصور علی صاحب کے بقول "جب منزل بہ منزل، مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں سے روضہ پاک جناب لولاک نظر آتا تھا"۔ "فوراً جناب مولانا مرحوم نے اپنی نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پا برہنہ چلنا شروع کیا۔ اور مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اس طرح چل کر پا برہنہ پہنچ گئے۔ رات کو مدینۃ الرسول کی فصیل کے دروازے بند تھے۔ صبح ہونے پر جب یہ کھلے تو تمام حضرات روضہ نبوی پر حاضر ہوئے۔ اور اس کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی کے پاس قیام پذیر ہوئے اور بقول مولانا عاشق الٰہی" مدینہ منورہ میں اس مقدس قافلہ نے کم و بیش بیس روز قیام کیا۔" اور اس کے بعد" یہ مقدس و مبارک مجمع مکہ واپس ہوا اور بہ اطمینان ایک مہینہ سے زیادہ مکہ معظمہ میں قیام کیا۔" حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مکہ معظمہ میں اپنے مرشد کے پاس ابھی اور قیام کرنا چاہتے تھے کہ زندگی میں یہ موقع پھر میسر ہونے والا نہیں تھا۔ مگر قافلہ والوں کے جن کے پاس زاد راہ ختم ہو رہا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ سے درخواست کی کہ وہ ان حضرات کو واپس جانے کا حکم دیں تاکہ ہم لوگ جو ان کے ساتھ آئے ہیں ان ہی کی معیت میں واپس جائیں۔ چنانچہ حاجی صاحب نے دونوں روحانی فرزندوں کو حکم دیا کہ جاؤ بسم اللہ کرو اور یہ دونوں حضرات اپنے اس مقدس قافلہ کے ساتھ ہندوستان واپس تشریف لائے۔ واپسی میں حضرت مولانا نانوتوی کو بخار آیا اور سفرہ ہوا مگر جب جہاز بمبئی کے قریب پہنچا تو قے موقوف ہوگئی۔ بمبئی میں اچھے رہے مگر نقاہت بہت تھی لہذا بمبئی سے اٹاوہ تک لیٹے لیٹے پہنچے۔ وطن پہنچنے کے بعد مرض رفع ہوا۔ گو نہ طاقت آئی مگر بقول مولانا محمد یعقوب صاحب مگر کھانسی ٹھہر گئی۔ اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا زیادہ بولنا اور دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہوگیا۔" جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا تھا یہ واپسی ۱۲۹۵ھ میں ہوئی اور ماہ ربیع الاول کے اوائل میں یہ سب حضرات وطن پہنچ گئے۔

حضرت فخر العلماء خورجہ میں

حضرت قاسم العلوم کے ساتھ حج سے واپس آنے کے بعد حضرت فخر العلماء پر دہلی میں رزق کے دروازے بند ہو چکے تھے لہذا حضرت نانوتوی کے حکم پر خورجہ ضلع بلند شہر کا سفر اختیار کیا۔ اور خورجہ کے مدرسہ میں جو کہ حضرت قاسم العلوم کا قائم کردہ تھا اور جس میں مولانا احمد حسن امروہوی نے بھی درس دیا۔ پڑھانا شروع کر دیا مگر یہاں ملازمت کی نوعیت پرائیویٹ تھی۔ اور یہ ۱۲۹۵ھ تا ۱۲۹۷ھ تک کا دور تھا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۲۸۱ میں ارقام فرمایا کہ آپ ۱۲۹۵ھ میں نواب عظیم اللہ خان رئیس خورجہ کے پاس تیس روپیہ ماہوار پر ملازم تھے۔

(رپورٹ موتمر الانصار مراد آباد) ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۵ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جن طلبہ نے ثمرۃ التربیت کی انجمن بنانے کی درخواست کی ان میں مولانا فخر الحسن صاحب بھی شریک تھے۔ اور مولانا محمود الحسن صاحب بھی۔ آپ کے نام کے آگے ثمرۃ التربیت میں سات روپیہ آٹھ آنے کا سالانہ چندہ جمعیت الانصار کی رپورٹ کے صفحہ ۴۶ پر جو ضلع مراد آباد کے متعلق ہے درج ہے اور خورجہ میں نواب صاحب کی ملازمت کا حال بھی اسی رپورٹ میں درج ہے "حضرت فخر العلماء یوں تو خورجہ میں ملازم تھے لیکن" حضرت مولانا نانوتوی کی علالت کے باعث اکثر و بیشتر دیوبند جاتے رہتے تھے۔ اور پھر اسی زمانہ میں وہ حضرت قاسم العلوم کے ساتھ رڑکی بھی گئے جہاں انہوں نے سوامی دیانند کے خلاف مناظرہ میں حصہ لیا جس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

حضرت قاسم العلوم کی علالت و رحلت

حج سے واپسی کے بعد حضرت مولانا قاسم نانوتوی کی صحت برابر خراب رہی یہاں تک کہ آپ نے ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا۔ آپ کے مرید حکیم مشتاق احمد نے جو ایک قطعہ زمین خاص قبرستان کے لئے اسی وقت وقف کیا تھا اس میں انہیں دفن کر دیا گیا۔ حضرت فخر العلماء جو اپنے استاد کی علالت کے دوران برابر ان کی تیمار داری کیلئے دیوبند اور نانوتہ جاتے رہتے تھے۔ انتقال کے وقت دیوبند ہی میں موجود تھے۔ حضرت امیر شاہ خاں صاحب حکایات اولیاء کی حکایت نمبر ۳۴۶ میں جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے منسوب ہے نے یہ فرمایا کہ "یہ وہ زمانہ تھا جس زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بہ مرض الموت علیل تھے۔ مولوی فخر الحسن نے اس واقعہ کو حضرت مولانا کی خدمت میں بیان کیا تو آپ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور گھبرا کر فرمایا کہ آخر مولوی محمد یعقوب نے ایسا کہا توبہ، توبہ، توبہ، بھائی یہ کام انہیں کا تھا، کیونکہ وہ مجذوب ہیں۔ اگر ہم ایسی گستاخی کرتے تو ہماری گردن نپ جاتی۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے اس حکایت پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ یہ ہے " قولہ کیونکہ وہ مجذوب ہیں، بعض مراتب مجذوبیت میں ایسے اقوال مجذوب کی بڑ سمجھ کر عفو فرما دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض مجاذیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر جذب کا اثر کسی وقت ہوتا ہے۔ احقر نے خود مولانا سے سنا ہے کہ ایک بار خط لکھ کر میں نے دستخط کرنا چاہا تو اپنا نام بھول گیا بجز جذب اور اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ حضرت قاسم العلوم اپنی علالت کے دو سالہ دور میں نانوتہ میں بھی قیام پذیر رہے اور وہاں اس بیماری کے باوجود تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کی تصدیق مولانا منصور علی خان حیدر آبادی نے بھی کی۔ ان ہی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت فخر العلماء اس زمانہ میں نانوتہ بھی تشریف لے گئے۔ مولانا منصور علی خان نے مذہب منصور کی جلد دوم میں تحریر فرمایا ہے کہ "میں حج کے بعد ربیع الاول میں جب وطن (مراد آباد) آیا۔ چند روز قیام کر کے نانوتہ پہنچا۔ اس وقت مولانا صاحب کو اچھا تندرست پایا۔ مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا لیکن پہلی سی قوت نہیں تھی۔ اس وقت مولانا صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے واسطے مولوی محی الدین خان مراد آبادی اور مولوی عبد العلی صاحب میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے۔ میں ان کے اسباق کی سماعت بھی کرتا تھا لیکن ان کے فضل و کمال کو کہاں تک پہنچتا۔ اور ان سے پہلے جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم کی خدمت میں برکت میں مولوی احمد حسن صاحب امروہی اور مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی وغیرہ میرٹھ میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ اور کبھی کبھی نانوتہ میں بھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے"۔

اُستاد کے انتقال پر صدمہ

حضرت مولانا محمد قاسم کی رحلت حضرت فخر العلماء کی زندگی میں ایک نئے موڑ کا

باعث تھی۔ اب تک یعنی زمانہ طالب علمی سے لیکر حضرت قاسم العلوم کی وفات تک حضرت فخر العلماء کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا اور اس میں فرزندوں کے نام تک کا معاملہ شامل ہے جس میں حضرت قاسم العلوم کے ایماء، منشاء اور ہدایت کو دخل نہ ہو لیکن اب جبکہ شفیق استاد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو حضرت فخر العلماء کی زندگی میں ایک اندھیرا سا چھا گیا۔ جب تک وہ حیات تھے تو جہاں انہوں نے جانے کا حکم دیا چلے گئے۔ جہاں پڑھانے کی ہدایت کی وہاں پڑھانا شروع کر دیا۔ اور جہاں کتابوں کی صحت کی طرف اشارہ کیا تو اس کام میں لگ گئے۔ جب حکم دیا کہ شاہجہانپور چلو تو حاضر تھے۔ جب ارڑکی جانے کا حکم ہوا تو وہاں موجود۔ منگلور جانے کی ہدایت کی تو ہدایت سر آنکھوں پر۔ اب کون ہدایت دینے والا حکم دینے والا اور مشوروں سے نوازنے والا باقی بچا تھا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے مولانا منصور علی خان حیدرآبادی کے حالات میں انوار قاسمی کے صفحہ ۵۳۶ میں لکھا تھا کہ "مولانا فخر الحسن صاحب فراغت علم کے بعد نگینہ خورجہ اور دہلی کے مدرسوں میں مدرس رہے" اب انہیں ان جگہوں پر بھیجنے والا دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ مولانا کی زندگی کے آئندہ ادوار کا جب جائزہ لیا جائے گا تو پتہ چلے گا کہ اس حادثہ نے ان کے نظام حیات کی کایا پلیٹ دی اور انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے بعد درس و تدریس کے پیشہ کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا۔ مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا احمد حسن امروہوی تو مشکل سے ایک دو ماہ اس حادثہ سے ملال رہنے کے باعث گوشہ نشین رہے اور اس کے بعد پھر درس و تدریس کے کاموں میں منہمک ہو گئے۔ مگر حضرت فخر العلماء کے لئے یہ رحلت ایسا سانحہ تھی جس کا اثر مرتے دم تک ان پر باقی رہا۔ اور وہ ان کی رحلت کے بعد ۱۸ سال زندہ تو رہے لیکن یہ زندگی ایسی تھی جو حسرت و یاس کی مستقل آماجگاہ تھی۔

حضرت فخر العلماء نے اپنا غم غلط کرنے کیلئے اپنے استاد کی سوانح لکھی؛ ترتیب اور علوم قاسمی کی اشاعت کا بیڑہ اٹھالیا۔ اور اس کام میں اپنے آپکو اتنا منہمک و مصروف کر لیا کہ وہ ان کی زندگی کے تمام کارناموں پر حاوی ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب انوار الحسن شیرکوٹی کو انوار قاسمی کے صفحہ ۲۲۱ پر یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "حضرت قاسم العلوم کے مضامین عالیہ اور علمی تبرکات کو شائع کرنے میں جس قدر مولانا فخر الحسن پیش پیش تھے اتنا کوئی بھی نہ تھا" اور یہ وہ شخص لکھ رہا ہے جس کو تمام اکابرین دیوبند کے حالات اور خدمات جلیلہ کا کما حقہ علم ہے اور جو اب تک انوار قاسمی، قاسم العلوم اور حیات یعقوب و مملوک شائع کرنے کے علاوہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت حاجی امداد اللہ کی حیات پر چار کتابیں شائع کر چکا ہے۔ حضرت فخر العلماء نے مباحثہ رڑکی کی جو روداد انتصار الاسلام کے نام سے شائع فرمائی ہے اس میں حضرت قاسم العلوم کی رحلت پر جس کربناک انداز میں تبصرہ فرمایا ہے اس سے ان کے رنج و غم کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں "حیف صد حیف کہ زمانہ ایسے امام ربانی سے جو اپنے زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا خالی ہو گیا۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ امام شریعت جو نہ فقط اپنی جان بلکہ پڑوسیوں کی بھی جانیں شریعت کی حمایت میں جھونک دے اس وقت دنیا سے اٹھ جائے۔ ہائے وہ باغ اسلام کا باغبان کہاں گیا۔ جو اس باغ کی حفاظت کرتا تھا۔ جس سے اس کو رونق تھی۔ ہائے اب اس باغ کی خدمت کون کرے گا۔ اس کی روشیں کون درست کرے گا۔ خس و خاشاک سے صحن چمن دین کس طرح صاف ہو گا۔ ہائے وہ نخل بلند گلستان اسلام کدھر گیا جو سرو اسلام یعنی صراط مستقیم کی درستگی و موزونی کی فکر رکھتا تھا۔ ہائے وہ جاروب کش باغ دین کہاں گیا جس کی تقریر خس و خاشاک اوہام کے لئے جاروب تھی۔ اب سوائے حسرت و افسوس کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا۔ البتہ ایک ذات وحدہ لا شریک جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" (انتصار الاسلام صفحہ ۸)

۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۸۸۰ء تک کے خاندانی حالات

قبل اس کے کہ ہم حضرت فخر العلماء

کی زندگی کا دوسرا رخ پیش کریں ان کے خاندانی حالات اور انہوں نے جو مذہبی، دینی، اسلامی اور ملی کارنامے اپنے استاد کے ہمراہ اور ان کی ایما اور نگرانی میں سرانجام دیئے ان کا تذکرہ ہو جائے اور حضرت فخر العلماء نے اپنے استاد کی رحلت کے بعد" ماثر قاسمی کی حیثیت سے افکار اور تقاریر قاسم العلوم کی اشاعت کے لئے جو عظیم الشان جد و جہد کی ہے اور ان کی سوانح کی ترتیب کے لئے جو جد و جہد کی ہے اس کا بیان ہو جائے۔ اس لئے کہ یہ تمام خدمات جلیلہ اور سرگرمیاں حضرت قاسم العلوم کی نگرانی ہی میں جاری و ساری رہیں اور ان کی تربیت ہی کا ایک عکس تھیں۔ یہ کارنامے دراصل ایک ایسا دائرہ ہیں جن کا مرکز حضرت قاسم العلوم کی ذات گرامی تھی۔ سب سے پہلے حضرت فخر العلماء کے خاندانی واقعات کا تذکرہ کیا جاتا ہے اس لئے کہ یہ سوانح فخر العلماء کا لازمی حصہ ہیں۔ اور ان کے بغیر حضرت والا کی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ حضرت فخر العلماء کے والد حضرت شاہ عبد الرحمٰن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد تین سال کے اندر اندر رحلت فرما گئے۔ اور اپنے پیچھے ایک بیوہ اور پانچ لڑکے لڑکیاں چھوڑ گئے تھے۔ حضرت کا انتقال خاندانی روایات کے مطابق کینسر سے ہوا تھا۔ اور ان کے انتقال کے وقت حضرت فخر العلماء کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی تھی۔ حضرت والا کی صابر و باہمت والدہ ماجدہ اور انہوں نے مل کر اس یتیم خاندان کی نگہداشت کی ذمہ داری قبول کی مگر اس کے باوجود انہوں نے اولاً اپنی تعلیم کا سلسلہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ دیوبند، میرٹھ اور نانوتہ میں مکمل کیا اور سفر و حضر میں حضرت قاسم العلوم کے ہمراہ رہے۔ اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد سنہ ۱۲۹۰ھ سے لیکر سنہ ۱۲۹۷ھ تک کی سات سالہ زندگی درس و تدریس، حج اور مناظروں میں حضرت قاسم العلوم کے رفیق کی حیثیت سے گذار دی مگر وہ اس تمام عرصہ میں یعنی سنہ ۱۸۶۰ء سے لیکر جس سال ان کے والد کی رحلت ہوئی اور سنہ ۱۸۸۰ء تک جس سال حضرت قاسم العلوم کا وصال ہوا وہ اپنے خاندانی ذمہ داریوں سے اور اپنی آل اولاد کی ذمہ داریوں سے بھی بہ طریق احسن عہدہ برآ ہوتے رہے اور خاندانی روایات کے مطابق اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت میں روپیہ بھیجتے رہے تاکہ بھائی اور بہنوں کی زندگی اور ان کی تعلیمی اور تربیتی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ چونکہ اس سارے عرصہ میں ان کا کہیں ایک جگہ جم کر قیام نہیں ہوا اور وہ ایک پروانہ کی طرح اپنے استاد پر نچھاور ہونے کے عادی تھے، اس لئے ان کے لئے ایک جگہ جم کر قیام کرنا ممکن بھی نہیں تھا جس کی بنا پر ان کی اہلیہ اور بچے ہمیشہ گنگوہ ہی میں قیام پذیر رہے اور چونکہ ان کی اہلیہ میں ایک عظیم شخصیت کی شریک حیات بننے کی صلاحیت موجود نہیں تھی اس لئے وہ ہمیشہ ان کی طرف سے ترد در ہتے تھے۔ اللہ نے جس طرح والدہ کے روپ میں انہیں ایک فرشتہ صفت اور باہمت خاتون کا سایہ بخشا تھا اپنی شریک حیات کے روپ میں انہیں وہ نعمت غظمیٰ حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ قرار واقعی مستحق تھے لہذا سوائے اہلیہ کے، انہیں اپنے خاندان کے دوسرے ارکان کی طرف سے اس سارے عرصہ میں بھرپور پیار اور تعاون ملا یہی وہ دور تھا جب انہوں نے اپنی والدہ کی زیر ہدایت خود اپنی بھی شادی کی۔ اور اپنے بھائی بہنوں کی شادی بھی۔

حضرت فخر العلماءؒ کی شادی

حضرت فخر العلماء کی شادی ان کے اپنے ہی خاندان کی ایک خاتون کے ساتھ ہوئی۔ حضرت والا اس شادی سے بہت خوش تھے اور اس شادی کے ابتدائی سال نہایت مسرت اور لطف کے ساتھ بسر ہوتے اور اس دوران میں آپ کے دو صاحبزادے محمد نور الحسن اور محمد فیض الحسن پیدا ہوئے جن کے نام حضرت قاسم العلوم کے مشورہ اور ایماء پر رکھے گئے۔ حضرت نور الحسن کے نام کی

تجویز تو حضرت قاسم العلوم کے مکتوب یازدہم میں موجود ہے جس کا ذکر اوپر بیان کیا جا چکا ہے مگر حضرت محمد فیض الحسن کے نام کے بارے میں صرف خاندانی روایات ہی کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ جس کے مطابق حضرت فخر العلماء کے دونوں صاحبزادوں کا نام حضرت نانوتوی کا تجویز کردہ بتایا جاتا ہے۔ حضرت فخر العلماء کی اہلیہ اپنے نامدار شوہر کی اسی توجہ اور محبت کی خواہاں تھیں جو ان کو شادی کے ابتدائی ایام میں حاصل تھی لیکن نابغۂ روزگار مسلمان ہندوستان میں احیائے اسلام اور بقائے دین کی روز افزوں جدوجہد میں جو اس کے محبوب اور شفیق استاد کی زیر کمان ملک گیر پیمانے پر جاری تھی مصروفیت کے باعث انہیں پیش نہیں کر سکا۔ نتیجتاً ابتداء میں تلخی ہوئی اور آخر کار طلاق پر نوبت آئی حضرت فخر العلماء نے یہ منزل طے تو کی مگر ذاتی طور پر انہوں نے اس کا بہت گہرا اثر قبول کیا اور گنگوہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور ان کی والدہ آخر وقت تک اپنے بڑے بیٹے کی جدائی اور انہیں ایک بار دیکھ لینے کی آرزو اپنے دل میں لئے اللہ کو پیاری ہو گئیں اس طلاق کا سارے خاندان پر اثر پڑا اور حالانکہ آپ کی سابقہ اہلیہ نے دوسری شادی کی۔ اور ان کے اپنے دوسرے شوہر سے بھی دو لڑکے ہوئے لیکن حضرت فخر العلماء کے خاندان نے ان سے اپنا رابطہ جو منقطع کیا وہ آخر تک جاری رہا اور ان کے اہل خاندان کا یہ رویہ ہر طرح جائز تھا۔ مگر حضرت والا کی زندگی میں یہ افسوسناک اور اندوہناک حادثہ اس وقت پیش آیا جب وہ اپنے بھائی اور بہنوں کی شادی سے فارغ ہو چکے تھے۔ جناب اسمٰعیل انصاری بیان فرماتے ہیں کہ "حضرت والا کی شادی بھی انصاری خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ مجھے ان کے خسر کا نام تو یاد نہیں رہا لیکن ان کی خوشدامن جو جی برکت کے نام سے مشہور تھیں جن کی میں نے زیارت کی تھی اور میرے ذہن میں ان کی صورت و لقشہ کا دھندلا سا خاکہ موجود ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر گھریلو زندگی میں تلخی آگئی اور حضرت والا نے اپنی شریک حیات سے مقاطعہ کر کے غالباً قصبہ کو (گنگوہ) کلیتاً خیرباد کہہ دیا تھا۔ اور شاید اس کے بعد سہارنپور و کانپور میں قیام فرمایا۔ میرے علم میں حضرت کے دو صاحبزادوں کے نام محفوظ ہیں۔ نور الحسن و فیض الحسن اور غالباً ان کے ہمراہ اور کوئی صاحبزادے نہ تھے۔ (تیسرے صاحبزادے محمد احمد تھے اور چونکہ یہ کانپور میں پیدا ہوئے تھے لہٰذا اسمٰعیل انصاری کو ان کے بارے میں علم نہ تھا۔) بہرحال اس باب میں مجھے تحقیق نہیں ہے۔ لیکن یہ دونوں صاحب بھی باہر ہی رہے (کانپور میں قیام پذیر رہے) مطلقہ شریک حیات نے عقد ثانی برادری کے ایک صاحب محمد عمر صاحب سے کیا اور ان کے دو صاحبزادے محمد ظفر و محمد حنیف پیدا ہوئے۔ افسوس کہ اب دونوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ محمد حنیف صاحب نے صرف ایک لڑکا چھوڑا جو دماغی طور سے تقریباً مخبوط ہی ہے۔ مجھے صحیح تو یاد نہیں لیکن شاید سنہ ١٩٢٠ء کے لگ بھگ جناب نور الحسن صاحب اور فیض الحسن صاحب نے اپنے آبائی مکان کو علیحدہ کرنا مناسب خیال کیا۔ اور اس سلسلہ میں محمد حنیف صاحب سے مراسلت بھی ہوئی لیکن اس کے بعد ایک دوسری پارٹی بہاؤ الدین تحصیلدار (خیر پور میرس) بہت قیمت پر لینے کو راضی ہو گئے اور ان سے معاملہ پختہ ہو گیا جس پر محمد حنیف صاحب کو ناگوار ہوا اور نوبت عدالت تک جا پہنچی۔ بالآخر وہ مکان محمد حنیف صاحب کو پہلی ہی قیمت پر بیع کر دیا گیا۔

جدی مکان

جناب اسمٰعیل انصاری نے لکھا ہے کہ حضرت والا کا مکان جو بحمد اللہ ابھی تک باقی ہے میرے مکان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلہ پر محلہ قاضی بہاؤ الدین میں جو عرف عام میں جونتر تلہ کہلاتا ہے واقع ہے۔ یہ مکان سڑک سے تقریباً ۱۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور غالباً اسی وجہ سے اس محلہ کو جیونترہ یا جیوترے کی مناسبت سے جونتری تلہ کہتے ہیں۔

باپ کی طرح احترام

جناب اسمٰعیل انصاری فرماتے ہیں کہ "مجھے تفصیل کے ساتھ معلوم نہیں کہ (حضرت فخر العلماء) کا شغل درس و تدریس تھا۔ یا تجارت کا لیکن شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف رجحان رہا۔ (تجارت کی طرف نہیں طباعت کی طرف رجحان تھا) اور معاش کے سلسلے میں قیام اکثر قصبہ (گنگوہ) سے باہر رہا کرتا تھا۔ حضرت والا میرے دادا (قاضی ولی محمد) کے ہم عصر تھے۔ جن کا انتقال سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوگیا۔ شاید حضرت مولانا ان سے بھی پہلے تشریف لے گئے۔ یا انتقال فرماگئے۔ لہٰذا مجھے ان کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ میرے تایا صاحب قبلہ حاجی محمد خلیل کا ان سے بہت تعلق تھا اور بقول میرے والد صاحب مرحوم و مغفور یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں ان کا (حضرت فخر العلماء کا) ادب باپ کے برابر کرتا تھا۔ حضرت گنگوہی کو اپنی ان بہن سے بڑی محبت تھی اسی لئے کہ وہ ان کے والد اور اپنے حقیقی ماموں مولوی محمد شفیع کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور انہیں مثل اپنے والد کے جانتے تھے۔ یہ محض بیان نہیں ہے بلکہ امر واقعہ ہے۔ خود حضرت گنگوہی نے اپنے ایک خط میں جو حکیم عبدالعزیز خاں کے نام ہے مولوی محمد شفیع کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ تو میرے پدر شفیق کی جگہ ہیں" خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے "رہا بندہ سو پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی کہ بسبب مرض سابق کے کمی ہمت ہے مگر اب جو کچھ تخفیف ہوتی جاتی ہے تو بہت قوی ہوتی جاتی ہے اور حضرت (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) کا ارشاد انتقال سفر دیتا ہے اور ماموں محمد شفیع صاحب جب شوق طلب حضرت مرشد سلمہ بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تو کسی طرح چلا ہی جا اگر شدت مرض کا اندیشہ نہ ہوا اور در صورت ارادہ بھی تسلی دیتے ہیں تو اب یوں عزم ہو رہا ہے کہ ذیقعدہ کے اول میں اگر عزم پختہ ہو ہی گیا تو ماموں صاحب سے ان کے وعدہ کا خرچ لے کر چلا جاؤں گا۔ پھر اگر تا بمبئی مجھ کو کچھ نہ ہوئی تو آگے سبقت کروں گا۔ اور اگر اس سفر بمبئی میں موقع اور مناسب نہیں ہوا اور ہمت نہ بڑھی اور آگے جانا مشکل معلوم ہوا تو واپس چلا آؤں گا۔ اسی واسطے کسی کو جانے نہ جانے کی اطلاع نہیں کرتا ہوں کہ اگر مریدوں نے کچھ خدمت تواضع کی اور پھر واپس چلا آیا تو بہت مطعون ہونا پڑے گا کہ روپیہ لینے کے واسطے یہ بات مشہور کی تھی جھوٹ کر جاؤں گا اور اس عرصہ میں مال جہاز اور کرایہ بھی دریافت ہو جائے گا کیونکہ ۱۱ شوال کو قافلہ دیوبند روانہ ہوا ہے ان کو بہ تاکید کہہ دیا ہے کہ وہاں کا سبب یا حالات جہازوں کے سبب تو بس مقیم وطن رہوں گا۔ اپنا تو یوں قصد ہو رہا ہے۔ مگر تم کو اس حالت میں سفر ہرگز مناسب نہیں جانتا ہوں اور ماموں صاحب نے کہہ دیا ہے کہ اگر تو جاوے تو جس قدر روپیہ درکار ہوگا مجھ سے طلب کر لینا۔ ان سے روپیہ لینے میں مجھ کو یوں بھی اندیشہ نہیں کہ اگر واپس چلا آیا تو طعنہ نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ تو میرے پدر شفیق کی جگہ ہیں"

مولانا مظہر حسین کی شادی :- شاہ عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے چھوٹی اولاد اور حضرت فخر العلماء کے واحد بھائی مولوی شاہ مظہر حسین کی عمر جنگ آزادی کے وقت ½ ۱ سال اور والد ماجد کے انتقال کے وقت ½ ۴ سال تھی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گنگوہ میں پائی اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اپنی بقیہ تعلیم مکمل کی مگر انہیں حصول علم سے وہ رغبت نہیں تھی جو ان کے بڑے بھائی کو اللہ نے ودیعت کی تھی۔ پھر یہ کہ ان کی روزمرہ کی تربیت بھی والدہ محترمہ ہی کے سپرد رہی جس کی بنا پر انہوں نے زندگی کے وہ مصائب و شدائد بھی نہیں دیکھے جن سے اوائل عمر میں حضرت فخر العلماء کو دوچار ہونا پڑا۔ لہٰذا طبعاً بہت زیادہ ذمہ دار طبیعت کے بھی مالک نہیں تھے جس کا اندازہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جو مکاتیب رشیدیہ میں مولوی مظہر حسین کے سگے خالہ زاد بھائی مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے نام ہے۔ اس خط میں مولانا گنگوہی تحریر فرماتے ہیں کہ "فقط مولوی مظہر حسین مثل سابق ہیں۔ نہ کوئی کام ہے نہ بظاہر کوئی شغل ہے۔ بندہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نہ اب تک بیعت ہوئی فقط افسوس کسی امر کے نہ حاصل ہونے کا عمل کرنے سے بہتر ہے کیونکہ افسوس مقام افلاس ہی ہوتا ہے اور رطانیت میں دعویٰ حصول ہے۔ بندہ کے واسطے نیستی سے ہستی بہتر ہے کہ اصل عبد کی عدم نیستی ہے۔" یہ خط مکاتیب رشیدیہ شائع کردہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی میں ۳۳ نمبر پر ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خط میں مولوی مظہر حسین کے بارے میں جو تلخی نظر آرہی ہے اس کی ایک معقول وجہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت گنگوہی کی سگی ماموں زاد بہن ام حبیبہ کی شادی مولوی مظہر حسین سے ہوئی تھی اور اس تعلق سے وہ حضرت گنگوہی کے بھی تھی (حالانکہ مولوی مظہر حسین اور ان کی اہلیہ میں بے حد محبت تھی اور مولوی مظہر حسین نے اپنی پوری زندگی جس طرح اپنی والدہ ماجدہ کے مشورے اور ہدایت میں گذاری اس کی مشکل ہی سے نظیر ملیگی۔

یہ مولوی محمد شفیع تھے جن کی خاطر سے مولوی مظہر حسین کی لاپرواہی سے حضرت گنگوہی کو دکھ ہوتا تھا۔ آپ کے دو اور خطوں میں بھی مولوی مظہر حسین کا ذکر موجود ہے۔ یہ دونوں خط حسب سابق مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے نام ہیں۔ ایک خط جس پر اتفاق سے ۱۳۰۳ھ کی تاریخ ثبت ہے یہ تحریر ہے کہ حضرت والا نے "نور الحسن کا پیغام مظہر حسین سے کہہ دیا ہے"۔ دوسرے خط میں تحریر ہے کہ "مولوی مظہر حسین دہلی گئے ہیں۔ مولوی مظہر حسین تمام عمر لاابالی نہیں رہے۔ یہ جاری لاپرواہی حضرت فخر العلماء کی زندگی تک ہی تھا۔ ان کی رحلت کے بعد مولوی مظہر حسین نے کئی سال نواب زادہ لیاقت علی خان کے والد نواب رستم علی خان کی اس جائیداد اور املاک کی نگرانی فرمائی جو یوپی کے ضلع مظفر نگر میں تھی اور آپ ۱۳۱۱ھ سے ۱۳۳۸ھ تک دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے اور خود حضرت گنگوہی کے ایماء پر انہیں یہ اعزاز دیا گیا تھا جس کا تاریخ دیوبند میں بھی ذکر موجود ہے گنگوہ میں آپ جس مکان میں آخر عمر تک مقیم رہے وہ مولوی محمد شفیع صاحب ہی کا مکان تھا جو قطب عالم حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی خانقاہ کے بہت قریب واقع ہے اور جس میں خاندانی روایات کے مطابق حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کا حجرہ بھی شامل ہے یہ جگہ استعمال میں لائی نہیں جاتی۔ اسی طرح یہ وہی مکان ہے جس میں حضرت شیخ کے انتقال کے بعد شہنشاہ ہمایوں جب بغرض فاتحہ گنگوہ آیا تو ٹھہرا تھا اور یہیں اس کے حکم سے حضرت شیخ کے مزار کی تعمیر کا آغاز ہوا تھا۔ یہ مکان ترکہ میں مولوی مظہر حسین کی اہلیہ کو جو مولوی محمد شفیع صاحب کی صاحبزادی تھیں ملا تھا مگر اس میں ان کے علاوہ ایک اور بہن بھی شریک تھیں جن کا حصہ حضرت گنگوہی کے صاحبزادے حکیم قاری مسعود احمد نے خرید لیا تھا۔ اور معاملہ عدالت تک بھی پہنچا تھا۔ مگر حق شفعا کی بناء پر حکیم صاحب موصوف کی خریداری جائز تسلیم نہیں کی گئی اور مولوی مظہر حسین نے مقدمہ اپنی اہلیہ کی جانب سے جیت لیا اور شریک دار کو اس کے حصہ کا روپیہ دیدیا گیا۔ یہ مکان بعد میں مولوی مظہر حسین کے چھوٹے صاحبزادے حافظ قاری ظریف حسین کے تصرف میں رہا جن سے حضرت فخر العلماء کی پوتی اور حضرت اقدس مولانا فیض الحسن گنگوہی کی چھوٹی صاحبزادی محمودہ خاتون کا عقد ہوا تھا۔ اب یہ مکان بند پڑا ہے اور خدا جانے یہ تاریخی جگہ کس حال میں ہے

جناب اسمٰعیل انصاری نے لکھا ہے کہ مجھے حضرت اقدس (حضرت فخر العلماء) کے خاندان کے افراد کی تفصیل معلوم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کے ایک بھائی جن کا نام قیاسی اسم گرامی مظہر حسین صاحب تھا سرائے میں آباد تھے میں نے ان کی زیارت کی ہے۔ اس زمانہ میں ان کا ضعیفی کا عالم تھا۔ اور علالت نے بھی گھیر لیا تھا۔ یہ اگرچہ انصاری تھے۔ لیکن سرائے میں جا کر پیرزادگان سے تعلق کی بناء (کہ حضرت کی دادی قطب عالم کے سجادہ شاہ عماد الاسلام کی صاحبزادی تھیں) شاہ جی مظہر حسین کے نام سے موسوم ہو گئے تھے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے شاہ حاجی عزیز حسین جو نہایت نیک منکسر المزاج اور نازک طبع لوگوں میں سے تھے۔ مرنجان مرنج قسم کے تھے۔ اور جن کا انتقال پاکستان آ کر ابھی غالباً دو سال پہلے ہو گیا تھا ان کے چھوٹے بھائی شاہ حنیف حسین صاحب تھے جو مدرسہ دیوبند کے فاضل، جوشیلے، خوبصورت مولوی اور اچھے مقرر تھے۔ ان کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا۔ ان سے چھوٹے حافظ شاہ (قاری) ظریف حسین صاحب تھے جو افسوس ہے کہ ہم سے جدا ہو گئے"۔

بہنوں کی شادی

حضرت فخر العلماء کی بہن قطبی بیگم کی شادی حکیم محمد اسمٰعیل دیوبندی اجمیری کے ساتھ ہوئی جو علوم دینی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے اور حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی کے جن ممتاز شاگردوں کے نام دیئے ہیں۔ ان میں حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ مگر حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا ابتدائی زمانہ بڑی تنگی و ترشی کا تھا۔ یہاں تک کہ خاندانی روایات کے مطابق جب وہ بغرض تلاش ملازمت رام پور گئے اور انہوں نے نواب صاحب رام پور کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا تو دس روپیہ ماہوار پر داروغہ اصطبل کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا۔ جو ایک اہل علم کی حیثیت سے

ان کے شایان شان نہیں تھا۔ لہٰذا آپ وہاں سے دہلی پہنچے۔ دہلی پہنچنے کے بارے میں خاندانی روایات میں تضاد ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپ رام پور سے گنج مرادآباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں انہیں حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے ہدایت کی کہ تم دہلی جاؤ اور وہاں جو تمہیں سب سے پہلے مشورہ ملے اس پر عمل کرو۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ حضرت مولانا رشید احمد کے حکم پر دہلی پہنچے۔ بہرحال دونوں روایت کے مطابق جب آپ دہلی روانہ ہوتے تو انہوں نے راہ میں کانپور میں پہنچے برادر نسبتی حضرت فخرالعلماء کے پاس قیام پذیر ہوئے جو اس زمانہ میں وہاں مقیم تھے اور حضرت نے انہیں طب پڑھنے کا مشورہ دیا اور جب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب نے یہ مشورہ قبول کرلیا تو آپ انہیں اپنے ہم درس حکیم عبدالمجید خاں کے پاس دہلی لے گئے اور حکیم عبدالمجید خاں نے حضرت فخرالعلماء سے کہا کہ آپ ایک شاہزادہ کو میرے پاس لائے ہیں مگر میں صرف اس شرط پر انہیں پڑھاؤں گا کہ یہ میرے پاس قیام کریں۔ حکیم محمد اسمٰعیل نے یہ مشورہ مان لیا اور حکیم عبدالمجید خاں سے طب پڑھنا شروع کی۔ دہلی میں طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حکیم محمد اسمٰعیل صاحب گنگوہی اجمیر شریف گئے اور وہاں طبیب کی حیثیت سے آپ نے بڑی شہرت اور ناموری پائی اور جب وہ اپنے بہی خواہوں کے مشورے پر اجمیر شریف سے بمبئی پہنچے اور وہاں پر آپ نے مطب شروع کیا تو وہاں آپ کو حکیم اجمیری کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ حکیم اسمٰعیل صاحب گنگوہی نے حکیم عبدالمجید خاں سے طب کی تعلیم ۱۳۰۹ھ کے بعد حاصل کی تھی۔ بہرحال بمبئی میں قیام کے دوران آپ اکثر و بیشتر گنگوہ آتے رہتے اور خاندانی روایات کے مطابق سال بہ سال آیا کرتے تھے۔ آپ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے کہ وہ آپ کے مرشد بھی تھے بے حد عقیدت تھی۔ جناب عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید حصہ دوم کے صفحہ ۶۶ا میں ارقام فرمایا کہ "مولوی حکیم محمد اسمٰعیل صاحب گنگوہی نے ایک قصیدہ آپ کی مدح میں لکھا اور چونکہ مور و عنایات ہونے کی وجہ سے بے تکلف زیادہ تھے۔ اس لئے ہر چند حضرت نے سننے سے تنفر کا اظہار فرمایا مگر انہوں نے باصرار سنایا جب ختم کر چکے تو آپ جھکے اور زمین سے خاک اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ بعد انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرے کپڑے خراب ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ "منہ پر مدح کرنے والوں کی یہی جزا ہے میں کیا کروں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ حکیم اسمٰعیل صاحب خوش قسمت تھے کہ وہ اپنے مرشد کے وصال کے وقت بمبئی سے گنگوہ پہنچ گئے اور انہوں نے بھی آپ کے علاج میں بھرپور سعی کی جناب عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے تذکرۃ الرشید حصہ دوم کے صفحہ ۳۰۳ا میں ارقام فرمایا ہے کہ "جمعہ کے دن حکیم محمد اسمٰعیل صاحب اتفاقیہ بمبئی سے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے مرشد روحانی، استاد اور شیخ کے مرض کی یہ حالت دیکھ کر معالجہ شروع کیا۔ حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا مطب بمبئی میں بڑی شہرت اور مقبولیت کا سبب بنا اور اللہ نے ان پر بڑا فضل فرمایا مگر وہ اور ان کے فرزند حکیم محمد سعید جب بھی گنگوہ میں قیام پذیر ہوئے تو کبھی کسی سے فیس یا دواؤں کے پیسے نہیں لئے۔ حضرت فخرالعلماء کی بہن قطبی بیگم زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں۔ اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو حضرت کی والدہ ماجدہ کے حکم پر آپ کے بھائی مولوی مظہر حسین نے اپنی بڑی بیٹی سلمٰی خاتون کی شادی ان سے کردی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور ابھی حال ہی میں ان کا بھی انتقال ہوا ہے حکیم محمد اسمٰعیل صاحب نے بہ حیثیت طبیب اگرچہ بہت نام پایا مگر انہیں علوم دینیہ سے بدستور شغف رہا اور آپ برابر دارالعلوم دیوبند کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے آپ ۱۳۱۳ھ سے لیکر ۱۳۴۱ھ تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔

حضرت فخرالعلماء کی دوسری بہن انبیاء بیگم کی شادی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے ساتھ ہوئی۔ اس شادی کی تفصیلات تذکرۃ الخلیل مصنفہ عاشق الٰہی صاحب میرٹھی سے نقل کی جاتی ہیں۔ تذکرۃ الخلیل کے حوالہ سے حضرت شاہ عبدالرحمٰن کی اولاد اور ان کی رشتہ داریوں کا ذکر تو پہلے ہی ہو چکا ہے اب حضرت مولانا خلیل احمد کی شادی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۹۵ پر رقمطراز ہیں کہ "۱۲۸۹ھ میں جبکہ حضرت قدس سرہ کی عمر

اکیسواں سال شروع تھا اور آپ تعلیم سے فارغ ہو کر ملازم ہو چکے تھے۔ لڑکی والوں کا (اہلی بیگم دختر شاہ حسن عسکری شہید ہمشیرہ شاہ عبدالرحمٰن اور حضرت فخر العلماء برادر بزرگ انبیا بیگم کا) آپ کے والدین پر تقاضہ ہوا کہ عقد نکاح سے فراغ پاؤ۔ چنانچہ تاریخ مقرر ہو گئی اور بارہ چودہ اعزا کی بہت مختصر و سادہ برات چار پانچ بہلیوں میں سوار ہو کر انبیٹھ سے گنگوہ (اس لئے کہ ایک یتیم لڑکی کی دھوم دھام سے شادی کا کون متحمل ہوتا اور دوسرے یہ کہ حضرت قاسم العلوم اور حضرت گنگوہی جیسے شاگرد شادی کے بے جا اسراف اور فضول رسموں پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ تھے) روانہ ہوئی۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی) نے خطبہ نکاح پڑھ کر ڈھائی ہزار روپیہ مہر قرار دیکر اپنے روحانی بیٹے کا عقد کیا۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں (جب حضرت فخر العلماء کو دار العلوم دیوبند سے دستار فضیلت ملی) حق تعالیٰ نے آپکو فرزند عطا کیا جن کا نام محمد ابراہیم رکھا گیا (حضرت فخر العلماء کے حقیقی بھانجے) اور دو نام تاریخی تجویز ہوئے۔ مظفر علی اور ناظر الحق۔ ڈھائی سال بعد شروع سنہ ۱۲۹۳ھ میں لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام منیر النساء رکھا گیا۔ اور ان کے ڈھائی سال بعد ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۵ھ میں دوسری لڑکی پیدا ہوئی مگر بحکم تقدیر ولادت ماں اور بیٹی دونوں کیلئے عالم آخرت کا بلاوا تھی کہ صرف تین دن زندہ رہ کر دل معصومہ نے دنیا کو الوداع کہا اور اسی روز والدہ محترمہ بھی عالم آخرت روانہ ہو گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جوان بیٹی کا انتقال حضرت فخر العلماء کی والدہ کے لئے اور جوان بہن کا انتقال خود حضرت کے لئے بے انتہا صدمہ کا باعث تھا مگر ادھر جوان شوہر کو بھی اپنی جوان بیوی کے انتقال کا بے حد صدمہ تھا۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے لکھا ہے کہ "ادھر نوزائیدہ شیر خوار بچی کی موت طبعاً موجب حزن ضرور ہوئی کہ ثمرۃ الفواد رخصت ہوا مگر قلباً سبب طمانیت ہوئی کہ وسیلہ مغفرت اور ذخیرہ آخرت تھی۔ ادھر مجسم صلاح و اطاعت بی بی کا فراق جس کے ساتھ محبت نے ایک خاص شغف و غلبہ لے لیا تھا دوسرے نوع کے صدمہ کا سبب بنا مگر ساتھ ہی یہ مسرت ملی ہوئی تھی کہ مرض اقتباس میں مرنا بشارت ہے۔ اور وہ نفوس جن کو آج یا کل آخر ایک دن دنیا چھوڑنا ضروری ہے زہے نصیب کہ آخرت کی کٹھن منزل کو بسہولت طے کر جائیں اور ایسے زمانہ میں کہ شہادت کبریٰ کا حصول دشوار ہے شہادت صغریٰ حاصل کرکے اپنے رب سے جا ملیں۔ متواتر و ملحق دو قسم کے انتہائی دو صدموں پر آپ نہایت محزون و مغموم ہوئے اور کیوں نہ ہوتے کہ آخر بشر تھے اور بشر بھی اتبع سنت، رقیق القلب، چنانچہ آپ کی بیاض میں آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر اور بی بی کی تاریخ وفات میں آپ کے تصنیف کئے ہوئے دو شعر ملے جو آپ کے اس رنج و غم اور ساتھ ہی صبر و سکون کا پتہ دیتے ہیں جس کو کوئی دیکھنے والا دیکھ نہ سکا تھا اور وہ یہ ہے تاریخ پنج ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۵ھ والدہ برخوردار محمد ابراہیم عرض اقتباس بجوار رحمت حق پیوست۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اجل کردہ جانان را من فعیل — شدم از دخور الم مضمحل
خلیل از غمش گشت غمگین و گفت — بتاریخ او داغ بر جان دل ۱۲۹۵ھ

ہر چند کہ آپ شاعر نہ تھے اور ان دو اشعار کے سوا بھی آپ کی تصنیف کا کوئی شعر دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا مگر کسی حادثہ کا طبعی اثر بسا اوقات قوت و غلبہ پا کر وہ کام لے لیتا ہے جس کا دوسرے وقت ظہور مشکل ہوتا ہے اس لئے آپ کی ذہن و ذکی طبیعت نے بی بی کی وفات پر یہ اشعار موزوں کرا دیئے جس کا مادہ تاریخ تعمیہ و تخرجہ کے بغیر بلا کمی و بیشی یک مصرف "داغ بر جان دل" ۱۲۹۵ھ شاعرانہ مذاق سے بھی ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد کو اپنی ان مرحومہ بیوی سے اس قدر محبت تھی کہ وہ ہمیشہ حضرت فخر العلماء اور ان کے اہل خاندان کو چاہتے رہے۔ حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا فیض الحسن کے ساتھ تو اتنا تعلق خاطر تھا کہ حضرت سہارنپور رکھ کے نہ صرف انہیں خلافت

عنایت فرمائی بلکہ ہمیشہ انہیں اپنے فرزند کی طرح سمجھا۔ جب بھی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا بمبئی کے لئے سفر ہوتا تھا تو کوشش فرماکر براہ کانپور جایا کرتے تھے اور حضرت مولانا فیض الحسن کو برابر ملاقات کا اور خدمت کا موقع مرحمت فرماتے رہتے تھے اور ان کے حالات برابر باخبر رہتے اور انہیں برابر اپنی دعاؤں میں شامل رکھتے یہاں تک کہ ان کے نواسے کی پیدائش پر بھی اپنی دلی مسرت کا اظہار فرماتے جن کا پتہ ان خطوط سے چلتا ہے جو حضرت مولانا خلیل احمد نے انہیں (مولانا فیض الحسن) سہارن پور اور مدینہ منورہ سے تحریر فرماتے۔ حضرت فخر العلماء کے حقیقی پوتے جناب وحید الحسن اور مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی کے بڑے داماد جناب سید ذوالفقار حسین رضوی فرماتے ہیں کہ انہوں نے کانپور ریلوے اسٹیشن پر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی زیارت کی ہے اور انہوں نے بذات خود اس محبت اور خلوص کا مظاہرہ دیکھا ہے جو حضرت سہارن پوری کو اپنی اہلیہ مرحومہ کے حقیقی بھتیجوں سے تھا۔ خود مولانا عاشق الٰہی نے تذکرۃ الخلیل میں تحریر فرمایا ہے کہ "حضرت کو اپنی مرحومہ اہل کے انتقال کے بعد ان کے اعزا کی دلداری کا بہت خیال رہتا تھا اور آپ جب بھی کبھی گنگوہ حاضر رہتے تو اپنی خوشدامن کی خدمت میں ضرور جایا کرتے تھے

مولوی فاروق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت کی خوشدامن میرے والد مولانا صدیق احمد کی حقیقی خالہ تھیں مگر مجھے علم نہ تھا۔ کیونکہ حضرت کی اہلیہ کے انتقال پر میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا ایک مرتبہ لڑکپن میں مجھے حضرت کے ساتھ گنگوہ جانے کا اتفاق ہوا۔ تو حضرت اپنی خوشدامن کے پاس تشریف لے گئے۔ واپسی میں مجھ سے دریافت فرمایا کہ میاں تمہاری دادی صاحبہ نے مجھ سے پردہ کیوں نہیں کیا۔ میں چپ ہو رہا۔ تب حضرت نے فرمایا کہ ابراہیم کی والدہ ان کی بیٹی تھیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے درمیان جو خط وکتابت ہوتی تھی اس میں بھی اکثر حضرت فخر العلماء کے خاندان کا تذکرہ ہوتا تھا۔ مکاتیب رشیدیہ کے مکتوب نمبر ۲۴ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے مولانا خلیل احمد صاحب کو مطلع کیا کہ "مولوی فخر الحسن صاحب کے یہاں سب خیریت ہے" اس ایک جملہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے اپنے خط میں جو انہوں نے اپنے مرشد کو لکھا تھا یہ ضرور پوچھا ہوگا کہ حضرت مولانا فخر الحسن کے گھر کے کیا حالات ہیں جن کے جواب میں مولانا گنگوہی نے اپنے روحانی فرزند کو لکھا کہ مولوی فخر الحسن صاحب کے یہاں سب طرح خیریت ہے۔ حضرت مولانا خلیل احمد اپنی ان اہل کے ہمراہ اکثر وبیشتر گنگوہ میں قیام فرماتے تھے اور انہی ایام میں جب وہ گنگوہ میں ہوتے انہیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا۔ تذکرۃ الرشید میں جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات ہے "بیعت حضرت مولانا خلیل احمد انبیٹھوی" کے تحت جلد اول کے صفحہ ۲۱۸ میں خود مولانا خلیل احمد نے تحریر کیا ہے کہ "اثنائے طالب علمی میں میری شادی گنگوہ میں ہوئی اور اسی وجہ سے مجھے گنگوہ میں قیام کا زیادہ اتفاق ہوا۔ اور قیام گنگوہ کے زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں اکثر حاضر رہتا تھا مجھ کو خوب یاد ہے کہ مجھے اس وقت آفتاب کی طرح محسوس ہوتا تھا کہ اس احاطہ مبارکہ میں ایک نورانیت اور قلب میں بشاشت اور طمانیت محسوس ہوتی تھی۔

حضرت فخر العلماء کی تیسری بہن کا نام اولیا بیگم تھا جن کی انبیٹھہ میں سجادہ نشین شاہ محمد صادق صاحب سے شادی ہوئی تھی اور جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

علوم قاسمی کی اشاعت

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء نے اپنے شفیق استاد کی رحلت کے بعد اپنی زندگی کا بیشتر حصہ حضرت قاسم العلوم کی سوانح اور علوم قاسمی کی اشاعت میں گزارا اور ان کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اکابرین دار العلوم اور دیوبندی جماعت کو احسان مند ہونا چاہیئے مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی سوانح کا کام سب سے پہلے حضرت فخر العلماء نے کیا حالانکہ اکابرین دیوبند نے یہ کام حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے سپرد

کیا تھا۔ مولانا محمد طیب صاحب نے سوانح قاسمی (مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی) کے مقدمہ میں انکشاف فرمایا کہ حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے فوراً بعد حضرت مولانا محمد احمد صاحب نے سوانح قاسمی کی ترتیب کا کام حضرت شیخ الہند کے سپرد فرمایا۔ مولانا طیب کے الفاظ میں "حضرت والد مرحوم نے (مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) فرمایا کہ میں نے حضرت نانوتوی کے وصال کے بعد بڑے مولانا (شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) سے عرض کیا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ آپ دو چیزیں مرتب فرما دیں۔ ایک قرآن شریف کا اردو ترجمہ اور اس کے مختصر تفسیری فوائد اور دوسرے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات۔ مولانا نے بڑی امنگ اور آرزو سے فرمایا کہ میں انشاء اللہ ضرور ان دونوں باتوں کی تکمیل کروں گا۔ اس پر والد مرحوم نے فرمایا کہ "پھر میں وہ تمام مواد آپ کی خدمت میں پیش کردوں جو میرے پاس موجود ہے۔ فرمایا کہ ضرور" اسی پر میں نے ایک بہت بڑا پلندہ جس میں حضرت کے ملفوظات واقعات علوم، مکتوبات اور حالات کا ایک ذخیرہ بندھا ہوا تھا۔ لاکر پیش کر دیا۔ مولانا اس سے بہت مسرور ہوئے۔ اور فرمایا کہ اب سوانح مرتب کر دوں گا۔ اور ان قلمی یادداشتوں سے میرا ذہن ان سینکڑوں واقعات کی طرف منتقل ہوگا جو میرے ذہن اور سینہ کی امانت ہیں۔ اب انشاء اللہ وہ سب سینہ سے سفینہ میں آجائیں گے۔ حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ مولانا اس پلندہ کو لیکر مردانہ بیٹھک کی الماری میں رکھ کر خوش خوش گھر تشریف لے گئے۔ شاید ایک گھنٹہ بعد ہی جب اس ذخیرہ کو لینے کے لئے باہر تشریف لائے اور الماری کھولی تو وہ پلندہ غائب تھا۔ پھر ہر چند اسے تلاش کیا اور خاک تک چھان ماری مگر پلندہ نہ ملا۔ فرمایا کہ حضرت مولانا اور ہم سب پر اس درجہ اس کا صدمہ پڑا کہ جیسے حضرت نانوتوی کی وفات آج ہوئی ہے اور عرصہ دراز تک یہ صدمہ اور حیرت ہم پر چھائی رہی بالآخر صبر کرکے بیٹھ رہے۔" (صفحہ ۱۰) حضرت شیخ الہند نے آخرکار کلام پاک کا اردو ترجمہ مع تفسیر مرتب فرما کر حضرت مولانا محمد احمد صاحب نانوتوی کی ایک آرزو تو پوری کر دی مگر ان کی دوسری خواہش کہ وہ حضرت نانوتوی کی سوانح حیات مرتب کریں پوری نہ کر سکے۔ حالانکہ ملفوظات اور تحریری یادداشتوں کے بغیر بھی وہ یہ کام انجام دے سکتے تھے اور انہیں اس کام کے لئے ۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا طویل وقت بھی ملا تھا۔

حضرت فخر العلماء کی مرتب کردہ سوانح قاسمی

مگر حضرت فخر العلماء نے جن سے نہ مولانا محمد احمد نانوتوی نے درخواست کی اور جنھیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ملفوظات اور تحریری یادداشتوں کا پلندہ بھی پیش نہیں کیا گیا اور جن کو تاریخ دارالعلوم دیوبند میں اکابرین کی صف میں شامل کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی گئی انہوں نے از خود یہ اہم ذمہ داری قبول فرمائی۔ حضرت فخر العلماء نے اپنے رسالہ انتصار الاسلام کے دیباچہ میں اس سوانح قاسمی کا جو انہوں نے مرتب فرمائی ہے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے "بندہ نے جناب مولانا مرحوم کی سوانح عمری لکھی ہے اور عجائب واقعات گزرے ہیں اور جو جو کار نمایاں مولانا مرحوم نے کئے ہیں ان کا مفصل حال بیان کیا ہے اور بہت سے متفرق واقعات علمی و عملی جن سے جناب مولانا کا یکتائے روزگار ہونا علوم ظاہری و باطنی میں ظاہر ہوتا ہے مشرح مرقوم کئے ہیں اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ جناب مولانا مغفور کیا کیا چیزیں یادگار چھوڑ گئے ہیں اور غرض اس جمع تفصیل سے یہ ہے کہ شاید کوئی کمر ہمت باندھے اور اپنے مقدور کے موافق ایسے امر کے اجراء میں کوشش کرے اور مضامین عالیہ سے خود نفع اٹھائے اور اوروں کو پہنچائے۔ یہ سوانح عمری لائق دید ہے شاید ایسی عجیب چیز بھی اس زمانہ میں کوئی اور ہو۔ یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے اس لئے بالفعل اس کا شائع ہونا ذرا دشوار ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو اس کا بھی دار آجائے گا" اس واضح اعلان کی موجودگی میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں میں کسی نے اپنے استاد گرامی کی سوانح ترتیب دینے کی کوشش

منہیں کی لیکن افسوس کہ یہ سوانح شائع نہ ہوسکی لیکن اس کی ذمہ داری فخر العلماء پر نہیں ہے۔ قاری محمد طیب صاحب نے سوانح قاسمی مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے مقدمہ میں اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے اس سوانح کا بھی ذکر کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں: "حضرت والد مرحوم ہی نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی ایک مفصل سوانح جس میں کثرت سے علوم ومعارف اور مختلف علمی حقائق کو اسباب حدوث اور واقعات کے ساتھ بیان کیا گیا تھا مولانا فخر الحسن گنگوہی (تلمیذ خاص حضرت نانوتوی قدس سرہ) نے مرتب کی جو تقریباً ایک ہزار صفحات تک پہنچ چکی تھی اور سلسلہ آگے بھی چلا۔ یہ گویا حضرت کی علمی سوانح تھی جس میں سیرت وکردار پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ اس کا تذکرہ مولانا فخر الحسن صاحب کے بعض اعلانات میں بھی ملتا ہے۔ جس کی طباعت کا وعدہ بھی کتابت و طباعت اور کاغذ کی سہولت میسر آجانے پر کیا تھا۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ مولانا فخر الحسن اپنی خانگی مجبوریوں سے گنگوہ کی سکونت ترک فرما کر (جس کا ذکر اپنے مقام پر ہوچکا ہے) کانپور منتقل ہوگئے۔ مکان کا ایک حصہ اپنی کتابوں کے لئے مخصوص کرلیا۔ اسی میں یہ سب قلمی یادداشتیں بھی رکھ دیں۔ اس کتب خانہ کی ترتیب کے چند دن بعد ہی ان کے کتب خانہ کو آگ لگ گئی جس سے سارا کتب خانہ جل کر راکھ ہوگیا اور اسی میں وہ سوانح کا مسودہ بھی ضائع ہوگیا۔" مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی کے حصہ دوئم میں لکھا ہے کہ "کوئی شبہ نہیں کہ مولانا فخر الحسن مرحوم کی مرتب کی ہوئی یہ سوانح عمری اگرچہ جل کر ناپید ہوچکی ہے لیکن ان کی اس کتاب کی نوعیت اور قدر وقیمت کا سرسری اندازہ ان کے اس تحریری بیان سے ہوتا ہے۔ بلکہ چاہا جائے تو ان کی مرتبہ سوانح عمری کے مشتملات یعنی مضامین کی اجمالی فہرست ان کے اسی بیان کو ہم قرار دے سکتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ساری معلومات جن کے اندراج کی اطلاع اس کتاب کے متعلق دی گئی ہے یہ حلقہ قاسمی کے ایک ایسے رکن رکین کی فراہم کردہ معلومات ہیں جو علاوہ زمانی معیت اور مکانی قرب کے سیدنا امام الکبیر کے ممتاز ترین تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کو براہ راست خود حضرت والا سے ان مضامین عالیہ کے سمجھنے کا موقع ملا تھا جن پر اس حکمت قاسمی کی بنیاد قائم ہے۔ گو اپنا تعارف کراتے ہوئے اسی موقع پر مولانا فخر الحسن صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "بندہ کا بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ سب میں ادنیٰ ہے لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے" لیکن سوانح نگاری کی اس مہم میں غیر معمولی کامیابی جوان کو میسر آئی تھی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے باایں انکسار و کم نفسی جوش مسرت میں بے ساختہ یہ الفاظ ان کے قلم سے چھلک پڑے ہیں۔ ارقام فرماتے ہیں کہ "یہ سوانح عمری لائق دید ہے شاید ایسی عجیب چیز کبھی اس زمانہ میں کوئی اور رہو۔ گویا یہی ہوا کہ جیسے صاحب سوانح کی شخصیت اپنے عہد کی ایک عجیب وغریب بے مثال ہستی تھی اسی طرح یہ سوانح بھی مرتب کتاب کے نزدیک اپنے زمانہ کے عجائب ونوادر ہی میں شمار ہونے کی مستحق تھی۔ سچ پوچھئے تو جب سے مولانا فخر الحسن مرحوم کے مندرجہ بالا الفاظ میری نظر سے گزرے۔ ان کی کتاب اور ان کی غیر معمولی محنت ومشقت کی بربادی پر زیادہ اور بہت زیادہ افسوس ہورہا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اپنی اس کتاب میں انہوں نے کیا کچھ لکھا ہوگا۔ انہی کے بیان سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مصنف امام (مولانا محمد یعقوب صاحب) کی مرتبہ سوانح عمری ضخامت کے لحاظ سے جیسے ایک کتابچہ ہے۔ اس کے برعکس مولانا فخر الحسن کی لکھی ہوئی سوانح عمری مستقل کتاب کا قالب اختیار کرچکی تھی۔ ان کے الفاظ ہیں کہ "یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے" اور گو ضخامت تو نہیں بتائی گئی لیکن آگے انہوں نے جو یہ لکھا ہے کہ "اسی لئے بالفعل شائع ہونا اس کا ذرا دشوار ہے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفحات اس کتاب میں کافی ہوں گے۔ مگر اب اس پر بحث ہی فضول ہے۔ البتہ مولانا فخر الحسن مرحوم ہی کے مذکورہ بیان سے ان کی کتاب کے مضامین کی جو اجمالی فہرست ہمارے سامنے آگئی ہے آئندہ سیدنا امام الکبیر کے سوانح نگاروں کیلئے روشنی

کے مینار کا کام دے سکتی ہے۔ خصوصاً ان کے بیان کا یہ آخری جز و یعنی" جناب مولانا مذکور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ مولانا فخر الحسن نور اللہ مرقدہ کی فہرست مضامین کے اس جزو کی تعبیر خاکسار نے مآثر قاسمی سے کی ہے اور اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سوانح قاسمی کی مطبوعہ اور شائع شدہ دو جلدوں کی تکمیل کے بعد بھی کام تشنۂ تکمیل ہے (سوانح قاسمی جلد سوم۔ صفحہ ۱۸۳ اور ۱۸۲، ۱۸۱) جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۳۲، ۴۳۱ میں حضرت مولانا فخر الحسن کی "سوانح قاسمی" کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ "یہ سب کارنامے مولانا فخر الحسن صاحب کے ہیں جنہوں نے اپنے استاد کی تقریروں، مناظروں کو مرتب کیا اور چھپوانے کی کوششیں کیں۔ تمام شاگردوں میں (اکابرین دار العلوم کہ منشا اور تحریک اور تعاون کے بغیر) حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو انہوں نے ہی اجاگر کرنے کی کوشش کی اور حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد بہترین سوانح عمری لکھی!" قاری محمد طیب صاحب نے سوانح قاسمی کے مقدمہ میں اور جناب مناظر احسن گیلانی کے سوانح قاسمی جلد سوم کے صفحات ۱۸۳ تا ۱۸۱ میں حضرت فخر العلماء کی سوانح کو جلنے اور ضائع ہونے کا جو ذکر کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ حضرت فخر العلماء نے یہ تصنیف اپنی وفات سے بہت قبل بلکہ حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے فوراً بعد لکھی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے انتصار الاسلام کی اشاعت کے موقع پر ارقام فرمایا گویا سنہ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۱۵ھ یا سنہ ۱۸۹۷ء میں ہوا جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا اور حضرت فخر العلماء کے کتب خانہ میں آگ لگنے کا واقعہ سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ اس کے مطلب یہ ہوتے ہیں کہ یہ مسودہ کتاب ۵۱ سال تک بغیر اشاعت کے پڑا رہا۔ پھر یہ کہ حضرت فخر العلماء کے خاندان میں ان کی رحلت کے بعد بھی علم رہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں یعنی حضرت مولانا حافظ نور الحسن گنگوہی اور حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی مجاز طریقت حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور شاگرد رشید حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنے پڑھنے میں گزارا۔ حضرت فخر العلماء کے ان صاحبزادوں کے مسلم الثبوت، اصول الشاشی اور حسامی پر حواشی بھی شائع ہوئے اور یہ کام حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا فیض الحسن نے حضرت والا کے مکان میں مطبع سعیدی قائم کر کے ایک اور ادارہ تصنیف و تالیف و تشہیر بنام مخزن العلوم قائم کر کے بطریق احسن انجام دیا۔ ان ہی صاحبزادے نے حضرت فخر العلماء کی مشہور تصنیف حاشیہ ابو داؤد اور سنن ابن ماجہ کی طباعت کا بندوبست کیا۔ اس لئے یہ تصور کرنا کہ [illegible] علم میں ایسی شہرہ آفاق کتاب جس کے مسودہ کی تشہیر سنہ ۱۹۸۰ء کے قریب خود حضرت فخر العلماء نے فرمائی اور بقول قاری محمد طیب اس بارے میں حضرت فخر العلماء نے کئی اعلانات بھی فرماتے! اور ان میں سوانح کی ضخامت کا ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہونا بھی بتایا۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے ان کے صاحبزادوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ پھر یہ کہ مولانا فیض الحسن کتب خانہ میں آگ لگنے کے واقعات کے بعد ۱۲ سال زندہ رہے اور حضرت مولانا نور الحسن تیرہ چودہ سال اور ان حضرات نے اپنے متعلقین سے اتنے بڑے علمی اور ادبی حادثہ کا ذکر نہیں کیا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر ایک بات اور ہے سنہ ۱۹۳۱ء میں جب حضرت فخر العلماء کا کتب خانہ جلا۔ اور حضرت مولانا فیض الحسن کا سارا اسباب لٹا اور حضرت مولانا اور ان کا خاندان صرف ان کپڑوں سے جو ان کے جسم پر تھے بچ کر چھٹانی محال سے ٹپکا پور گیا تو اس موقع پر حضرت کے داماد اور مولوی مظہر حسین کے فرزند ثانی جناب قاری حافظ ظریف حسین بھی کانپور میں موجود تھے۔ اور وہ سنہ ۱۹۶۵ء تک حیات رہے۔ انہوں نے بھی اس عظیم کتاب کے جلنے کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ ان امور سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ حضرت فخر العلماء کا کتب خانہ جو ان کی رحلت کے بعد ان کے فرزند ثانی کے حصہ میں آیا۔ اس میں یہ یادگار مسودہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ اسے خود حضرت فخر العلماء کی زندگی میں دیوبند کے اکابرین میں سے کسی ایک کو بغرض اشاعت بھیج دیا گیا تھا۔ جس کا علم حضرت والا کی اولاد کو نہیں تھا۔ سوانح مخطوطہ کے مسودہ کو پہلے حضرت مولانا فخر الحسن کا مسودہ سمجھنا اور بعد میں اسے

منشی فضل حق کے نام سے موسوم کرنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید حضرت فخر العلماء نے یہ مسودہ ۱۳۱۱ھ یا ۱۳۱۲ھ میں ان کے طلب کرنے پر منشی صاحب کو بھیجدیا جو اور ۱۳۱۲ھ میں انکے جبری استعفا سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کی اشاعت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا ہو اور بعد میں وقت گزرنے کے بعد حضرت فخر العلماء کا مسودہ کتاب خراب وخستہ حالت میں جب برآمد ہوا تو اسے منشی فضل حق کی تصنیف سمجھ لیا گیا ہو۔ پھر اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ قاری محمد طیب صاحب کے بقول "ابھی چند سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے جناب قاری عتیق احمد صاحب رکن دار العلوم کے پاس سے حضرت کی سوانح کا ایک ناقص مسودہ من حیث لا یحتسب دستیاب ہوا جو صفحہ ۱ سے ۵۶ تک مسلسل ہے اور درمیان کے کچھ منتشر اوراق مسودہ کے بیچ میں سے نکلے اس میں فہرست مضامین کے اوراق مکمل ملے۔ جن میں اہم عنوانات اصولی قائم کئے گئے ہیں اور ہر اصولی عنوان کے نیچے ضمنی عنوانات کی کافی تعداد ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانح سوانح کے اصول پر نہایت مکمل طریقہ سے مرتب کی گئی ہے سن ولادت لے کر سن وفات تک مکمل حالات بیان ہوتے ہیں جیسا کہ عنوانات سے واضح ہوتا ہے۔ حتٰی کہ وفات کے عنوان کے نیچے مرض وفات تک کی توضیح، نوعیت علاج، معالجین کی فہرست، انداز علاج، حالات نزع و وفات۔ بعد وفات مبشرات ومقامات، نماز جنازہ کی تفصیلی کیفیت، جنازہ پر غیر معمولی ہجوم کے واقعات تعزیت کنندوں کا مہینوں ہجوم، مراثی اور قصائد تعزیت وتواریخ، اخبارات میں مضامین تعزیت وغیرہ اتنے ضمنی عنوانات صرف ایک عنوان وفات کے نیچے درج ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر مکمل صورت میں یہ سوانح مرتب ہوئی ہوگی۔ درمیانی اوراق میں بعض صفحات پر ۱۵۸ کا ہندسہ پڑا ہوا ہے۔ اور بعض پر اس سے بھی آگے کا جس سے واضح ہے کہ اس سوانح کی ضخامت بھی کافی ہوگی۔ سوانح نگار عموماً مشاہدات بیان کرتا ہے۔ اکثر واقعات میں اپنی شرکت بھی ظاہر کرتا ہے حتٰی کہ خانگی معاملات درج کرتے ہوئے ان میں بھی معتمدانہ دخل ظاہر کرتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ سوانح نگار حضرت صاحب سوانح کے مزاج میں دخیل اور بار سوخ فرد ہے۔ مگر افسوس کہ سوانح کا اول وآخر ندارد ہے جس سے مؤلف کا پتہ چل سکتا مگر اس میں بھی حیرت ناک بات یہ ہے کہ صفحہ ۷۶ سے آگے جہاں سے عنوانات فہرست میں جہاد اور اجتماعی خدمات کا ذکر ہے۔ وہیں سے مسودات غائب ہیں یعنی ذاتی سیرت تو ۵۱ صفحات تک فی الجملہ آگئی ہے۔ مگر خدمات ومعاملات کا حصہ غائب ہے۔ اس حصہ کے منتشر اور پھٹے ہوئے کچھ اوراق ملے ہیں جن میں حضرت کا جنگ روم وروس کے سلسلہ میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنا۔ خلافت اسلامیہ ترکی سے مسلمانان ہند کو وابستہ رکھنے کی مساعی دار العلوم کے احاطہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھلانا۔ دار العلوم میں محکمہ قضا قائم کر کے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قاضی بنانا اور مسلمانوں کے معاملات کو شرعی اصول پر طے کرنے کی صورتیں پیدا کرنا وغیرہ مذکور ہے۔ مگر ناقص انداز میں، کوئی صفحہ ندارد ہے، کوئی پھٹا ہوا ہے کوئی ناقابل انتفاع ہے بمشکل آئی گلاس سے کچھ پڑھا جاتا ہے (صفحہ ۱۱ - سوانح قاسمی) آپ اس طویل اقتباس کو پڑھیے اور پھر حضرت فخر العلماء کے اس اعلان کو جسے انتصار الاسلام سے اوپر نقل کیا گیا ہے اور ان معروضات پر توجہ دیں جن کا ذکر آگے میں چلنے کے سلسلہ میں کیا گیا تو کیا یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ یہ مسودہ حضرت فخر العلماء کا مرتب کردہ ہے۔ پھر یہ کہ اس مسودہ کے جو اقتباسات مختلف کتابوں اور رسائل میں پیش کئے گئے ہیں ان سے اور حضرت فخر العلماء کے انداز تحریر سے جو انتصار الاسلام، تقریر دلپذیر اور مباحثہ شاہجہانپور میں نظر آتا ہے سے موازنہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت کا انداز ہو سکتا ہے۔ اور ان سب سے الگ جناب انوار الحسن شیرکوٹی کا انوار قاسمی کے صفحہ ۳۲۴ میں یہ کہنا کہ "مولانا فخر الحسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب کی جو سوانح عمری لکھنے کا اوپر ذکر کیا ہے افسوس چند اوراق کے سوا وہ ضائع ہو گئی۔" اور پھر ان ہی کا یہ بیان جو

تذکرہ اد بائے دار العلوم دیوبند کی قسط نمبر ۱۵ میں جو رسالہ دار العلوم کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی ہے کہ "حضرت مولانا کی سوانح عمری آپ کے ارشد تلامذہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی مرحوم نے لکھی تھی جبکہ موصوف نے انتظار اسلام میں حوالہ دیا ہے لیکن وہ کہاں ہے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے مدتیں گزریں جب دیکھی تھی۔ بعض حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دار العلوم دیوبند کے خزانہ میں تبرکات کے ساتھ منسلک ہے"۔ کیا ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اکابرین دیوبند کو چاہیئے کہ وہ کم از کم اتنا تو تسلیم کریں کہ حضرت فخر العلماء کا مسودہ سوانح کسی اور کی تصنیف نہیں ہے۔

حضرت قاسم العلوم کی تصانیف

حضرت قاسم العلوم کی تقریروں، تحریروں، اشعار اور خطوط پر مشتمل تصانیف کی کل تعداد اسم ہے جن کی اپنی جگہ پر تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ ان کا ماخذ الا لیل الحکم، تقریر دل پذیر، جناب ایوب قادری کی کتاب "محمد احسن نانوتوی" پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی کی "انوار قاسمی" اور مولانا سید عبد الرؤف عالی کا مضمون "حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کی تصانیف" ہے۔ ان میں سے ۲۳ تصانیف ان کے خطوط پر مشتمل ہیں۔ ان تصانیف میں ۱۰ تصانیف ایسی ہیں کہ جن کا املا حضرت فخر العلماء کے ہاتھ کا ہے یا ان اشعار اور خطوط پر مشتمل ہیں جو ان سے متعلق ہیں۔ گویا حضرت قاسم العلوم کے علوم اور خیالات کی بنیادی کتابوں کی اشاعت حضرت فخر العلماء کی کوششوں اور کاوشوں کی مرہون منت ہے اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس پر شاگرد رشید کو جتنا فخر ہو وہ کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خانوادہ قاسمی کے اہم ستون مولانا قاری محمد طیب انہیں تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنے استاد مکرم کا جانشین تسلیم کرتے ہیں اور ان تصانیف ہی پر کیوں اکتفا کیا جائے، حضرت قاسم العلوم کی ان تصانیف میں بھی جو ان کے مختلف خطوط پر مشتمل ہیں جا بجا حضرت فخر العلماء کا تذکرہ موجود ہے۔ بلکہ ان کے ایک خط سے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت فخر العلماء کی دہلی میں موجودگی کا سبب سنن ابن ماجہ کی تصحیح ہے۔ یہ حضرت فخر العلماء کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر آگے چل کر تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ حضرت قاسم العلوم کی سوانح سے متعلق تمام کتابوں میں ان کا جا بجا تذکرہ موجود ہے جن کا اپنے مقام پر ذکر ہو چکا ہے۔

جناب ایوب قادری نے اپنی مشہور تصنیف محمد احسن نانوتوی کے صفحہ ۲۲۹ تا ۲۳۰ میں حضرت قاسم العلوم کی تصانیف کا مختصر پس منظر بیان کیا ہے۔

(۱) تحشیہ بخاری شریف (ہندی) صحیح بخاری کے آخری حصہ کا تحشیہ کیا ہے اصل میں صحیح بخاری کے حاشیہ کا کام حضرت مولانا احمد علی سہارن پوری نے شروع کیا تھا مگر وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے اور اس کے پانچ چھ سپارے انہوں نے مولانا محمد قاسم صاحب کے سپرد کر دیئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے حضرت قاسم العلوم کی اس اہم دینی خدمت کا تذکرہ اپنی تصنیف سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی میں ان الفاظ میں کیا ہے "کہ مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے اور بہتر کیا ہو سکتا ہے (صفحہ ۶۰)

(۲) آب حیات۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات روحانی و جسمانی کی علمی تحقیق اور فدک کے بارے میں اعتراضات کے مدلل جواب دیئے۔ جناب عبدالاحد نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات جسمانی و روحانی موافق مضمون حدیث شریف ان اللہ دم علی الارض اس غرض سے ثابت فرمائی ہے کہ فرقہ روافض کا جو شبہ میراث و رباب ہے۔ رفع ہو جائے۔ اصل استدلال آیۃ کریمہ النبی اولی بالمومنین من انفسہم سے فرمایا ہے۔ مگر در ضمن تمہید و مقدمات عجائب تحقیقات مسائل عقلیہ نقلیہ بیان فرماتے ہیں اور ان آیات و احادیث میں جو بظاہر اس دعوے کے متعارض معلوم ہوتے عجیب تطبیق بیان فرمائی ہے۔

(۳) مصباح التراویح، مولوی احمد حسن امروہوی نے آخر رمضان ۱۲۸۸ھ میں تراویح کے بارے میں ایک استفسار کیا تھا اس کے جواب میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے رمضان کے آخری عشرہ میں یہ کتاب لکھ دی۔

(۴) ہدایت الشیعہ۔ یہ ایک ضخیم تالیف ہے جس میں مولانا نانوتوی نے شیعوں کے اعتراضات کے مفصل اور مدلل جواب دیئے ہیں۔ جناب عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی نے لکھا ہے کہ "آپ نے شیعوں کے اعتراضات کا جواب اس خوبی سے دیا ہے کہ دیکھنے والوں کی عقل دنگ ہے۔ دلائل عقلی و نقلی۔ دونوں طرح سے ان کو ساکت کر دیا ہے۔ دوران تقریر میں جو مثالیں اور نظیریں اور تحقیقات علمی پیش کی ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہیں سلسلہ نطق ایسا دراز ہے کہ گویا ایک دریا امنڈ رہا ہے۔ بات میں بات نکتہ میں نکتہ پیدا کرنا آپ ہی کا کام ہے۔

(۵) الدلیل المحکم علی قراۃ الفاتحہ للموتم: قراۃ فاتحہ خلف امام کے بحث پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے ہمارے پیش نظر عالی کتب خانہ لاہور مطبوعہ ۱۹۵۸ء کا نسخہ ہے اس کے آخر میں ایک خط میاں جی ٹھیلے کے نام شامل ہے جس میں تقلید اور آٹھ رکعت تراویح کا بیان ہے۔

(۶) [illegible] اربعین [illegible] شیعوں کے اعتراضات کا جواب ہے۔ جناب عبدالاحد مالک مطبع نے لکھا ہے کہ [illegible] اربعین کامل [illegible] اس رسالہ میں تفصیلی طور شیعوں کا جواب ہے۔

(۷) اسرار قرآنی۔ جناب عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ فارسی میں ہے اور اس میں چند مکاتیب و بعض آیات قرآنی کی تفسیر میں لکھی گئی ہیں۔ جناب ایوب قادری نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ پانچ مکتوبات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ جن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بعض مسائل کے متعلق استفسارات کئے گئے ہیں۔ پہلے تین خط مولانا محمد صدیق مراد آبادی، چوتھا مولوی احمد حسن امروہوی اور پانچواں خط مرزا عبدالقادر مراد آبادی کے نام ہیں۔

(۸) تصفیۃ العقائد۔ جناب عبدالاحد نے لکھا ہے کہ "سید احمد خان کے عقائد کی تشریح اور اصلاح و تنقیح نہایت عجب طور سے کی گئی ہے"۔ جناب ایوب قادری نے لکھا ہے کہ "مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور سرسید احمد خان بہادر کے درمیان عقائد اسلام سے متعلق ایک مراسلت پیر جی محمد عارف انبیٹھوی کے ذریعہ ہوئی۔ اس خط و کتابت کو مولوی محمد حیات میرٹھ نے تصفیۃ العقائد کے نام سے

چھاپ دیا ہے۔ پہلا خط پیر جی محمد عارف کے نام اور دوسرا خط سرسید احمد خان کے نام ہے۔ سرسید احمد خان کا خط بنام پیر جی محمد عارف بھی اس میں شامل ہیں۔

(۹) تحذیر الناس: مولانا محمد احسن نانوتوی نے ایک استفتا بریلی سے اثر ابن عباس کے بارے میں بھیجا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس کی صحت اور تائید میں جواب لکھا اور اس کا نام تحذیر الناس من انکار اثر ابن عباس رکھا۔ یہ رسالہ سب سے پہلے ۱۲۹۱ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے باہتمام مولوی محمد منیر نانوتوی شائع ہوا۔

(۱۰) گفتگوئے مذہبی، ۸؍ مئی ۱۸۷۶ء کو جو میلہ شاہ جہاں پور کے ضلع میں بمقام چاندا پور منعقد ہوا تھا اور اس میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جو تقریر فرمائی تھی وہ تقریر مختصری روداد کے ساتھ اس کتاب میں شامل ہے۔ جناب عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی نے تحریر فرمایا ہے کہ اس میں وہ مباحثے ہیں جو مولانا نے غیر مذہب والوں سے کئے۔

(۱۱) حجۃ الاسلام میلہ خداشناس منعقدہ چاندا پور کے لئے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے ایک تقریر لکھی۔ مولوی فخر الحسن گنگوہی نے اس کا نام حجۃ الاسلام رکھا۔ یہ رسالہ حقانیت اسلام پر ایک مدلل بیان ہے۔ جناب عبدالاحد نے لکھا ہے کہ اس میں کلمہ طیبہ کی تحقیق ہے۔ توحید و رسالت اور حضرت صلعم کی خاتمیت و دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی فوقیت بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلعم کا کمالات علمی و عملی میں تمام انبیاء سے فائق ہونا بہ دلائل عقلیہ ثابت کیا ہے۔

(۱۲) مباحثہ شاہ جہاں پور۔ ۱۹ و ۲۰؍ مارچ ۱۸۷۷ء میں دوبارہ میلہ خداشناسی ضلع شاہ جہاں پور میں منعقد ہوا اس کی تفصیل اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی تقریر اس میں شامل ہے۔ جناب عبدالاحد نے لکھا ہے کہ بمقام شاہ جہاں پور ایک میلہ خداشناسی بہ انتظام گورنمنٹ قائم ہوا تھا۔ اور بڑے بڑے نامی پادری اس میں شریک ہوئے تھے۔ یہ واقعہ دو دفعہ دو سال میں واقع ہوا۔ اس میلہ میں علاوہ پادریوں کے بڑے بڑے مشہور پنڈت بھی شریک تھے۔ حضرت مولانا (جناب نانوتوی) بھی بہ طلب وہاں کے مسلمانوں کے تشریف لے گئے تھے۔ یہ مباحثہ دو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ ہر سال کا علیحدہ تذکرہ ہے۔

(۱۳) انتصار اسلام۔ جناب ایوب قادری نے لکھا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب جب رڑکی تشریف لے گئے تو انہوں نے تین دن تک پنڈت دیانند جی کے اعتراضات کے جوابات دیئے تھے۔ جن کو ان تقاریر کو منضبط تحریر میں لے آئے۔ مولوی فخر الحسن صاحب نے اس کا نام انتصار اسلام رکھا۔ اس رسالہ میں پنڈت جی کے اعتراضات، شیطان، جن اور فرشتوں کے وجود خارجی کا خاص طور پر جواب دیا گیا۔ اور اس سلسلہ سرسید احمد خان کے اوہام کا بھی رد کیا گیا ہے۔

(۱۴) قبلہ نما۔ جناب ایوب قادری نے تحریر فرمایا ہے کہ پنڈت دیانند جی کا استقبال قبلہ پر اعتراض تھا مولانا نانوتوی نے استقبال قبلہ اور بت پرستی کا فرق اور حقیقت قبلہ کو بیان کیا ہے۔ دراصل یہ انتصار الاسلام کا دوسرا حصہ ہے۔

(۱۵) جواب ترکی بہ ترکی میرٹھ میں آریوں نے مذہب اسلام پر جو تحریری اور تقریری اعتراضات کئے تھے ان کا جواب ہے۔ اس کو مولوی عبدالعلی نے مرتب کیا ہے۔ مگر اس کے خیالات و مضامین مولوی محمد قاسم نانوتوی کے ہیں۔ مولانا محمد یعقوب نے سوانح عمری مولوی محمد قاسم نانوتوی میں تحریر فرمایا ہے کہ "پنڈت دیانند کبھی پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے دعوے تھے۔ واقعی جس کو شرم نہ ہو جو چاہے کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحب بھی ان دنوں میرٹھ کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہاں سے بعض صاحبوں نے بلانے کے بارے میں تحریک کی۔ غرض مولانا میں ہر چند مرض کے حملوں اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی مگر ہمت کر کے پہنچے تو وہ بہانہ اور حیلہ کر کے وہاں سے کافور ہو گیا۔ وہاں بھی اس کا جواب ویسے ہی مولانا نے کچھ بیان فرمایا اور پھر کچھ تحریر شروع کی جس کو مولوی عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا اور نام جواب

ترکی بہ ترکی رکھا۔ پنڈت جی کے معتقدوں نے کچھ تحریر بجواب مولانا بے سر و پا لکھی تھی۔ اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کئے تھے۔ یہ رسالہ اس کے جواب میں ہے" کتاب کے آخر میں درج ہے کہ "نویں رمضان شریف سنہ ۱۲۹۶ھ کو لکھنا شروع کیا تھا اور بحمد اللہ ۲۱ ماہ مذکور بروز سہ شنبہ ختم کیا۔" جناب مناظر احسن گیلانی کے مطابق "اس کا مطلب یہی ہوا کہ سیدنا امام الکبیر کی وفات کی تاریخ ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ سے کم و بیش چھ سات مہینے پہلے یہ کتاب ختم ہوئی۔

(۱۶) تقریر دل پذیر جناب ڈاکٹر ایوب قادری نے لکھا ہے کہ "اس کتاب میں مولانا محمد قاسم صاحب نے حقانیت اسلام و توحید نبوت کو بیان کیا ہے اور عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ نجات کا انحصار اسلام پر ہے"۔

(۱۷) توثیق الکلام در بحث خلف الامام۔ نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے۔

(۱۸) تحفہ لحمیہ۔ جناب ایوب قادری نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس رسالہ میں مولانا نانوتوی نے گوشت خوری کو عقلاً اور نقلاً ثابت کیا ہے۔

(۱۹) انتباہ المومنین (فارسی) جناب ایوب قادری نے تحریر فرمایا کہ "یہ رسالہ مولوی الٰہی بخش صاحب کے خط کے جواب میں لکھا ہے۔ اس میں شیعہ اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ اس رسالہ کے آخر میں مولوی حبیب الرحمٰن ابن مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے شاہ اسمٰعیل شہید کا ایک عربی خط اور اردو ترجمہ شامل کر دیا ہے۔ اور جناب عبد الاحد نے لکھا ہے کہ انتباہ المومنین سے خط مولوی اسمٰعیل صاحب شہید بجواب اعتراضات شیعہ" کے لئے جاتے ہیں

(۲۰) فیوض قاسمیہ۔ جناب ایوب قادری نے لکھا ہے کہ "اس میں پندرہ مکتوبات کے جوابات شامل ہیں۔ اس مجموعہ کو مولوی حافظ محمد عبد العدل خلف حافظ عنایت علی ساکن پھلت ضلع مظفر نگر نے سنہ ۱۳۰۳ھ میں مرتب کیا تھا۔ اور یہ مجموعہ سب سے پہلے مطبع ہاشمی میرٹھ میں طبع ہوا۔

(۲۱) جمال قاسمی۔ جناب ایوب قادری کے بقول یہ مجموعہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو انہوں نے محمد جمال الدین دہلوی کو لکھے تھے۔ سنہ ۱۲۹۵ میں انہوں نے ان کو مرتب کیا اور جمال قاسمی اس کا نام رکھا۔

(۲۲) لطائف قاسمیہ۔ اس میں ۹ مکتوبات شامل ہیں۔ ۸ حضرت مولانا نانوتوی کے ہیں اور ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کا ہے۔

(۲۳) مکتوبات قاسمیہ۔ جناب ایوب قادری نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس مجموعہ میں خلیفہ بشیر احمد دیوبندی کے نام مولانا نانوتوی کے آٹھ خط ہیں جن میں تصوف و سلوک کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں حاجی امداد اللہ کے حسب کے آٹھ خطوط اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا ایک خط بھی شامل ہے"۔

(۲۴) الاجوبۃ الکاملہ فی الاسولۃ الخامسہ: جناب ایوب قادری کے بقول یہ رسالہ "رشیعت کے رد میں ہے"۔

(۲۵) قصائد قاسمی۔ جناب ایوب قادری نے تحریر فرمایا ہے کہ "مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کو شعر و شاعری سے بھی ذوق تھا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی روایت ہے کہ بچپن میں مولانا محمد قاسم نے بعض قصیدے کو نظم بھی کیا تھا۔ یہ مولانا نانوتوی کے قصائد کا مجموعہ ہے۔ قصیدہ اول حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے۔ اس کے علاوہ تین قصیدے سلطان عبد الحمید کی مدح میں ہیں۔ پہلا اردو میں، دو فارسی میں اور ایک عربی زبان میں ہے۔ اس مجموعہ میں مولانا ذوالفقار علی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے عربی قصائد بھی سلطان عبد الحمید کی مدح میں ہیں آخر میں مولانا محمد قاسم صاحب کا نظم کیا ہوا چشتیہ صابرہ شجرہ بھی شامل ہے"۔ ان تصنیفات کے علاوہ جناب ایوب قادری نے حضرت قاسم العلوم کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ دریافت کیا ہے جو انجمن

ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

(۲۶) رد قول الفصیح اس کا نام ہے۔ جناب قادری نے لکھا ہے کہ مولوی فصیح الدین بدایونی تلمیذ مولانا عبدالقادر بدایونی نے تحذیر الناس کے رد میں ایک رسالہ قول الفصیح لکھا تھا یہ رسالہ از مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے قول الفصیح کے رد میں لکھا ہے۔ اس رسالہ کا قلمی نسخہ دستخطی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔ اس مخطوطہ کا نمبر ۱/۱۰۶ (قلمی) ہے۔ اس کا سائز ۱۸×۲۲/۸ اور اس کے صفحات ۷۰۔ اسے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے خود آخر میں لکھا ہے کہ "میں نے خود اس رسالہ کی تصحیح کی ہے۔"

(۲۷) تتمہ حجۃ الاسلام۔ مولوی عبدالاحد نے الدلیل المحکم کے آخر میں حضرت قاسم العلوم کی تصانیف میں جن ۱۲ کتابوں کا نام لیا تھا اس میں تتمہ حجۃ الاسلام کا بھی ذکر کیا تھا۔ اور اس کی قیمت رکھی تھی۔ یہ رسالہ بھی حضرت فخر العلماء کی زیر نگرانی شروع ہوا تھا۔ اور راقم نے اس کی نقل ربوہ کے قادیانی کتب خانہ سے حاصل کی ہے۔

۲۸۔ قاسم العلوم (نمبر اوّل) حضرت قاسم العلوم کے ۵۴ خطوط کو قاسم العلوم کے نام سے چار اشاعتوں میں شائع کیا گیا ہے اور قاسم العلوم نمبر ۱ میں دو خط شامل ہیں جن میں ۱۷ صفحات ہیں۔

۲۹۔ قاسم العلوم نمبر دوم۔ اس میں تین خط ہیں اور ۸۷ صفحات ہیں۔

۳۰۔ قاسم العلوم نمبر سوم۔ اس میں تین مکتوب ہیں اور اس کے صفحات ۷۲ ہیں۔

(۲۹) قاسم العلوم۔ مولانا عبدالرؤف عالی کے بقول یہ بھی حضرت نانوتوی کی ایک تصنیف ہے جو ۱۲۹۲ھ میں شائع ہوئی ہے۔ اور قاسم العلوم کے مکتوب پر مشتمل ہے۔ جو حضرت فخر العلماء کے نام ہے۔ یہ مکتوب بھی فارسی میں ہے اور ۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا موضوع حکمت شریعہ ہے۔ اس تصنیف میں حضرت قاسم العلوم کے ان تینوں خطوں کو یکجا طور پر جمع کر دیا گیا ہے جو حضرت فخر العلماء کے نام ہیں اور جنھیں گذشتہ دنوں قاسم العلوم کے دوسرے خطوط کی طرح یکجا طور پر شائع کر دیا گیا ہے۔

حضرت قاسم العلوم کی اہم تصانیف جیسے دل پذیر، حجۃ الاسلام، انتصار اسلام، مباحثہ شاہ جہان پور، قبلہ نما، گفتگوئے مذہبی اور قاسم العلوم پر حضرت فخر العلماء کی گہری چھاپ ہے حضرت فخر العلماء کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ حضرت قاسم العلوم کی تمام تحریروں کو باقاعدہ تصحیح اور حواشی کے ساتھ شائع فرمائیں مگر عمر نے وفا نہیں کی انہوں نے اتنی عمر بھی نہیں پائی جو ان کے دوسرے ساتھیوں یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور حضرت سید العلماء مولانا احمد حسن امروہوی کو میسر آئی۔ حضرت شیخ الہند کا وصال ۱۹۲۰ء اور حضرت سید العلماء کا وصال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔ گویا حضرت فخر العلماء حضرت شیخ الہند سے ۲۳ سال قبل اور حضرت سید العلماء سے ۱۵ سال قبل جنت کو سدھارے مگر اس کے باوجود انہوں نے تن تنہا حضرت قاسم العلوم کے ارشادات اور نظریات کی اشاعت کے لئے جد و جہد کی۔ انہوں نے خود انتصار اسلام کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ "اور جناب مولانا کی وہ تحریریں جو زیر طبع اب تک نہیں آئی ہیں اور وہ کوئی سو جز ہوں گی۔ ان کے شائع کرنے پر بندہ نے کمر ہمت باندھی ہے۔ خداوند کریم مدد کرے۔" آفرین ہے انکے حوصلہ پر اگر وہ اپنے ساتھیوں کی عمروں کو پہنچتے تو پھر کسی کو سوانح قاسمی کے بارے میں موجودہ تشنگی کا احساس نہ ہوتا اور حضرت قاسم العلوم کے تمام معارف اور علوم منظر عام پر آجاتے مگر ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ بہرحال انہوں نے اس ضمن میں جو کچھ کیا وہ بھی کسی اور شاگرد قاسم العلوم کے مقدر میں نہیں تھا۔ اور علوم قاسمی کی اشاعت میں بڑی حد تک ان کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ حضرت فخر العلماء نے ان کتابوں کی اشاعت کے بارے میں جو کوشش فرمائی اس کا اب ذیل میں جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) تقریر دل پذیر

یہ حضرت قاسم العلوم کی آخری تصنیف ہے اور اس کی تکمیل سے پہلے ہی حضرت نے انتقال فرمایا۔ حضرت فخر العلماء نے جن کی نگرانی میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "سخت افسوس ہے کہ یہ رسالہ پورا بھی نہ ہونے پایا، ادھورا ہی تھا کہ مصنف مرحوم خلد بریں کو تشریف لے گئے۔ اور یہ رسالہ کیا بہت سے کام ادھورے رہ گئے۔ مصنف مرحوم فرماتے تھے کہ دو بحثیں لکھنی باقی ہیں ایک بحث تو قبلہ اور احکام متعلقہ قبلہ کی رہ گئی ہے۔ دوسری یہ بحث رہ گئی ہے کہ انبیاء علیہ السلام کو خدا کے ساتھ کیا ربط ہے اور نبیوں میں آپس میں بہ اعتبار مرتبہ کیا فرق ہے اور کیوں ہے" لیکن اس میں آگے چل کر اس عزم کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ انشاء اللہ ان دونوں بحثوں کو تحریر کریں گے۔ حضرت فخر العلماء کے اس مقدمہ کا جو اس کتاب کے صفحہ اول اور دوم پر محیط ہے سرخی یہ ہے "امی باید دید" اس عنوان کے تحت آپ فرماتے ہیں، کہ

"لاکھ لاکھ شکر ہے اس صانع کا جس نے انسان کو اشرف المخلوقات اس لئے بنایا کہ اس کو جانے پہچانے اور اس کی پرستش کرے پھر اس میں سے بعضوں کو پیام رسانی کے لئے منتخب کیا اور اپنا فرمان اعلیٰ کے حوالہ کیا جس میں اس کے جاننے پہچاننے، عبادت کرنے کی تاکید اور اس کے طریقے بیان کئے، پھر ہر زمانہ میں ان پیامبروں کے نائب مقرر کئے جو پیام رسانی کرتے رہے اور مخلوق کو خدا کی طرف بلاتے رہے۔ منجملہ نائبوں کے اس زمانہ میں ایک یہ شخص تھا جس کو تھوڑے دن ہوئے کہ ہم تم مولانا محمد قاسم سلمہ اللہ تعالیٰ کہا کرتے تھے

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

اور اب مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

ہمارے آگے کسی نے جب ان کا نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اس رسالہ میں جس کا نام تقریر دل پذیر ہے سارے جہاں کو پیام خداوندی ایسی خوش اسلوبی سے پہنچا دیا کہ کسی اہل عقل کو بروئے عقل اس سے چارہ نہیں کہ خدا کو یکتا و یکتا جانے، پیغمبروں کو اپنے اپنے زمانہ میں واجب الاطاعت سمجھے اور جناب محمد رسول اللہ کو خاتم النبیین سمجھ کر ان کی اطاعت و تابعداری میں اپنی نجات منحصر سمجھے۔ یہ رسالہ زبان حال سے یہ پکار رہا ہے کہ

فیض محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے — نہ آئے آتش دوزخ میں جلے جس کا جی چاہے

اب بھی اگر کوئی عقل کا اندھا دین محمدی کو نہ اختیار کرے، اپنے لئے خدا کا غضب اور دوزخ کی آگ پسند کرے تو وہ جانے۔ خدا کی حجت قائم ہو چکی۔ اس رسالہ میں جو جو عیب و نقصان اور مذہبوں میں تھے وہ بہ دلائل ثابت کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ بروئے عقل اس زمانہ میں سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین ایسا نہیں جس کے اختیار کرنے سے انسان کی نجات ہو سکے۔ بہر حال یہ رسالہ بے نظیر ہے۔ چشم روزگار نے بھی مثل اس کے کوئی کتاب یا رسالہ نہ دیکھا ہوگا۔ ناظر فہیم و منصف بعد ملاحظہ کے اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھے گا۔ کئی برس ہوئے اس رسالہ کے چند جزو بریلی میں طبع ہوئے تھے اور سال گذشتہ میں چند جزو بھاولپور میں طبع ہوئے تھے اور دونوں میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں اور مصنف مرحوم نے جو اجزاء اس کے بعد تصنیف فرمائے تھے وہ بھی ابھی یوں ہی رکھے تھے۔ ادھر اس زمانہ میں ایسے رسالہ کی نہایت ضرورت تھی اس لئے بندہ نے اس رسالہ کو جتنا مصنف مرحوم نے تصنیف کیا تھا نہایت صحت کے ساتھ طبع کرنا شروع کیا ہے اور فائدے فٹ نوٹ میں لکھ دیئے ہیں تاکہ جس کسی کو کوئی خاص مضمون دیکھنا ہو باآسانی دیکھ لے۔ اور جہاں ضرورت سمجھی حاشیہ بھی لکھ دیا ہے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ یہ رسالہ پورا ہونے نہ پایا تھا (گویا موجودہ نسخہ کی کتابت، طباعت، تصحیح، فٹ نوٹ اور حاشیہ کی ترتیب وغیرہ کا سلسلہ حضرت قاسم العلوم کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا) ادھورا ہی تھا کہ مصنف مرحوم خلد بریں کو تشریف لے گئے اور یہ رسالہ کیا بہت سے کام ادھورے رہ گئے۔ مصنف مرحوم فرماتے تھے کہ دو بحثیں لکھنی باقی ہیں، ایک بحث تو قبلہ اور احکام متعلقہ قبلہ کی رہ گئی ہے۔ دوسری یہ بحث رہ گئی کہ انبیاء علیہم السلام کو خدا کے ساتھ کیا رابطہ ہے اور نبیوں میں آپس

یہ بہ اعتبار مرتبہ کے کیا فرق ہے اور کیوں ہے۔ چونکہ مصنف مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی اور کیوں کر کرتی۔

چراکہ عمر گرامی بکس وفا نہ کند

اور جتنے دنوں اس جہاں میں رہے اکثر بیمار رہے اس لئے یہ دونوں بحثیں سینہ ہی میں رہیں سفینہ میں نہ آئیں۔ اگرچہ قبلہ کی بحث رسالہ قبلہ نما میں بتمام وکمال موجود ہے۔ مگر چونکہ وہ اور طرز پر ہے اس لئے اس رسالہ عام فہم میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہی۔ دوسری بحث سودہ تو مولانا کی کسی تحریر میں میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لئے یوں جی چاہتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ان دونوں بحثوں کو بطرز سلیس لکھ کر اس رسالہ کو پورا کر دے تو بہت اچھا ہو۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن پھر بھی محال تو نہیں۔ بندہ بھی خداوند علیم کلیم کے بھروسہ پر اس رسالہ کو پورا کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ مگر چونکہ پھر بھی یہ کام نہایت مشکل ہے اور اپنا یہ حال ہے کہ علم وفضل تو درکنار ہوش وحواس بھی درست نہیں اس لئے اہل علم واہل بحث کی خدمت میں عرض ہے کہ اس رسالہ کو پورا کرنے کی طرف توجہ کریں اور جس سے جو کچھ ہو سکے دریغ نہ کرے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

اور بندہ تو قسمت آزمائی ضرور کرے گا۔ اگر خداوند علیم نے مدد کی تو یہ کام گو کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو آسان ہو جائے گا۔ کریں گے آپ فقط شہرت نیک نامی میرے ذمہ لگ جائے گی۔ بندہ نے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اتنا ارادہ بلند کیا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ پورا ہو جائے گا۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ۔ اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

اب خداوند ذوالجلال والاکرام سے یہ دعا ہے کہ مسلمانوں میں آپس میں اتفاق دے اور ظاہر وباطن کی اصلاح فرمائے۔ دین اسلام کا بول بالا کرے۔ دشمنان دین کا منہ کالا کرے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

اس زمانہ میں جیسے مسلمان پستی میں ہیں، کوئی قوم روئے زمین پر ایسی نہیں، جو آفت ارضی و سماوی آتی ہے وہ مسلمانوں کیلئے ہی آتی ہے۔ گویا انوری کی یہ رباعی مسلمانوں کے حسب حال ہے۔

ہر بلائے کز آسمان آید ۔ گرچہ بر دیگرے قضا باشد

بر زمیں نارسیدہ می پرسد ۔ خانۂ انوری کجا باشد

اب مسلمانوں کی ذلت انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ اس لئے کچھ عجب نہیں کہ غیرت الٰہی جوش میں آئے۔ اور مسلمانوں کو اس ذلت وخواری سے نجات دے۔ دعائے خیر کا امیدوار فخر الحسن سیہ روز وسیاہ کار"۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے بھی اس عظیم تصنیف کے نامکمل رہ جانے پر اظہار افسوس کیا۔ جناب مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد دوم۔ صفحہ ۱۸۴ میں ارقام فرمایا ہے کہ "جیسا کہ معلوم ہے "تقریر دل پذیر" نامی کتاب میں اسلام کے علمی وعملی نظام کو تدبیر واستدلال کے نئے پہلو میں ڈھالنے کا ارادہ سیدنا امام الکبیر نے فرمایا تھا۔ لیکن چند ابتدائی ابواب سے زیادہ یہ کتاب نہ لکھی جا سکی۔ (حضرت مولانا کو سہو ہوا صرف دو بحثیں باقی رہ گئی تھیں) شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "تقریر دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلق شائقان اسرار علیہ کو ہے" افسوس ہے کہ حضرت فخر العلماء کی جلد موت نے انہیں ان دو بحثوں کو مکمل طور پر پیش کرنے کی سعادت سے محروم رکھا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کی کوشش اور سعی بلیغ سے یہ کتاب صحیح اور شستہ انداز میں تمام ضروری فوائد اور حواشی کے ساتھ منظر عام پر آگئی۔

۲۔ حجۃ الاسلام:۔ حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم کی دوسری اہم ترین تصنیف تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ "تقریر دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قلق شائقان اسرار علیہ کو ہے" اس کے مکافات کی صورت بھی رسالہ حجۃ الاسلام سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔ حضرت فخر العلماء وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسے سب سے پہلے شائع فرمایا۔ مطبع قاسمی دیوبند سے جو پہلا ایڈیشن رسالہ حجۃ الاسلام کا شائع ہوا ہے

اس کے دیباچہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب لکھتے ہیں کہ "مولانا مولوی فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام حجۃ الاسلام تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا۔" حضرت فخر العلماء نے علوم قاسمی کی اس اہم یادگار تصنیف کے آغاز میں یہ جملے ارقام فرمائے ہیں۔ "الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم النبیین محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد کمترین فخر الحسن عفی اللہ عنہ خدمت میں ناظرین رسالہ ہذا (حجۃ الاسلام) کے عرض پرداز ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں جو جلسہ شاہجہان پور میں ہوا تھا اس میں جو تقریر جناب مولانا و مرشدنا مولوی محمد قاسم صاحب مد ظلہم نے اہل جلسہ کے سامنے درباب اثبات توحید و رسالت وحقانیت دین اسلام بدلائل عقلیہ بیان کی تھی چونکہ وہ تقریر اہل اسلام کے لئے موجب تسکین قلب ہے اس لئے اس کا طبع کرانا ضروری جانا تاکہ ہر خاص و عام مستفید ہوں اور وہ تقریر بعینہ یہ ہے" حضرت فخر العلماء نے ترکی اور جواب ترکی والی بات نہیں کی بلکہ اس کا براہ راست کریڈٹ حضرت قاسم العلوم کو دیا جیسا کہ اس کے سرورق سے ظاہر ہوتا ہے۔ سرورق یہ ہے "حجۃ الاسلام" از تصانیف مولانا محمد قاسم مرحوم چونکہ کتاب تحذیر الناس اور تتمہ حجۃ الاسلام کے ساتھ شائع ہوئی اس لئے پرنٹ لائن یہ ہے۔ حجۃ الاسلام (۱۳۰۸) تحذیر الناس۔ از تصانیف مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور کہ فی الواقع فاتر العوام خاص و عام ہے باہتمام مولوی محمد عبد الاحد مسلمہ طبع شد")

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۲۹ میں تحریر فرمایا ہے کہ "رسالہ حجۃ الاسلام دراصل حضرت قاسم العلوم لکھ کر اپنے ہمراہ لے گئے تھے یہ ۱۲۹۴ھ کے شاہجہان پور کے جلسہ میں تقریر کے دورہ پر لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کی طباعت کیلئے سب سے پہلا قدم مولانا فخر الحسن نے اٹھایا۔ انہوں ہی نے اس کا نام حجۃ الاسلام تجویز کیا۔ مگر اس تحریر کو جلسہ میں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ بہر حال رسالہ حجۃ الاسلام بھی مولانا فخر الحسن کی کوشش سے مطبع مجتبائی میں چھپا۔" جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی میں اس تقریر کا ذکر فرمایا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "اس وقت ہم نے یہ سنا تھا کہ غالباً حاجت کسی تحریر کے پیش نظر کرنے کی بھی ہوگی۔ اس پر مولوی صاحب نے (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) وہیں بیٹھ کر کچھ تحریر کیا تھا اور اس کا نام حجۃ الاسلام رکھا ہے۔ وہ کتاب طبع ہوگئی ہے۔" حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد دوم کے صفحہ ۴۸۱، ۴۸۰ اور ۴۸۲ میں اس کتاب کی اہمیت کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "جہاں عمل کے لئے خدا شناسی کے ان میلوں سے روشنی ملتی ہے وہاں یہ عجیب بات ہے کہ علم کے دائرہ میں ہم جن "نظریات خانقاہ" کی تعبیر "حکمت قاسمی" سے کرسکتے ہیں۔ یا چاہیے کہ کریں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی میلوں کی بدولت پہلی دفعہ وہ قلم بند ہوئے۔ میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی مشہور تصنیف "حجۃ الاسلام" کی طرف ہے اس کتاب میں کیا ہے ظاہر ہے کہ اس پر بحث کا موزوں ترین مقام تو سیرت طیبہ کے بعد کی جلد ہی ہوسکتی ہے جس میں آپ کے مخصوص نظریات کی ترتیب و تہذیب کا کام کیا جائے گا۔ مختصر لفظوں میں سردست اس سلسلہ میں بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کتاب کا خاص ایڈیشن (جناب گیلانی نے اس کا پہلا ایڈیشن مرتبہ فخر العلماء نہیں دیکھا تھا۔) جب شائع ہوا تھا۔ تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا کہ "اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا (سیدنا الامام الکبیر) کی زبان مبارک سے یہ بھی سنا گیا کہ جو مضامین تقریر دل پذیر میں بیان کرنے کا ارادہ ہے وہ سب اس تحریر میں آگئے ہیں، اس قدر تفصیل سے نہ سہی بہ اجمال ہی سہی" اس کے بعد کتاب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ "تائید احکام اسلام اور مدافعت فلسفہ قدیمہ وجدیدہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء (سیدنا امام الکبیر) کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں اور پورے غور سے کام لیں اور انصاف سے دیکھیں کہ ضروریات موجودہ زمانہ حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق وقیمتی اور بہتر و مفید تر ہیں یا نہیں۔ یہ بظاہر ان الفاظ کا تعلق اگرچہ عام رسائل سے معلوم ہوتا ہے۔

لیکن زیادہ تر حجۃ الاسلام ہی کے افادی پہلوؤں کی طرف حضرت شیخ الہند نے ان جامع و مانع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف میں صرف اشارہ فرمایا تھا کہ حجۃ الاسلام کا مسودہ رواروی میں لکھا گیا تھا لیکن حضرت شیخ الہند نے حجۃ الاسلام کی دوبارہ اشاعت کے موقع پر جو دیباچہ تحریر فرمایا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ معرکۃ الآرا تصنیف جسے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے حضرت قاسم العلوم کی مشہور تصنیف قرار دیا ہے۔ ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر مکمل ہوئی۔ حضرت شیخ الہند کے الفاظ یہ ہیں:۔ بندہ محمود حمد و صلوٰۃ کے بعد طالبان معارف الہیہ اور دل دادگان اسرار ملت حنفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۶ء میں پادری نولس صاحب اور منشی پیارے لال صاحب ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شاہ جہاں پور نے جب ایک میلہ بنام "میلہ خداشناسی" موضع چاندا پور میں منعقد کیا اور اطراف و جوانب میں اسی مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں تو اس وقت معدن الحقائق مخزن الدقائق، مجمع المعارف، فطیر اللطائف، جامع الفیوض والبرکات، قاسم العلوم و الخیرات سیدی و مولائی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب متع اللہ ومعارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت میں مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ، رمئی سر پر آگئی۔ چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی۔ اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان، یا بیانات تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے تو بہ نظر احتیاط حضرت مولانا قدس سرہ کے خیال مبارک میں آیا کہ ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ بالخصوص جو اس بیان کے مناسب ہوں۔ سب کچھ شامل ہو حسب قواعد عقلیہ منضبط ہونی چاہیئے۔ جس کے تسلیم میں عاقل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔ چونکہ وقت بہت تنگ تھا اس لئے عجلت کے ساتھ غالباً ایک روز کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔

"حضرت مناظر احسن گیلانی ہی نے اس بات کا انکشاف فرمایا کہ حجۃ الاسلام کا یہ خصوصی ایڈیشن مطبع احمدی علیگڑھ میں چھاپا گیا۔ جناب گیلانی نے حضرت شیخ الہند کے دیباچہ کا اقتباس پیش کرنے کے بعد یہ تحریر فرمایا کہ "بہت سے واقعات تاریخ میں ایسے گزرے ہیں کہ جن کے دور رس نتائج کا اندازہ ان کے وقوع کے زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا تھا، جو بعد کو لوگوں کے سامنے آئے۔ یہی حجۃ الاسلام کتاب، لکھی تو گئی کل ایک دن اور ایک رات کے کچھ حصہ میں۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے مضامین سے دنیا کب تک کن کن حالات میں کس حد تک مستفید ہوتی رہے گی۔ اور کتنوں کی دیجی راتیں اس کتاب کی روشنی سے دن بنتی چلی جائیں گی"۔ (صفحہ ۴۸۴۔ سوانح قاسمی۔ جلد دوم) بہرحال یہ عظیم الشان علمی کارنامہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء کی کوشش اور سعی سے پہلی بار منظر عام پر آیا اور آپ نے اسے مطبع مجتبائی کے تعاون سے شائع فرما کر آئندہ آنے والی نسلوں کو اس کے استفادہ کا موقع فراہم کر دیا۔

۳۔ تتمہ حجۃ الاسلام:۔

حضرت مولانا قاسم العلوم کی یہ تصنیف جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے ربوہ کے قادیانی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور راقم نے اس کی نقل وہاں سے حاصل کی ہے۔ نقل شدہ حصہ جسے راقم کے ایک ماتحت نے ربوہ کی لائبریری سے نقل کیا، ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں یہ نوٹ درج ہے کہ "واضح ہو کہ تقریر مولانا مرحوم کی لبسیط سے پہلے جس قدر اس کا حصہ ہم تک پہنچا تھا چھاپ کر پیش کش ناظرین کیا تھا۔ اب بقیہ تقریر مولانا ممدوح کی مولانا عبد الغنی صاحب کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ اس کو بھی بطور تتمہ حجۃ الاسلام طبع کیا افسوس ایک حصہ تقریر کا اب بھی باقی رہ گیا اور ہاتھ نہ لگا۔ ناچار یہاں تک کہ فقرہ ختم ہوتا تھا ختم کر دیا گیا، ناظرین معاف فرمائیں" حجۃ الاسلام کے جس خاص ایڈیشن کا تذکرہ جناب مناظر احسن گیلانی نے فرمایا اور جو بقول ان کے مطبع احمدی علیگڑھ میں چھپی۔ اور مولانا انوار الحسن شیرکوٹی نے جس ایڈیشن کا تذکرہ انوار قاسمی میں کیا جو بقول ان کے مطبع قاسمی دیوبند میں چھپا اس کا راقم نے مطالعہ نہیں کیا جس سے پتہ چلتا کہ تتمہ حجۃ الاسلام کی یہ عبارت اصل کتاب میں شامل کر دی گئی

ہے یا نہیں۔ بہر حال حضرت فخر العلماء نے اس سلسلہ میں جو کاوش فرمائی اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۴۔ انتصار اسلام:۔

حضرت قاسم العلوم کا ایک اہم علمی کارنامہ ان کی وہ تقریریں ہیں، جو رڑکی میں آپ نے پنڈت دیانند سرسوتی کے مقابلہ میں کیں۔ اور جنہیں حضرت فخر العلماء نے انتصار اسلام کے نام سے شائع فرمایا ہے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور دیانند سرسوتی کے عنوان سے انوار قاسمی کے صفحہ ۵۲۸ میں تحریر فرمایا ہے کہ ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء کے مباحثوں کے بعد (جو شاہجہاں پور میں منقد ہوئے) حضرت قاسم العلوم نے آریا مذہب کے بانی دیانند سرسوتی کا ناطقہ بند کیا جس سے ۱۸۷۷ء کے مذہبی مباحثے میں شاہجہاں پور سے انہیں شناسائی حاصل تھی اور اس کی مذہب دانی کا اندازہ بھی خوب کر لیا تھا۔ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں حضرت قاسم العلوم حج کو تشریف لے گئے اور مارچ ۱۸۷۸ء میں واپس آئے۔ ہیتی انفس اور کھانسی کی بیماری آپ کو لاحق تھی اور سخت تکلیف رہتی تھی کہ اسی اثناء میں رڑکی میں دیانند سرسوتی سے مناظرے کیلئے تشریف لے گئے رڑکی میں دیانند کی آمد، قاسم العلوم کا مناظرے کیلئے تشریف لے جانا اور دیانند کا پہلو تہی کرنا۔ اس کی تمام تفصیلات انتصار اسلام مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی میں ملیں گی اور اسی کتاب کے صفحہ ۵۳۰ میں جناب انوار الحسن نے "انتصار اسلام کی اشاعت" کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ "۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں رڑکی میں حضرت قاسم العلوم نے پنڈت دیانند سرسوتی کے اسلام پر اعتراضات کے جو جوابات لکھے تھے ان کو بھی مولانا فخر الحسن صاحب نے ہی شائع کیا اور اس رسالے کا نام بھی انتصار اسلام رکھا۔ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "کمترین فخر الحسن عفی اللہ عنہ خدمات عالیہ میں ناظرین رسالہ ہذا کی عرض پرداز ہے، کہ یہ جو رسالہ جس کا نام انتصار اسلام کمترین نے رکھا ہے مصنفہ جناب آیت من آیات اللہ۔ حجۃ اللہ فی الارض سلطان الاذکیہ، صوفی صافی، غازی حاجی، حافظ، مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور طاب اللہ ثراہ کا ہے"

اس عبارت میں جہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صوفی صافی اور حاجی لکھا ہے وہاں غازی بھی لکھا جو جہاد شاملی اور تھانہ بھون کے جہاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور جو حضرت قاسم العلوم کے جہاد میں شامل ہونے کی مستند دلیل ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ یہاں پر غازی سے ان کی وہ فتح و کامرانی بھی مراد ہے جو انہیں شاہجہاں پور کے دو مذہبی مباحثوں میں حاصل ہوئی اور جہاں سے وہ بقول مولانا محمد یعقوب صاحب فتح اور کامرانی کا علم لہراتے ہوئے واپس آئے۔ حضرت فخر العلماء نے انتصار اسلام کے دیباچہ میں جو الفاظ تحریر فرمائے اور جس کا ایک حصہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ یہ ہیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ الطاہرین والصحابہ المطہرین

گزارش قابل ملاحظہ

زلاف حمد و نعت اولی است بر خاک ادب خفتن سجودے میتواں کردن درودے میتواں گفتن

اما بعد کمترین فخر الحسن عفی اللہ عنہ خدمات عالیہ میں ناظرین رسالہ ہذا کی عرض پرداز ہے، کہ یہ رسالہ جس کا نام انتصار الاسلام کمترین نے رکھا ہے مصنفہ جناب فیض مآب، حامی شریعت و طریقت۔ آیت من آیات اللہ، حجۃ اللہ فی الارض مصداق حدیث علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل، نائب رسول، سلطان الاذکیاء، صوفی صافی، نمازی، حاجی، مولوی محمد قاسم مرحوم و مغفور طاب اللہ ثراہ و جعل الفردوس مادہ کا ہے جس کو جناب مغفور نے بجواب اعتراضات پنڈت دیانند سرسوتی نے رڑکی میں آکر برسر بازار دین اسلام پر طرح طرح کے اعتراض کرنے شروع کئے لیکن جب حضرت قاسم العلوم وہاں پہنچے تو پنڈت جی نے مقابلہ میں آنے سے احتراز کیا اور کسی طرح ان کے سامنے نہ آئے۔ اور بقول فخر العلماء "آخر ش مولانا نے بہ نفس نفیس برسر بازار تین روز تک وعظ کیا" اور جب رڑکی سے براہ منگلور اور دیوبند ہوتے ہوئے نانوتہ پہنچے تو بقول فخر العلماء "نانوتہ میں پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب لکھے جو کل گیارہ تھے" "ان میں سے ان اعتراضوں کے جو جوابات تھے ان کا الگ رسالہ کر دیا مگر اس کا نام کچھ مقرر نہیں فرمایا تھا اس لئے بندہ نے اس کا نام انتصار اسلام رکھا اور

جواہات دندان شکن بھی اس کا نام ہے۔ جناب مولانا مرحوم کے سامنے بھی اس نام کا ذکر آیا تھا اور ہندی میں اس کا نام "پنڈت کی کتھا میں کھنڈت" ہے"۔

اس رسالہ کا ایک ایڈیشن کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے شائع کیا ہے جس میں حضرت فخر العلماء کے دیباچہ کے ساتھ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی نے ضروری حواشی بھی تحریر فرمائے ہیں۔ اور حضرت فخر العلماء کے دیباچہ سے قبل ایک التماس شائع کیا ہے جس میں انتصار الاسلام میں حواشی کی ضرورت کا اظہار فرمایا ہے حضرت مولانا محمد میاں تحریر فرماتے ہیں کہ "مربیۃ الاساتذہ حجۃ الاسلام مجدد الملت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ العزیز کی دقت نظری، علمی تبحر اور کلام کی جامعیت اس سے بہت بالا ہے کہ بیان تحریر میں آسکے لہٰذا ہم جیسے ناقص العلم جو سطحی نظر کے عادی ہیں اگر یہ دعویٰ کریں کہ یقیناً مولانا کی مراد کو پہنچ گئے تو حقیقت یہ ہے کہ اپنے تعلی آمیز جہل مرکب کی کھلی ہوئی دلیل ہوگی۔ اور پھر اس صورت میں مولانا کی تصانیف پر شرح یا حاشیہ لکھ کر عالم کے سامنے پیش کرنا تو گویا اپنی کم علمی کو طشت از بام کرنا ہے مگر چونکہ میرے بعض اساتذہ نے رسالہ انتصار الاسلام کی مختصر مگر استعداد سے زیادہ اور سخت دشوار خدمت کی انجام دہی کے لئے حکماً ارشاد فرمایا توکلا علی اللہ اپنی ناقص استعداد اور ناکافی علم کے مطابق لکھ دیا۔ خاکسار کو نقصان استعداد بلکہ ناکارگی کا خود اعتراف ہے لہٰذا اگر غلطی ہو تو اہل علم سے درخواست ہے کہ مطلع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں۔ اور یا چشم پوشی فرما کر عند اللہ ماجور ہوں"۔

بہر حال انتصار الاسلام حضرت نانوتوی کے افکار عالیہ میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہے۔ اس رسالہ میں ایک خوبی یہ بھی ہے جس کا ذکر حضرت فخر العلماء نے خود فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اس رسالہ کے مضامین کو مکمل بنانے کیلئے انہوں نے اس میں اضافے کئے ہیں۔ حضرت فخر العلماء کے الفاظ یہ ہیں: "انتصار الاسلام میں دس اعتراضات کا جواب ہے اور بہ نظر مناسب بندہ نے پنڈت جی کے اس اعتراض کا جواب جو شاہجہاں پور کے مباحثہ میں بہشت و دوزخ کے وجود پر کیا تھا۔ اس رسالہ میں شامل کر دیا ہے۔ اور فرشتوں اور جنوں کے موجود و خارجی ہونے کے ثبوت میں جو تقریر مولانا نے وہاں بیان فرمائی تھی اس کو بھی یہاں درج کر دیا ہے۔" ان الفاظ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حکمت قاسمی کی جتنی روشنی حضرت فخر العلماء کے قلب پر تھی۔ اور ان کے ذہن و فکر پر محیط تھی۔ اس کا عشر عشیر حضرت قاسم العلوم کسی اور شاگرد میں نہیں تھا۔ اسی سلسلہ میں تقریر دل پذیر کے اس دیباچہ کی طرف بھی توجہ فرمائیے جس میں حضرت فخر العلماء نے فرمایا تھا کہ اس بے نظیر تصنیف میں جو دو بحثیں نامکمل رہ گئی ہیں وہ اسے خود پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ دعویٰ صرف وہ شخص ہی کر سکتا ہے جو علوم قاسمی کا صحیح نکتہ داں ہو اور بلاشبہ حضرت فخر العلماء صحیح معنوں میں حضرت قاسمی کے علوم کے ترجمان تھے۔

۵۔ قبلہ نما:- حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے "سوانح عمری مولوی محمد قاسم نانوتوی" میں تحریر فرمایا ہے کہ "اسی سال (۱۲۹۵ھ) شعبان میں رڑکی سے خبر ملی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں۔ اہل رڑکی مولانا پر بضد ہوئے کہ آپ تشریف لائیں۔ مولانا باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے۔ اور بہت سے خادم ساتھ ہوئے اور اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو گئی مگر وہ بندہ اللہ کا گفتگو پر کیا نہ ہوا۔ اور اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا۔ جس سے عاقلان خود میدانند اس کی نیت سمجھ میں آتی تھی۔ آخر غرض وہ چلدیا اور مولانا نے وہاں ایک وعظ کیا اور اس کے اعتراضوں کے جواب ذکر فرمائے۔ پھر واپس دیوبند تشریف لاکر رمضان وطن میں (نانوتہ) میں کیا اور اس عرصہ میں تحریر اس تقریر کی شروع کی جو اس کے جواب میں فرمائی تھی۔ اصل اعتراض اس کا استقبال قبلہ پر تھا کہ یہ بت پرستی ہے۔ اس رسالہ کا نام قبلہ نما ہے۔ بہت بڑے پائے کا رسالہ ہے۔ حضرت فخر العلماء نے بھی جب اس کی اشاعت کا اہتمام فرمایا تو یہی لکھا کہ یہ رسالہ پنڈت دیانند سرسوتی کے ایک اعتراض

کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ آپ نے انتصار اسلام کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "خانہ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے پر جو اعتراض ہے اس کا جواب چونکہ بہت شرح و بسط رکھتا ہے۔ اس کو جناب مصنف مرحوم نے ایک جدا رسالہ کر دیا ہے اور اس کا نام قبلہ نما فرمایا کرتے تھے" اس دیباچہ میں آگے چل کر حضرت فخر العلماء فرماتے ہیں کہ "القصہ انتصار اسلام گو عجیب رسالہ ہے، مگر قبلہ نما عجیب و غریب ہے غالباً کئی صدی سے کسی کان نے ایسے مضامین عالیہ نہ سنے ہوں گے۔ اور نہ کسی آنکھ نے دیکھے ہوں گے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ ناظرین بعد ملاحظہ خود دیکھ لیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب قبلہ نما بھی طبع ہو کر شائع ہوتا ہے۔"

حضرت قاسم العلوم نے اس رسالے کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "بعد حمد و صلوٰۃ بندہ ہیچ مداں سراپا گناہ محمد قاسم ناظرین اوراق کی خدمت میں عرض پرداز ہے (بعینہ یہی حضرت فخر العلماء کا انداز تحریر ہے۔ گویا تحریر کے انداز میں بھی استاد کا اتباع ہے) کہ سن بارہ سو چھانوے ہجری رجب مطابق ۱۸۷۸ء ماہ جولائی میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کئے۔ حسب الطلب بعض احباب (رڑکی) اور بہ تقاضائے غیرت اسلام، یہ ننگ اسلام بھی شروع شعبان میں وہاں پہنچا۔ آرزو تے مناظرہ میں سولہ سترہ دن وہاں (رڑکی) ٹھہرا رہا۔ ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہ بہ عنایت خداوندی ان کا جواب عرض کروں مگر پنڈت جی ایسے کاہے کو تھے کہ میدان مناظرہ میں آجاتے۔ جان چرانے کیلئے وہ داؤں کھیلے کہ کاہے کسی کو سوجھتے ہیں۔ منتیں کیں، غیرتیں دلائیں، مِنّتیں کیں، سفارشیں کرائیں مگر وہاں (یعنی پنڈت جی کے یہاں) وہی نہیں کی نہیں رہی۔ حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی تھی کہ سرحد چھاؤنی اور رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے۔ اور اس سے خارج ہو کر کچھ ممانعت نہیں۔ اس پر ہم نے میدان عیدگاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کیا۔ تو پنڈت جی کو اپنے دن نظر آئے ہم نے آخر کار مجبور ہو کر یہ ٹھہرائی کہ جو ان کے اعتراض سننے والوں سے سنے ہیں ان کے جواب مجمع عام میں سنا دیں مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی اور ہم کو دوبارہ توحید و رسالت وغیرہ ضروریات دین اسلام بھی، کچھ عرض کرنا تھا، اور بوجہ ہجوم و بارش و خرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔ ایک جلسہ میں تو ان تینوں اعتراضات کے جواب سنائے جو سب میں مشکل تھے اور دو جلسوں میں (جیسا کہ حضرت فخر العلماء فرما چکے ہیں) توحید و رسالت کا ذکر کر کے شب بست و سوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا اور ایک دن منگلور اور دو تین دن دیوبند ٹھہر کر ستائیسویں کو اس قصبہ ویرانہ میں پہنچا جس کو نانوتہ کہتے ہیں اور اس خاکسار کا وطن بھی یہی ہے۔ آکر یہ چاہا کہ بنام خدا روبارہ اعتراض اپنے ارادہ مکنون کو پورا کروں یعنی ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں تاکہ ان کو اس نامۂ سیاہ کے حق میں دعا کا بہانہ ہاتھ آجائے اور خدائے تعالیٰ کی نجات و رحمت اور مغفرت کو اپنی کارگزاری کا موقع ملے۔ مگر الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرا ارادہ پورا کیا۔ اور میری فہم نارسا کے انداز سے کے مطابق اعتراضات مذکورہ کے جوابات مجھ کو سمجھائے۔ اب اول اعتراضات عرض کرتا ہوں اور ان کے ساتھ ان کے جوابات عرض کرتا ہوں" (قبلہ نما صفحہ ۲ اور ۳)۔

اس رسالہ کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں حضرت فخر العلماء کے ارشادات پہلے ہی پیش کئے جا چکے ہیں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس دیباچہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ شاید قبلہ نما کے علاوہ حضرت قاسم العلوم نے باقی اعتراضات کے جواب بھی لکھے تھے اور شاید وہ شائع ہو چکے ہیں۔ اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں رسالہ انتصار اسلام کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ بہر حال انہوں نے حضرت والا کے جوابات کے بارے میں یہ لکھ کر کہ "گو ان تحریروں کا باعث تو پنڈت دیانند ہی ہیں مگر اس طرح حضرت قاسم العلوم نے حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف عام فرما دیا۔ جناب گیلانی نے لکھا ہے کہ "بہر حال پنڈت جی کا مسلمانوں پر کعبہ پرستی اور کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کی پرستش و

عبادت کا الزام بجائے خود اس کی نوعیت جو کچھ بھی ہو، ان کے علم و فضل، فکر و نظر کے متعلق جو رائے بھی اس اعتراض کے سننے والے قائم کریں لیکن ہم تو پھر بھی گذار رہی ہیں کہ ان ہی کے بعض کلمے ہوئے تھے جن سے خیر کا دروازہ ہم پر کھل گیا۔ سیدنا امام الکبیر نے ان کی اسی مضحکہ خیز اپچ کے جواب میں حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف فرما دیا۔" اور اس ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب میں اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی سے اندازہ کیجئے، کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کل تین سطروں میں ختم ہو گیا لیکن متوسط تقطیع کے ایک سو سولہ (۱۱۶) صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اس لئے کافی ہوئے ہیں کہ سطریں حد سے زیادہ گنجان اور گھنی ہیں ورنہ عام کتابت کے لحاظ سے جہاں تک میرا تخمینہ ہے کم از کم تین سو صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہو سکتی تھی (سوانح قاسمی حصہ دوم صفحہ ۵۰۳)۔

راقم کو اس بات کا بہت افسوس ہے کہ انتصار اسلام جیسی اہم تصنیف جس کو حضرت فخر العلماء نے مرتب کیا تھا اور خود ہی اس کا نام تجویز کر کے اول بار شائع فرمایا تھا۔ سوانح قاسمی کی ترتیب کے سلسلہ میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کو فراہم نہیں کی گئی۔ اور اکابرین دار العلوم کے اس بورڈ نے جو جناب گیلانی کی اس عظیم تصنیف کی نظر ثانی کے لئے مقرر کیا گیا تھا کتاب کی طباعت سے قبل مسودہ میں انتصار اسلام کی نشاندہی بھی نہیں کی، حالانکہ اس قسم کی نشاندہی کے سوانح قاسمی میں متعدد نشان ملتے ہیں۔

جناب گیلانی نے انتصار اسلام کی اشاعت کے بارے میں صرف قیاس سے کام لیا ہے حالانکہ یہ کتاب عام طور پر دستیاب ہے۔ جناب گیلانی نے سوانح قاسمی، جلد دوم کے صفحہ ۵۰۲ میں ارقام فرمایا تھا کہ "سیدنا امام الکبیر نور اللہ قلوبنا انوار علومہ و معارفہ نے جواب میں حقائق و اسرار کے سربمہر گنجینوں کو وقف عام فرما دیا۔ صرف اسی اعتراض کا کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں، اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، جو مسلمان جواب دیتے ہیں بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں) جواب قبلہ نما میں شائع ہوا ہے جس کے مضامین پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ کتاب اردو میں ہے، پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

پنڈت جی کے باقی اعتراضات کیا تھے ان اعتراضوں کے جوابوں کو قلمبند کرنے کا موقع حضرت والا کو ملا یا نہ ملا اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ قبلہ نما کے دیباچہ کی مذکورہ بالا عبارت خصوصاً یہ ارقام فرما کر "ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کروں" آگے یہ اطلاع جو دی گئی ہے کہ "الحمد للہ خدا تعالیٰ نے میرے ارادے کو پورا کیا۔" بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس اعتراض کے سوا پنڈت جی کے دوسرے اعتراضوں کا جواب بھی زیر تحریر آ چکا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ ہو سکا۔"

کاش انہیں پتہ مل جاتا کہ حضرت فخر العلماء نے نہ صرف یہ کہ ان دس اعتراضوں کے جواب کا نام انتصار اسلام تجویز فرمایا بلکہ اس کی اشاعت کا بند و بست بھی فرمایا اور اسی رسالہ کے دیباچہ میں انہوں نے یہ بھی خبر دی کہ قبلہ نما عجیب و غریب ہے، غالباً کئی صدیوں سے کسی کان نے ایسے مضامین عالیہ نہ سنے ہوں گے اور نہ کسی آنکھ نے دیکھے ہوں گے۔" حضرت فخر العلماء نے قبلہ نما کے بارے میں اتنے زبردست الفاظ لکھنے کے بعد یہ بھی ارقام فرمایا کہ "زیادہ کیا عرض کروں۔ ناظرین بعد ملاحظہ خود دیکھ لیں گے۔ انشاء اللہ قبلہ نما بھی (انتصار اسلام کی طرح) طبع ہو کر شائع ہوا چاہتا ہے" ارباب دار العلوم دیوبند ہی اس بات کی وضاحت کر سکتے ہیں کہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کو حضرت قاسم العلوم کی سوانح ترتیب دینے کیلئے ضروری مواد کی فراہمی کے وقت کس بنا پر انتصار اسلام مہیا کرنے سے احتراز کیا گیا اور مسودہ کی وصولیابی کے بعد جب اس پر نظر ثانی کی گئی تو کن اسباب کے تحت مذکورہ بالا عبارت کی مناسب طور پر با حاشیہ اور فٹ نوٹ کے ذریعہ جیسا کہ کئی مقامات پر ہو چکا ہے تصحیح نہیں کی گئی۔

۶۔ مباحثہ شاہجہانپور

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۳۴۰ میں ارقام فرمایا ہے کہ موضع چاندا پور ضلع شاہجہانپور میں ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں جو تحقیقات مذاہب کے سلسلہ میں جو جلسہ ہوا تھا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے شرکت فرمائی تھی تو اس جلسہ کی پوری کیفیت منشی محمد حیات مہتمم مطبع ضیائی میرٹھ نے لکھ کر شائع کر دی لکھتے ہیں کہ "مولوی محمد قاسم صاحب نے ارادہ کیا اور ۵ رمئی ۱۸۷۶ء کو بعد عشا مع جمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے" لیکن اسی موضع چاندا پور میں جب اگلے سال ۱۹ ر ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو جلسہ ہوا تو اس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حقانیت اسلام پر جو تقریریں کیں۔ اور عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیا اس کو بھی (یعنی پہلے سال کی روداد کے علاوہ) مولانا فخر الحسن صاحب نے مباحثہ شاہجہاں پور کے نام سے شائع کیا۔" حضرت فخر العلماء نے مباحثہ شاہجہانپور کو اپنے اہتمام سے پہلے ضروری اور تفصیلی حواشی کے شائع فرمایا۔ راقم کی نگاہ سے اس کے دو ایڈیشن گزرے ہیں جس کا ٹائیٹل ایک ہے صرف ایک ایڈیشن میں سنہ ۱۹۰۴ء کا سن پڑا ہے اور دوسرے پر سنہ ۱۹۱۲ء کا۔ ٹائیٹل کا مضمون یہ ہے

دکلمۃ اشرمی العلیا

الحمد اللہ والمنۃ کہ مجموعہ تقریرات اعتراضات المشہور بہ نزدیک و دور

مباحثہ شاہجہاں پور

کہ رئیس المتکلمین جناب سیدنا و مولانا مولوی محمد قاسم الخیرات در مجمع عام با پنڈت دیانند و منشی اندرمنی و پادری اسکاٹ مفسر انجیل و پادری نولس صاحبان وغیرہ در سنہ ۱۲۹۵ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بمقام شاہ جہانپور کردہ بودند اس کے بعد صفحہ دو پر دیباچہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع ہوا۔ اس کے بعد یہ شعر ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید از دے رو متاب

اس کے بعد یہ الفاظ تحریر ہیں۔ "یا اللہ تیری ذات پاک سب پر محیط ہے اور سب پر غالب سب تیرے جویان اور سب تیرے طالب۔ لیکن تیری معرفت وہم کی رسائی سے الگ۔ خیال کی بخالی سے پرے قیاس کی وسعت سے باہر ہے اس لئے تیرے سچے رسول نے وہمی خداؤں کی بندگی سے دنیا کو چھڑایا اور جو قدرتی اصول تو نے ہر انسان کے دل میں رکھ دیئے ہیں ان کو شگفتہ کیا۔ تیرے کلام پاک نے ایمان بالغیب کی تعلیم دی اور تیری جانب رجوع کرنے کا ایسا طریقہ سکھایا جو فی الحقیقت ہماری بندگی اور تیری خدائی، ہمارے نقص اور تیرے کمال کے لئے شایان شان ہے۔ یا اللہ تیرا سب سے پچھلا مگر سب سے افضل رسول جو تیرے مقدس کلام سے گویا ہوا اور جس نے تیری روشن ہدایت سے عقل کو نور اور دل کو سرور بخشا اس نے ایسا علم اور ایسی مستقیم راہ نسل انسانی کو بتائی ہے کہ انسان کے حق میں کامل رحمت اور اعلیٰ نعمت ہے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔ لیکن طالب صادق اور شوق کامل درکار ہے۔ اب بھی نائبان رسول اور علماء فحول ایسے موجود ہیں کہ جن کا بیان منشائے الٰہی کی تفسیر اور علم انبیاء علیہم السلام کی تشریح ہے۔ اور اس سے سامعین کے دل کو تشفی اور پڑھنے والوں کے قلب کو کامل خوشی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ میلہ خداشناسی واقع شاہ جہانپور میں جو علماء اسلام و ہندو و عیسائیوں کا مباحثہ ہوا اس کی کیفیت ناچیز کمترین انام فخر الحسن نام اہل نظر کے روبرو پیش کرتا ہے" اس کے بعد حضرت فخر العلماء نے میلہ خداشناسی کی پوری روداد سال گذشتہ کے واقعات اور متعلقہ تقاریر کو پیش کرنے کے بعد آخر میں یہ بتایا کہ آپ نے حسب ضرورت تقریروں کے سلسلہ میں ضروری حواشی لکھے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "اب التماس راقم الحروف یہ ہے کہ کمترین نے تا مقدور اصل حال میں کمی بیشی نہیں کی۔ اس لئے جو باتیں ایسی تھیں کہ کسی تقریر سے مستنبط ہوتی تھی یا اس کے مناسب

تھی۔ پر اس کے ذکر کی نوبت نہیں آئی تھی اس کو حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔ البتہ اس وقت کے الفاظ یاد نہیں رہے۔ اور نہ بہت سے مضامین کی ترتیب پر اطمینان ہو سکتا ہے۔ عجب نہیں کہ تقدیم تاخیر ہوگئی ہو۔ اطلاعاً عرض کر دیا کہ کسی صاحب کو اور کچھ احتمال نہ ہو مگر ہاں یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس میں عمداً کوئی بات نہ زیادہ یا کم نہیں کی ......"

اس فٹ نوٹ سے پھر اس بات کا اظہار ہوتا ہے جس کا ذکر اس سے قبل تقدیر دل پذیر اور حجۃ الاسلام کے سلسلہ میں ہو چکا ہے کہ حضرت فخر العلماء کو علوم قاسمی کا صحیح ادراک تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد کے مضامین اور رسائل کی اشاعت کے موقع پر ضروری اضافے اور ضروری حواشی رقم فرمائے اور ان کے علاوہ کسی اور شاگرد قاسمی نے یہ جرأت نہیں کی۔

۷۔ گفتگوئے مذہبی:-

مولانا عبدالروف عالی نے دارالعلوم اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارے میں "حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کی تصانیف" کے سلسلہ میں اپنے مضمون کی جو آخری قسط شائع فرمائی ہے اس کے مطابق گفتگوئے مذہبی جس کا تاریخی نام میلہ خدا شناسی ہے پہلی بار سنہ ۱۲۹۴ھ میں طبع ہوئی۔ سنت متذکرہ بالا کے بقول حضرت نانوتوی کی یہ تصنیف اردو میں ہے۔ اور ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا عالی نے لکھا ہے کہ "شاہ جہانپور کے ایک ہندو رئیس نے بغرض تحقیق مذاہب ایک مجلس مباحثہ منعقد کی تھی۔ یہ اس مجلس کی تفصیلی روداد ہے۔ جس میں حضرت قاسم العلوم دعوت اسلام پیش کرنے کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ اس اجتماع میں آپ نے میاں یوں کے اعتراضات کو مکمل رد فرمایا۔ پہلے عقائد اسلام کی وضاحت اور اس کے بعد نصاریٰ کے مسلک پر تقریر فرمائی۔ دو روز مباحثہ جاری رہا، دوسرے روز مسئلہ تقدیر پر آپ کی مفصل تقریر ہوئی جس میں تثلیث کا رد کیا گیا اور خدا کی ملوکیت کو بنائے تقدیر ٹھہرایا اور اس کے دلائل بیان فرمائے۔ چونکہ یہ اس اجتماع کی تفصیلی روداد ہے اس لئے مسترقین کے اعتراضات اور جزوی واقعات بھی قلمبند کئے گئے ہیں۔ غالباً یہ مولوی فخر الحسن کی صاحب کی تحریر ہے۔ خود حضرت نانوتوی کی تحریر نہیں مگر اس میں آپ ہی کے مضامین عالیہ اور تقریریں درج ہیں۔ جو اگرچہ تفصیل اور اس دقت لفظی کی حامل نہیں جو آپ کے دوسرے مضامین میں ملتی ہیں مگر انداز اور اصول وہی ہیں جو آپ کے علوم اور معارف کے لئے مخصوص ہیں۔ زبان بھی اجتماع کی رعایت سے سہل استعمال کی گئی ہے۔" راقم الحروف کی رائے میں یہ بات شبہ سے بالاتر ہے کہ اس تصنیف کا املا حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کا ہے اس لئے کہ راقم الحروف کے سامنے گفتگوئے مذہبی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی سن ۱۳۲۴ھ کا جو نسخہ ہے اس کے صفحہ تین کی آخری سطر میں حضرت فخر العلماء کی شاہجہان پور میں موجودگی اور حضرت قاسم العلوم کی رفاقت کا تذکرہ ہے اور ناشرین کی حیثیت سے محمد ہاشم علی مہتمم مطبع ہاشمی اور محمد حیات مہتمم مطبع ضیائی کا نام درج ہے مگر جیسا کہ اس زمانہ کا دستور ہے۔ مولف کی حیثیت سے کسی کا نام درج نہیں لہٰذا مولانا عالی کا یہ اندازہ بالکل صحیح ہے کہ اس تحریر کا املا حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کا ہے جو ناشرین کے برعکس شاہ جہاں پور کے اس میلہ خدا شناسی میں حضرت قاسم العلوم کے ہمراہ تھے۔ اور خود انہوں نے مباحثہ شاہ جہانپور کے صفحہ ۳ پر اس کا ذکر کیا ہے۔

۸۔ قاسم العلوم:-

جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے اس نام سے حضرت قاسم العلوم کے وہ دس مکاتیب جو رسالہ قاسم العلوم اول، دوم، سوم اور چہارم میں الگ الگ اور الگ الگ تاریخوں میں دہلی سے طبع ہوئے تھے، اور جن میں تین خط حضرت مولانا فخر العلماء کے نام تھے اب پاکستان میں یکجا طور پر مولانا انوار الحسن شیرکوٹی کے اہتمام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان تمام خطوط کی زبان اس دور کے رواج کے مطابق فارسی ہے مگر قاسم العلوم کی حالیہ اشاعت میں فارسی عبارت کے بالکل متصل اردو میں ترجمہ بھی

موجود ہے جو حضرت شیرکوٹی کے قلم کی پیداوار ہے لیکن مولانا سید عبدالرؤف عالی کے مضمون کے مطابق جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، حضرت فخر العلماء کے نام حضرت قاسم العلوم کے متذکرہ بالا تین خطوط فخر العلوم کے نام سے ۱۲۹۲ھ میں طبع ہو چکے ہیں۔ یہ فارسی زبان میں ہیں اور ان کا موضوع حکمت شرعیہ ہے۔ مولانا عالی نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں لکھا ہے کہ "قاسم العلوم میں آپ کا ایک مکتوب نہم کے نام سے درج ہے۔ جو مولوی فخر الحسن کے نام ہے۔ اس میں شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر سے تفصیلی بحث ہے۔ چند مقدمات قائم کرکے بالترتیب ہر مقدمہ پر تفصیلی گفتگو ہے۔ پہلے حضرت حسین رضؓ اور اہل بیت کی مسلمہ حیثیت کے بارے میں روافض اور اہل سنت کا جو بنیادی اختلاف ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے پھر نظریہ امامت عزل ونصب خلیفہ خلع بیعت معصومیت آئمہ اور ناقضین بیعت کی حیثیت اور واقعات کربلا کی نوعیت پر علمائے اہل سنت کی آراء بیان کی گئی ہیں۔ اس پورے بحث پر حضرت والا (مولانا نانوتوی) نے پندرہ اصول اہل سنت کی جانب سے پیش فرمائے ہیں محققانہ اور مجتہدانہ طرز نگارش پوری طرح نمایاں ہے۔ دوسرے خط مکتوب دہم کے نام سے انیس مضمون پر مشتمل ہے اس میں مشہور شیعی محقق طوسی کے اعتراضات کا رد ہے۔ عقلی و نقلی دلائل بڑی خوبصورتی اور دلنشینی کے ساتھ پورے خط میں موجود ہیں۔ گیارہواں خط ایک مشہور حدیث کی توضیح پر مبنی ہے۔ اور سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ روافض نے اس حدیث کو جو غلط معنی پہنائے ہیں ان کی تردید اور تاریخ و سیر کی روشنی میں صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ اس خط میں اگرچہ آپ کے مخصوص کلامی رنگ کی جھلک کم ہے لیکن بحث اپنی جگہ وزنی ہے۔ مولانا شیرکوٹی نے متذکرہ بالا مکتوب نہم کا فارسی سے اردو میں جو ترجمہ فرمایا تھا وہ بھی ایک الگ مضمون کی صورت میں دارالعلوم میں شائع ہو چکا ہے۔ اور راقم الحروف نے ان خطوط کا نسبتاً تفصیلی ذکر آگے چل کر کیا ہے جو اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۹- قصائد قاسمی :-

حضرت قاسم العلوم کی تصنیفات میں جن کا تعلق حضرت فخر العلماء سے ہے یہ نویں تصنیف ہے جو حضرت قاسم العلوم کی ادبی اور شعری حیثیت کا لوہا منواتی ہے۔ یہ قصائد ابتداء میں حضرت فخر العلماء کی زیر نگرانی میں ۱۳۰۹ھ میں طبع ہوئے تھے اور اس کا تذکرہ قصائد قاسمی کے صفحہ ۱۴ اور ۱۵ پر موجود ہے۔ یہ تصنیف مکتبہ رشیدیہ ملتان بیرون جوہڑ گیٹ نے عبداللہ محمد قاسم ملتانی شائع کی ہے جناب انوار الحسن شیرکوٹی کے مطابق "اس میں" ان تمام اردو، فارسی اور عربی اشعار کو شامل کر دیا گیا ہے جو حضرت قاسم العلوم کی تصنیف ہیں۔ یہ اشعار تعداد میں ۳۹۲ ہوتے ہیں۔" ان میں سے پہلا قصیدہ بہاریہ ہے جو سرکار دو عالم تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت والہانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اور جو عشق رسول میں سراپا محویت کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس نعتیہ قصیدہ میں ایک سو اکیاون اردو اشعار ہیں۔ دوسرا قصیدہ بھی اردو زبان میں سلطان عبدالحمید خان خلد اللہ ملکہٗ کی شان میں لکھا گیا ہے۔ اس قصیدہ میں ۵۶ اشعار ہیں۔ جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کو خلیفۃ المسلمین سے کتنی گہری عقیدت تھی۔ قصائد قاسمی کا تیسرا قصیدہ بھی خلیفۃ المسلمین کی شان میں ہے مگر اس قصیدہ کی زبان فارسی ہے۔ اس قصیدہ میں ۹۴ اشعار ہیں اور ان میں بھی اردو قصیدہ کی طرح سلطان عبدالحمید خان سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ چوتھا ایک اور قصیدہ ہے جو عربی زبان میں ہے یہ بھی سلطان مذکور کی توصیف میں ہے اور ۴۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ پانچواں شجرہ خاندان چشتیہ صابریہ ہے۔ جو فارسی اشعار میں مولانا نے لکھا ہے اور جس کے اول و آخر میں دعائیہ اشعار ہیں۔ یہ منظوم شجرہ ۲۷ اشعار میں پھیلا ہوا ہے۔" اس کے علاوہ قصائد قاسمی میں تین عربی قصائد جو سلطان عبدالحمید خان کی شان میں ہیں حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے بھی شامل ہیں۔ قصائد قاسمی میں "قصائد عربیہ" کے عنوان کے تحت جو

عبارت عربی میں درج ہے اس میں تحریر ہے کہ عربی تصانیف حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کی تحریک پر لکھے گئے ہیں اور اس عبارت عربی میں حضرت فخر العلماء کے نام کے ساتھ جو القاب لکھے گئے ہیں وہ کم از کم دو سطروں میں ہیں۔ متعلقہ عبارت کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ "اب میں ان چند مدحیہ قصائد کا ذکر کروں گا جو دولت عالیہ (خلیفۃ المسلمین) کے ادائے شکر کے طور پر مدارس اسلامیہ کے متعدد علماء نے فاضل اجل وحید المثال، حضرت مولانا مولوی محمد فخر الحسن سلمہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر جنھوں نے ان حضرات میں دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا۔ لکھتے ہیں" ان تعریفی کلمات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت فخر العلماء اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی نگاہ میں کس قدر قابل احترام تھے اور آپ کے مشوروں کو کس قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

۱۰۔ تحذیر الناس :-

میں اس سلسلہ میں دار العلوم دیوبند کے مفتی اعظم مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی کے اظہار خیال کے صرف اس حصہ کی نقل ہی پر اکتفا کروں گا جو اس کتاب سے متعلق ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ "تحذیر الناس تصنیف کی گئی اور اس پر اعتراضات کئے گئے تھے ان کے جوابات میں بھی مولانا کے حضرت فخر العلماء کے قلم نے خوب جوہر دکھائے۔ اس رسالہ کی اشاعت کے موقع پر بھی فخر العلماء نے مفید حواشی لکھے ہیں۔

تربیت قاسمی کے ثمرات :-

حضرت قاسم العلوم نے جن افراد کو اپنے مخصوص نظریات کی ترویج واشاعت اور ہندوستان میں بقائے اسلام، اصلاح رسوم اور فرنگی حکومت اور اس کی زیر سرپرستی فرنگی مبلغوں اور پھر ان فرنگی اثرات کے تحت اپنے نظریات اور طرز زندگی بدلنے والے مسلمانوں کی تالیف قلوب اور سب سے بڑھ کر جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں جو ذہنی اور فکری اضمحلال اور پستی، بے ہمتی، مایوسی اور یاس کا عالم طاری ہوگیا تھا اس کو دور کر کے انہیں از سر نو فرنگیوں کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے اصلی دشمن اور سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا عزم وارادہ رکھتے تھے تیار کرنے کے قاسمی پروگرام کو چلانے کے لئے تیار کیا تھا ان میں حضرت فخر العلماء کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ قاسمی پروگرام کے چار بنیادی مقاصد تھے۔

۱۔ فرنگی تسلط کیخلاف جدوجہد میں شرکت :-

پہلا پروگرام یہ تھا کہ جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ولی اللہی تحریک کی نئے خطوط پر ترتیب ہو تاکہ دار الحرب ہندوستان کو ایک بار پھر فرنگی تسلط سے آزاد کیا جائے۔ یہ کام مدرسوں کے ذریعہ ہو سکتا تھا کیونکہ نئے حالات میں براہ راست تحریک چلانا اور رضا کار تیار کرنا اور فوجی تیاریاں کرنا مناسب نہیں تھا۔ یہ کام اب مکتب میں بیٹھ کر اور مدرسوں کے در و دیوار کے سایہ میں ہو سکتا تھا۔ جہاں نئے انقلاب کے ورکر آسانی کے ساتھ تیار کئے جاسکتے تھے اور ان کے کردار و عمل کی اصلاح اور تربیت سے ایک ایسے گروہ کو پیدا کیا جاسکتا تھا جو نئی تحریک کو ملک کے کونہ کونہ میں پھیلائے اور اپنے اپنے مقام پر داعی اور نقیب کا کام کرے۔ اس پروگرام کی کامیابی کا یوں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برصغیر کی تحریک آزادی کے دو حلقوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ میں حضرت قاسم العلوم کے نام لیوا صف اول میں شامل تھے اور اس سے قبل ریشمی رومال اور خلافت کی تحریک ان کے نام سے سرخرو تھی۔ حضرت قاسم العلوم نے اس پروگرام کے تحت دار العلوم دیوبند قائم فرمایا۔ اور اپنی کوشش اور کاوش سے دینی مدارس کا ایک جال ملک کے کونہ کونہ میں پھیلا دیا۔ ان کی ان ہی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ ملک میں کم از کم دو ہزار دینی مدارس ایسے قائم ہوگئے جن کو براہ راست ان کے تربیتی پروگرام کا مرکز کہا جا سکتا تھا۔ حضرت قاسم العلوم نے اپنے اس تربیتی پروگرام کے آغاز میں دار العلوم دیوبند اور اس کے

ملحقہ دینی اداروں کی قیادت اپنے تربیت یافتہ گروہ کے حوالے کی۔ دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہند کی نگرانی میں مدرسہ عربیہ گلاؤٹھی حضرت سیدالعلماء کی نگرانی میں اور مدرسہ قاسمیہ عربیہ نگینہ حضرت فخرالعلماء کی نگرانی میں دیدیئے گئے اور جب حالات نے تقاضا کیا کہ دہلی میں تربیتی مرکز قائم کئے جائیں تو سب سے پہلے فخرالعلماء اور سیدالعلماء کو مدرسہ عبدالرب میں درس دینے کے لئے حوصلہ افزائی کی گئی اور بعد میں یہ مدرسہ اپنے ایک اور شاگرد مولوی عبدالعلی کے سپرد فرمایا۔ ان کے علاوہ نورجہ مرادآباد اور امروہہ میں حضرت سیدالعلماء کی نگرانی میں تین مختلف عربی مدارس کو کامیاب بنانے کیلئے حضرت سیدالعلماء کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا گیا۔ مولانا منصور علی خان کو منگلور کے مدرسہ میں مقرر فرمایا گیا اور دارالعلوم دیوبند کے ایک اور شاگرد اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے حقیقی نواسے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری دارالعلوم دیوبند کے بعد برصغیر کے دوسرے سب سے اہم دینی مدرسہ مظاہرالعلوم کے صدر مدرس بنائے گئے اور حضرت فخرالعلماء کو نورجہ بھیجا گیا۔ حضرت قاسم العلوم نے لمبی زندگی نہیں پائی نگران کی ۴۹ سالہ مختصر مدت حیات میں اتنے بہت سے دینی مدرسوں کا قائم ہونا اور فرنگیوں کی بدگمانیوں، حوصلہ شکنی اور مخالفت کے باوجود جس میں ابنائے وطن کی کدورتوں کو بھی دخل حاصل ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر کامیابی حاصل کرنا بلاشبہ قدرت خداوندی کا ظہور ہے مگر یہ ظہور حضرت قاسم العلوم کی ذات بابرکات کی صورت میں نمایاں ہوا۔

حضرت فخرالعلماء جب حضرت قاسم العلوم کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے تو وہ ہر طرح قاسمی پروگرام کی اس شق کو کامیاب بنانے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر حضرت قاسم العلوم جنگ آزادی کے دوران اہل فرنگ کے مقابلہ میں توپ و تفنگ کے ساتھ ہی نہیں لسانی اور قلمی میدان میں بھی صف آرا رہے تھے اور اس بنا پر فرنگیوں کے معتوب قرار پائے۔ فرنگی استبداد اور فرنگی وارنٹ سے بچنے کے لئے چھ ماہ روپوش ہوئے اور اس عرصہ میں ان کی گرفتاری کی تمام کوششیں خدا کے فضل و کرم کے سبب کامیاب نہ ہو سکیں تو حضرت فخرالعلماء بھی معتوبین فرنگ کی صف میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت کے نواسے تھے جن کو انگریز دشمنے جنگ آزادی کا رکن رکین بلکہ خرکت سمجھتے ہوئے توپ کے دھانے پر رکھ کر اڑا دیا یعنی حضرت شاہ حسن عسکری شہید اور ان کے والد جو جنگ آزادی سے قبل اور اس کے دوران اپنے خسر کے سچے رفیق تھے یعنی شاہ عبدالرحمٰن اور جن کو محض اس بنا پر انگریزوں نے چھوڑ دیا کہ وہ موت و حیات کی کشمکش یعنی کینسر کے مہلک مرض میں گرفتار تھے نے خاص طور پر اپنے بڑے بیٹے میں حریت کی ایسی لگن پھونک دی تھی کہ ان کے استاد اور حضرت قاسم العلوم کے رفیق درس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو ان کے بارے میں (حضرت فخرالعلماء) یہ لکھنا پڑا کہ وہ وارستگی مزاج میں مولانا کے قدم بہ قدم بلکہ کچھ بڑھ کر تھے۔ یہ وارستگی مزاج آزادی کی سچی لگن اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کی شروع کرنے کی وہ تڑپ تھی جو حضرت قاسم العلوم کا خاص ورثہ تھی اور جس کا مظاہرہ حضرت والا کی اس تقریر سے ہوا جس کے باعث اکابرین دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ کی زیر قیادت معرکہ تھانہ بھون اور معرکہ شاملی میں خوش دلی اور پورے جوش ایمانی کے ساتھ شریک ہوئے۔

حضرت فخرالعلماء حلقہ قاسمی میں شامل ہونے سے پہلے ہی جہاد آزادی کے ایک پرجوش کارکن بن چکے تھے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ آزادی کی یہی لگن اور فرنگیوں کے خلاف ان کا یہی جذبہ انہیں گنگوہ سے دیوبند لے گیا ورنہ علمی میدان میں حضرت گنگوہی کی قربت اور موجودگی ان کے لئے دارالعلوم دیوبند کے نعم البدل کا کام دے سکتی تھی۔ آزادی کا یہی جذبہ اور فرنگیوں کے استبداد کے خلاف جدوجہد کا یہی عزم انہیں گنگوہ سے دیوبند لے گیا جہاں حضرت قاسم العلوم کی محبت، توجہ اور تربیت نے دوآتشہ کا کام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں میں جدوجہد اور جذبہ اور تڑپ کے لحاظ

سے اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ آپ دیوبند میں رہے تو آزادی وطن کے جذبہ کے ساتھ اور اس کے بعد جب آپ کو آپ کے استاد نے نگینہ، دہلی، سہارنپور اور خورجہ بھیجا تو یہاں بھی آپ نے قاسمی پروگرام کی اس شق کے تکملہ کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی اور درس و تدریس کے ذریعہ اپنے شاگردوں کو قاسم العلوم کا پیغام آزادی پہنچاتے رہے۔ دینی اور مذہبی مدرسوں کے قیام کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ نئی جنگ آزادی کے لئے مجاہد اور رضاکار تیار کئے جائیں بلکہ یہ بھی تھا کہ مسلمان نوجوانوں میں استعداد اور صلاحیت پیدا کی جائے تاکہ وہ تحریک آزادی کے ہراول دستے کی قیادت کرنے کے اہل بھی ثابت ہو سکیں۔ استعداد اور صلاحیت دارالعلوم دیوبند اور اس کے ملحقہ دینی اور مذہبی اداروں کے نصابی پروگرام کا ایک جز تھا جس کی بناء پر علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جسے عام طور پر علمائے حق کہا جاتا ہے اور جن کے کارناموں سے ہماری تاریخ آزادی عبارت ہے۔ حضرت فخر العلماء نے اپنی استعداد اور صلاحیت سے حضرت قاسم العلوم کے پروگرام کی اس بنیادی شق کو بھی کامیاب بنایا۔ آپ کی اپنی تصانیف اور پھر اپنے استاد گرامی کی تصانیف کی کماحقہ اشاعت اس میدان میں آپ کی کامیابی کی دلیل ہیں۔

۲۔ عیسائی اور ہندو مبلغین کی یلغار کا کامیاب مقابلہ

فرنگیوں نے جنگ آزادی سے قبل محدود پیمانے پر اس لئے کہ وہ اس وقت تک براہ راست حکمراں نہیں بنے تھے اور جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ملک گیر پیمانے پر چونکہ اب وہ تمام ہندوستان کے بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھے ہندوستانی آبادی کو جس میں مسلمان بھی شامل تھے عیسائی بنانے کی کوشش کی۔ ان کی اس ضمن میں ایک کوشش تو یہ تھی کہ پہلے انگریزی زبان کو فروغ دیا جائے۔ پھر انگریزی کے مدارس کھول کر ہندوستانی نوجوانوں کو ذہنی اور عملی طور پر عیسائی بنایا جائے اور انہیں مغربی طرز حیات کا دلدادہ بنایا جائے اور آخر میں ملازمتوں کا لالچ دیا جائے۔ تاکہ انگریزی اخبار نویسوں کے بقول جنگ پلاسی کی دوسری صد سالہ تقریبات کے موقعے پر تمام ہندوستان عیسائی نظر آئے۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے بھی یہی مقاصد تھے۔ انگریزوں کے پاس اقتدار تھا، سرمایہ تھا علوم جدیدہ کی نگاہیں خیرہ کرنے والی تجلیاں تھیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلمان شکست خوردہ، افلاس زدہ، مایوسیوں اور محرومیوں کے شکار اور سب سے بڑھ کر احساس کمتری میں مبتلا۔ حضرت قاسم العلوم نے اس کا ایک تدارک تو یہ کیا کہ انہوں نے دیوبند اور دوسرے مقامات پر مدارس قائم کئے۔ علم قدیمہ کی افادیت و اہمیت پر زور دیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ضرور ناکام ہوئی ہے مگر اسلام کو شکست نہیں ہوئی۔ ان کا یہ پروگرام "اپنی مدد بہ آپ کرو" کے اصول پر ترتیب دیا گیا تھا جس میں سرکاری امداد کو قبول کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ حضرت قاسم العلوم اور ان کے ساتھیوں نے انتہائی بے سروسامانی کے باوجود محض اللہ کے توکل پر اپنے کام کو جاری رکھا اور انہیں ان کے مشن میں کامیابی ہوئی مگر ایک میدان اسی ضمن میں ایسا تھا جہاں انہیں حکومت وقت سے براہ راست ٹکر لینا پڑی۔ یہ میدان تبلیغ کا میدان تھا مگر یہاں بھی بہ ظاہر پلڑا عیسائی مبلغین کے حق میں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ حلقہ فاتحین میں شامل تھے۔ دوسرے یہ کہ انہیں وقت کے حکمرانوں کی حمایت حاصل تھی۔ تیسرے یہ کہ انگریزوں کا انصاف یعنی فرنگی عدالتوں کے جج بھی ان فرنگی مبلغین کی حمایت میں سینہ سپر تھے اور اسی حمایت میں وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی انصاف کا گلا گھونٹنے پر تیار رہتے تھے۔ چوتھے یہ کہ ان فرنگی مبلغین کے قبضہ میں ملازمتیں تھیں، نوکریاں تھیں، اعزاز و اکرام کی بارشیں تھیں۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ مایوسی تھی، بے حسی تھی، پستی تھی اور ان کی قوت عمل اور قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود حضرت قاسم العلوم اور ان کے شاگرد جن میں حضرت فخر العلماء سر فہرست ہیں جان پر کھیل کر سامنے آئے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عیسائی مبلغین اور ان کی شہ پر سرگرم عمل ہونے والے

ہندو مبلغین کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ردِ نصاریٰ میں صرف حضرت قاسم العلوم اور ان کے شاگردوں ہی نے حصہ نہیں لیا بلکہ دوسرے مسلمان مبلغین بھی اس میں پیش پیش رہے مگر یہ واقعہ ہے کہ دہلی اور اس کے بعد شاہجہان پور، رڑکی اور میرٹھ کے مناظروں میں مسلمانوں کی کامیابی کا تمام تر انحصار حضرت قاسم العلوم پر رہا۔ اور ان کی معاونت کے لئے ان معرکوں میں ان کے جو شاگرد ان کے ہمراہ تھے ان میں تواتر کے ساتھ حضرت فخر العلماء کا نام آتا ہے اور یہی نہیں بلکہ ان معرکوں کی قلمی روداد یں مرتب کرنے اور ان معرکوں میں حضرت قاسم العلوم کی تحریروں اور تقریروں کو شائع فرما کر حضرت فخر العلماء نے وہ اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس پر مسلمانوں کو بالعموم اور حضرات دیوبند کو بالخصوص حضرت فخر العلماء کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ آج حضرت قاسم العلوم کی وہ کاوش جو انہوں نے عیسائیوں کے خلاف انجام دیں۔ ہماری تاریخ کا ایک اہم حصہ اس لئے بنی ہیں کہ ان کے شاگرد رشید نے ان کی تشہیر اور ترتیب کا کام انجام دیکر انہیں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۹۵ میں عیسائیت کی تبلیغ اور عیسائی مبلغین کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے اور جناب امداد صابری نے اس سلسلہ میں ایک مفصل اور مدلل کتاب بھی تصنیف فرمائی ہے مگر اس کا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں، بہر حال اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ جن عیسائی مبلغین نے ہندوستان کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں جا کر تقریریں کیں ان میں جنگ آزادی سے قبل پادری رابرٹ کلادک، پادری عماد الدین پانی پتی، پادری کالی چرن، اینڈریو گاڈ ڈ ف، پادری وارث الدین، تھامس سٹرٹ، پادری دینا ناتھ، ڈاکٹر جے۔ سی ارلنگر، پادری جی۔ ایل ٹھاکر، ڈاکٹر تھیوڈور لانشن، پٹل، پادری طالب الدین، پادری رام چندر، پادری ترنس، پادری فنڈر، پادری اینگ کا نام قابل ذکر ہے۔ مگر چونکہ ہندوستان پر اس وقت تک انگریزوں کا مکمل تسلط نہیں ہوا تھا اس لئے مسلمانوں میں کلی طور پر احساس شکست موجود نہیں تھا بلکہ عیسائیت کا خطرہ کا جیسا جیسا احساس شدید ہوتا جاتا تھا مسلمانوں میں عام طور پر اور مسلمان علماء میں خاص طور پر دین کی حفاظت کا جذبہ پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اور شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزند اکبر شاہ عبد العزیز کے متبعین اور مقلدین اپنی سرگرمیوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ کرتے جاتے تھے۔ اور عیسائی مبلغین کے مقابلہ میں جن سر کردہ علماء نے حصہ لیا ان میں پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی کے بقول "شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی، مولانا ال حسن، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان صاحب اکبر آبادی، مولانا شرف الحق صاحب صدیقی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا عبد المنصور صاحب دہلوی کا نام قابل ذکر ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے کئی مناظروں میں جن میں آگرہ کا مناظرہ جو ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو ہوا تھا شامل ہے پادری فنڈر کا قلع قمع کر دیا۔ لیکن جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد رد عیسائیت کی سرگرمیوں کا محور حضرت قاسم العلوم کی ذات گرامی تھی، جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے تو یہ فرمایا ہے (انوار قاسمی صفحہ ۴۹۷) حضرت قاسم العلوم بحیثیت مبلغ اسلام کسی معاملہ میں اپنے آپ کو پابند نہ رکھتے تھے۔ وہ اللہ کے مجاہد اور مبلغ تھے۔ آج نانوتہ، کل دیوبند، کچھ دن میرٹھ تو بعض ایام دہلی، دین کے لئے جہاں ضرورت پڑتی دوڑ جاتے اس لئے دار العلوم دیوبند کا سب کچھ ہونے کے باوجود بحیثیت مستقل استاد کام کرنے کا انہوں نے کبھی ارادہ ہی نہیں رکھا۔ جہاں جاتے عشاق طالب علم ساتھ ہوتے۔ ان عشاق شاگردوں میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، حضرت فخر العلماء بھی شامل تھے۔ آپ کا پہلا معرکہ پادری تارا چند سے بقول مولانا محمد یعقوب صاحب ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب کے بقول "مولوی صاحب نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو اور جہاں لوگ بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو۔" جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے یہ بات ذرا اور وضاحت سے بیان کی ہے۔" آپ فرماتے ہیں کہ" حضرت قاسم العلوم نے جب ان پادریوں کی یہ ڈھٹائیاں اور

کلیلیں دیکھیں تو نہ رہا گیا۔ عموماً جہاں حضرت قاسم العلوم قیام پذیر ہوتے شاگرد بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی وہیں جاری رہتا تھا۔

منعم بہ وشت کدہ و بیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

بہر حال شائقین علم اور عشاق شاگرد بھی خانہ بدوشوں کے ہمراہ ہوتے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قاسم العلوم نے اپنے شاگردوں کو عیسائیوں کے جواب کیلئے فرمایا کیونکہ ان کو اس مقصد کے لئے مناسب سمجھا۔ لیکن جب شاگردوں کے جوابات کا سلسلہ عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے چل نکلا تو حضرت قاسم العلوم تک نوبت پہنچی۔" (انوار قاسمی۔ صفحہ ۴۹۹) مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی میں فرمایا کہ "آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی قاسم صاحب بے کس شکل و صورت بنائے اور اپنا نام چھپائے موجود ہوئے ایک پادری تاراچند تھا اس سے گفتگو ہوتی اور آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا۔" یہ دراصل حضرت فخر العلماء کی مناظروں میں شرکت کا نقطۂ آغاز اور اسی کام کے لئے خاص طور پر قاسم العلوم نے انہیں تیار کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت قاسم العلوم مجموعۂ خطوط قاسم العلوم کی تصحیح کے سلسلہ میں دہلی میں منشی امتیاز علی صاحب کے یہاں مقیم تھے اور بقول جناب امیر شاہ خاں صاحب مصنف امیر الروایات مولوی فخر الحسن گنگوہی اور مولوی احمد حسن امروہوی کی وجہ سے اکثر مدرسہ عبدالرب میں جہاں یہ دونوں شاگرد مدرس تھے اور مقیم تھے قیام فرمایا کرتے تھے

حضرت قاسم العلوم کا دوسرا معرکہ عیسائی اور ہندو مبلغین سے ۷، ۸ مئی ۱۸۷۶ء کو چاندا پور ضلع شاہجہانپور میں ہوا۔ جہاں ان کا مقابلہ پادری نولس ماسٹر شاہجہانپور اسکول، پادری مولاداد خاں، پادری اینک، مسٹر جونٹل اور پیارے لال کبیر پنتھی وغیرہ سے ہوا۔ حضرت قاسم العلوم اس مباحثہ میں شرکت کے لئے ۵ مئی کو بعد عشا بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند ضلع سہارنپور و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور (سہ شاگردان قاسمی) ریل پر پہنچے۔" (انوار قاسمی صفحہ ۵۰۱) آپ ۶ مئی کو شاہجہانپور پہنچے اور ۷ مئی کو تقریر فرمائی۔ آپ کی دوسری تقریر ۸ مئی کو ہوئی۔ اور اسی روز تیسری بار بھی تقریر فرمائی۔ اور اس طرح میدان جیت لیا۔ اس کا ثبوت وہ اخباری رپورٹ ہے جو اخبار خیر خواہ عالم دہلی کی اشاعت مورخہ ۱۹ مئی میں شائع ہوئی۔ یہ اخبار دہلی محلہ بلبلی خانم سے ۱۸۷۳ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ مہینہ میں تین بار یعنی ۵، ۱۵ اور ۲۵ کو نکلتا تھا۔ مالک اس کے سید میر حسن رضوی اور ایڈیٹر شہزادہ عبدالغنی تھے اور مطبع احمدی سے شائع ہوتا تھا۔ میلہ خداشناسی کی رپورٹ یہ ہے "۸ مئی ۱۸۷۶ء کو شاہجہانپور میں میلہ خداشناسی منعقد ہوا کئی روز پیشتر اخباروں میں میلہ مذکور کے باب میں اشتہارات مشتہر کرائے گئے تھے۔ اس لئے اس کی شہرت سن کر دور دراز دیار و اقطاب سے خلقت جمع ہوگئی اور ہر ایک ملت مذہب کا متنفس اس جلسہ میں موجود تھا۔ علمائے اسلام کی طرف سے مولانا محمد قاسم صاحب، مولوی ابو المنصور امام مناظرہ و مرزا چاند عری الملا دہلوی، مولوی نعمان صاحب وکیل سرکار مولوی زنگمن صاحب بریلوی وغیرہ اور ہندوؤں میں کبیر پنتھی، پیارے لال اور برہمو سماج وغیرہ کے بہت سے لوگ موجود تھے۔ اژدہام خلقت کا قریب چار ہزار ہوگا۔ اور انتظام میلہ کا جناب مولوی موتی میاں صاحب رئیس اعظم شاہجہانپور کے متعلق تھا۔ مولوی صاحب موصوف کا حسن انتظام قابل تحسین تھا کہ کسی متنفس کو کسی امر کی تکلیف نہ ہونے پائی۔ ہر شخص کو آب و نان سے سیر کیا۔ ایک طرف اہل اسلام کا خیمہ استادہ تھا اور اہل اسلام بلند آواز سے اذان نماز کی دیکر اپنے مذہب کی رسومات ادا کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے اور ایک طرف پادری نولس عیسائیوں کے ساتھ خیمہ زن تھے اور گرجا کرتے تھے۔ دوسری جانب کبیر پنتھیوں کا غول اترا ہوا تھا، وہ لوگ بھجن گاتے مرلی اور بین بجاتے علی ہذا اپنے اپنے مذاہب کی رسومات بے روک ٹوک ہر شخص ادا کر رہا تھا۔ ایک بڑا عالیشان خیمہ پہلے ہی سے لگا ہوا تھا جس کے اندر ہزار دو کرسیاں دو رویہ تھیں۔ اہل اسلام کے مقابلہ میں عیسائی لوگ تھے۔ پادری نولس صاحب نے استادہ ہو کر لوگوں کو اپنے مذہب کے فضائل سنائے اور بطور خلاصہ کے جناب مولوی موتی میاں نے قلمبند کئے۔ پندرہ منٹ اور دس منٹ گفتگو کرنے کی اجازت ہر ایک شخص کو دی گئی۔ پادری صاحب کے درس کا خلاصہ یہ تھا

کہ خدا ایک ہے اور خدا کی قدرت سے انجیل تمام دنیا میں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر پھیل گئی اور برخلاف دینِ محمدی کے اس مذہب کی کتاب اتنی نہیں پھیلی۔ مرزا جالندھری نے کہا کہ میں پنجاب کا باشندہ ہوں۔ میلہ کا نام سن کر آیا ہوں سو آج نہایت مبارک دن ہے کہ ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر مذہب کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اور پادری صاحب نے جو دعویٰ کیا کہ انجیل تمام دنیا میں جمع کر ہو پھیل گئی ہے۔ پس پھیلنا ہر ایک شے کا دو طور سے ہوتا ہے۔ روحانی اور ظاہری۔ سو پادری صاحب فرمادیں کہ انجیل کس طور سے پھیلی۔ پادری صاحب نے کہا کہ روحانی طور پر۔ مرزا موصوف نے فرمایا کہ ہم کیونکر سمجھیں کہ وہ روحانی طور پر پھیل گئی۔ کیونکہ اس میں کوئی روحانی بات نہیں پائی جاتی۔ اس کے علاوہ جناب پولس اپنے مریدوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ تم ابھی سے دوسری خوشخبری یعنی انجیل کی طرف مائل ہو گئے ہو اور حواریوں کے عین حمایت میں کوئی کہتا تھا کہ میں پولس کا ہوں اور کوئی کہتا کہ میں یوحنا کا ہوں۔ مسیح کا کوئی نہیں کہتا تھا۔ زمانہ تنزل میں بہت خونریزیاں ہوئیں۔ لوتھر مصلح مذہب عیسائی کے خلاف پوپ روم کا وعظ کہتا تھا۔ قریب تین کروڑ کے عیسائی قتل ہو کر نیا فرقہ پروٹسٹنٹ کا ایجاد ہوا۔ اب جو عیسائیوں کے ہاتھ بہت سے زرخیز ملک آ گئے۔ خصوصاً ہندوستان وغیرہ تو کیسے انجیل نہ پھیلے۔ سوائے ظاہر طور کے اور کوئی اور برکت روحانی طور پر ہم کو دکھلائی نہیں دیتی۔ پھر ایک وکیل صاحب نے جن کا نام مبارک ہم بھول گئے تائید اسلام میں نہایت عمدہ گفتگو کی۔ ہندوؤں کی طرف سے پنڈت اجودھیا پرشاد صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ازحد شستہ تقریر کی جس کا جواب عیسائیوں سے اس وقت نہ بن پڑا۔ پیارے لال کبیر پنتھی نے ایک درس کیا اور کبیر کی پیدائش کنول کے پھول سے عجیب طور پر بیان کی اور اس کی تردید عیسائیوں نے خوب کی۔ ابو المنصور صاحب اور علماء کی تقریر جو باعث طوالت ہے ہم نہیں لکھ سکتے۔ ۸ رمئی سن حال کے جلسہ میں مولانا قاسم صاحب نے درس دیا اور فضائل اسلام بیان کئے۔ پادری صاحب نے تثلیث کا بیان عجیب طور سے ادا کیا اور کہا کہ ایک خط میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں۔ طول، عرض، عمیق، سو تثلیث ہر طرح سے ثابت ہے۔ مولوی موصوف (مولانا محمد قاسم صاحب) نے اس کو اسی وقت رد کر دیا۔ پھر مولوی صاحب اور پادری صاحب تقریر کے معاملہ میں بحث کرتے رہے۔ اس میں جلسہ برخاست ہو گیا۔ تمام قرب و جوار میں اور چاروں طرف شور و غل مچ گیا کہ مسلمان جیت گئے۔ جہاں ایک عالم اسلام کا کھڑا ہوتا تھا اس کے اردگرد ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے۔ اول روز کے جلسہ میں جو اعتراضات اہل اسلام کے تھے، ان کا جواب عیسائیوں نے کچھ نہ دیا۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کے جوابات حرف بحرف دیئے اور فتح یاب ہوئے۔ سچ ہے آفتاب کے مقابلہ میں چراغ کو کہاں فروغ ہوتا ہے۔ رؤسائے شہر شاہجہانپور نے نہایت حسن انتظام کیا۔ اس اژدحام میں کسی اہل مذہب کا کسی نوع کا کچھ صدمہ نہ ہوا۔

حضرت قاسم العلوم مناظر بھی تھے اور مبلغ بھی چنانچہ انہوں نے اس موقع پر آئے ہوئے ہزارہا اشخاص کے مجمع کو جن میں پادری بھی شامل تھے۔ اسلام لانے کی تبلیغ کی اور بعدہٗ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے واعظین سے فرمایا کہ میلے میں متفرق ہو کر وعظ بیان کرنا چاہیئے۔ چنانچہ واعظین نے بجز مولوی منصور علی صاحب کے علی الاعلان منادی کا اسلام رد عیسائیت کا شروع کیا اور قبل مغرب تک (۸ رمئی کی روداد میلہ خداشناسی کے مطابق) تمام میلے میں عجیب کیفیت رہی اور عنایت ایزدی سے کوئی پادری مقابل نہ ہوا۔ خدا معلوم کہاں جان چرائے پڑے ہیں۔" دوسرے دن یعنی ۸ رمئی کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روز بھی مجلس مناظرہ سے قبل مولانا محمد قاسم صاحب اور رفقائے مجلس مناظرہ نے باقاعدہ جلسہ کی کارروائی سے پہلے موقع پاکر حسب تجویز مولانا محمد قاسم صاحب سب متفرق ہو کر لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور منادی کی۔"

تیسرا معرکہ

حق و باطل کا وہ تیسرا معرکہ جس میں حضرت قاسم العلوم کو عیسائی اور ہندو مبلغوں کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی۔

کا: دوسرا میلہ خداشناسی تھا جو ۱۹ اور ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو منعقد ہوا۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۱۱۵ میں ارقام فرمایا ہے کہ "ہر سال کی طرح منشی پیارے لال نے پھر مسلمانوں، عیسائیوں،

اور ہندوؤں کے علماء پادریوں اور پنڈتوں کو دعوت اور اشتہار بھجوائے۔ اس سال کے مباحثے کی رپورٹ مولانا فخر الحسن گنگوہی تلمیذ قاسم العلوم نے مباحثہ شاہجہاں پور کے نام سے چھپوائی۔ وہ خود بھی اس میں شامل ہوئے تھے۔ اور چار سال بعد بھی گئے تھے۔" بقول حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی، حضرت قاسم العلوم، مولوی ابوالمنصور دہلوی اور دس بارہ اور بھی ان کے ساتھ کچھ شوقین کچھ مناظرین دلی سے شاہجہاں پور کو روانہ ہوتے اور ۱۷ مارچ ۱۸۷۷ء کو شاہجہاں پور پہنچے۔ اس کے بعد مولانا فخر الحسن بتاتے ہیں کہ سب لوگ مولانا عبدالغفور سلمہ اللہ تعالیٰ کے مکان پر گئے اور ۱۸ مارچ کو آرام کیا۔ ۱۹ مارچ کو مناظرین اہل اسلام آخر رات سے اٹھ کر میدان مباحثہ کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت فخر العلماء فرماتے ہیں کہ " اور سب صاحب سوار مولوی محمد قاسم صاحب با پیادہ (موضع سرلی تک پور متصل موضع چاندا پور ضلع شاہجہانپور) طلوع آفتاب سے کچھ بعد پہنچے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے سے فراغت حاصل کر کے وضو کیا اور نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگی کیونکہ مولوی صاحب دلی سے برابر یہی ہر شخص سے فرماتے آئے تھے کہ اس بے نیاز سے دعا کرو کہ کلمۂ حق غالب آئے۔ آپ نے بعد عصر ۱۹ مارچ کو میلاد منظر فرمایا۔ اس کے بعد پادری محی الدین ستیا پوری کے جواب میں ایک اور تقریر فرمائی یہ تقریر مجمع کی وجہ سے شامیانے سے باہر میدان میں فرش پر ہوئی۔ حضرت فخر العلماء نے انتصار اسلام میں تحریر فرمایا ہے کہ " عصر کے بعد نماز پڑھ کر آپ نے ایک گھنٹے تک ایسا زور وشور کا وعظ کیا کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا اور ہر شخص پر ایک سکتہ کا عالم تھا (کیوں نہیں ہوتا جب آپ اور آپ کے رفقاء دہلی سے برابر کلمۂ حق کے غالب ہونے کی دعا مانگتے آئے تھے) وہاں سے واپس آنے کے بعد آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت پر تقریر فرمائی۔ دوسرے روز دو جلسے ہوئے۔ پہلا جلسہ ½۷ بجے سے ۱۱ بجے تک۔ دوسرا اجلاس ایک بجے سے چار بجے تک اس روز بھی آپ نے تین تقریریں کیں۔ یہاں تک کہ میلہ کے خاتمہ کے بعد آپ نے ساتویں بار تقریر فرمائی اور سوامی دیانند اور پادری صاحبان میدان سے فرار ہونے پر مجبور ہوئے۔ جناب مولانا محمد یعقوب نے سوانح عمری حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی میں لکھا ہے کہ " حتیٰ کہ پادری لوگ عین جلسہ میں سے ایسے بے سروپا بھاگے کہ ٹھکانہ نہ معلوم ہوا اور اپنی بعض کتابیں بھی بھول گئے۔ اس جلسے سے جناب مولانا محمد قاسم صاحب کامیاب واپس آئے اور نصرت دین اسلام کی ہمیشہ کے لئے ثابت ہو گئی۔ اور فتح دین۔ ان کی ذات سے پوری ظاہر ہوئی۔"

چوتھا معرکہ

حضرت قاسم العلوم کا چوتھا معرکہ رڑکی جس میں انہوں نے پنڈت دیانند کو دوسری بار راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ رڑکی میں ہوا جس میں حضرت قاسم العلوم کے تینوں معرکوں کی طرح حضرت فخر العلماء اول سے آخر تک شریک تھے اور انہوں نے اس کی روداد انتصار اسلام کے نام کے ساتھ شائع فرمائی۔ یہ معرکہ ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں حضرت قاسم العلوم کی وفات سے تقریباً دو سال قبل ہوا تھا۔ اور اس میں آپ علالت و نقاہت کے باوجود شریک ہوئے تھے۔ ابتداء میں حضرت قاسم العلوم کی رائے تھی کہ سوامی دیانند کے مقابلہ میں ان کے شاگرد جائیں مگر وہ اس پر تیار نہیں ہوا۔ اور کہا کہ میں صرف مولوی قاسم صاحب سے مقابلہ کروں گا۔ اس پر دریافت احوال کے لئے حضرت قاسم العلوم نے حضرت فخر العلماء، حضرت شیخ الہند اور مولوی حافظ عبدالعدل کو حکم دیا کہ وہ رڑکی جا کر حالات کا جائزہ لیں۔ یہ تینوں شاگرد مولوی منظور علی جوالاپوری کے ہمراہ رڑکی گئے۔ اور سوامی دیانند سے ملے۔ حضرت فخر العلماء نے فرمایا کہ " جمعہ کی نماز کے بعد ہم چاروں مع چند اشخاص اہل رڑکی پنڈت جی کی کوٹھی پر جو سر مدچھاؤنی میں تھی گئے۔ ہمارے ہمراہیوں میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ پنڈت جی اپنے اعتراضوں کا جواب ان لوگوں سے سن لو، یہ لوگ اسی لئے آئے ہوئے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں نہیں سنتا نہ مجھے فرصت ہے۔ نہ میں گفتگو کا آرزومند ہوں اور نہ میں نے اشتہار میں مباحثہ کی

خواستگاری کی۔ کسا نے میری اطلاع کے بغیر اگر اشتہار چسپاں کر دیا ہو تو مجھے خبر نہیں۔ ہر چند ہم لوگوں نے اصرار کیا مگر پنڈت جی نے ہنس ہنسی کے سوا کچھ نہیں کہا۔ اس رد و بدل میں پنڈت جی کئی بار ایسے لئے گئے کہ دم بخود ہونا پڑا۔ پھر ہم نے پنڈت جی سے یہ دریافت کیا کہ آپ جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب کے ساتھ مباحثہ کرنے پر تو راضی نہیں یا ان سے بھی راضی نہیں۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں خواہ مخواہ متقاضی اس امر کا نہیں ہوں۔ لیکن اگر جناب مولانا ممدوح تشریف لے آئیں تو مباحثہ کے لئے آمادہ ہوں اور کسی سے تو مباحثہ نہیں کروں گا۔ وجہ اس تخصیص کی پوچھی تو کہا کہ میں تمام پورب میں پھرا ہوں۔ اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں۔ ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی ہے۔ ہر کوئی مولانا کو یکتائے روزگار کہتا ہے اور میں نے بھی مولانا کو شاہجہانپور کے جلسہ میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر دل آویز سنی ہے۔ اگر آدمی مباحثہ کرے تو کامل یکتائے روزگار سے کرے جس سے کچھ فائدہ ہو کچھ نتیجہ نکلے۔ حضرت فخر العلماء اس ملاقات کے بعد دیوبند گئے۔ اور حضرت قاسم العلوم رڑکی آئے۔ حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کے حکم پر منگلور بھی گئے اور مولانا منصور علی کو بلا کر لائے مگر سوامی دیانند نے مناظرہ کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ رڑکی ہی سے فرار ہو گئے۔ مجبوراً حضرت قاسم العلوم کو ان کے بغیر اہل رڑکی کے سامنے تین تقریریں کرنا پڑیں جن میں سوامی دیانند کے اعتراضات کا جواب اور اسلام کی حقانیت پر دلائل تھے۔ حضرت قاسم العلوم نے رڑکی میں خود تقریریں ہی نہیں کیں بلکہ اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ بھی رڑکی میں جا بجا تقریریں کریں اور پنڈت جی کے اعتراضات کا جواب دیں۔ حضرت فخر العلماء نے انتصار الاسلام میں لکھا ہے کہ ادھر تو پنڈت دیانند حضرت قاسم العلوم سے مناظرہ کرنے میں پہلو تہی کر رہے تھے۔ ادھر مولانا کا ہم لوگوں کو شہر میں وعظ کہنے کا حکم ہوا۔ حضرت فخر العلماء فرماتے ہیں کہ "ادھر تو یہ قصہ ہوا اور ادھر جناب مولانا نے ہم لوگوں کو حکم دیا کہ بازار میں کھڑے ہو کر پکارنے لگو اور کہہ دو کہ دیکھو پکار پکار کر کہہ دو کہ پنڈت جی پہلے تو بہت زبان درازیاں کرتے تھے، اب زبان درازیاں کہاں گئیں، ذرا مردوں کے سامنے آئیں کوٹھی سے باہر نکلیں اور یہ فرمایا کہ پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب علی الاعلان بیان کردو۔ چونکہ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہ تھا کہ جناب مولوی محمود حسن صاحب اور مولوی حافظ عبد العدل صاحب کو تکلیف کرنی پڑتی۔ اس لئے بندہ نے اس کی تعمیل کر دی۔ یعنی پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب علی الاعلان کئی روز تک بیان کئے اور پنڈت جی کے مذہب جدید پر بہت سے اعتراضات کئے اور بہت سی عزت دلائی۔ اگرچہ مجمع عام میں پنڈت جی کے متعدد شاگرد بھی ہوتے تھے لیکن کسی کو اتنی جرات نہیں ہوتی کہ لب کشا ہو نہ اتنی غیرت آئی کہ پنڈت جی کو کشاں کشاں میدان میں لاتے اور اس مضمون کے اشتہار بازاروں میں چسپاں کر دیتے۔"

حضرت قاسم العلوم کا پانچواں اور آخری معرکہ

سوامی دیانند رڑکی سے فرار ہو کر میرٹھ پہنچے اور حضرت قاسم العلوم میرٹھ والوں کے بلانے پر میرٹھ تشریف لے گئے مگر یہاں بھی انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے مقابلہ میں آنے سے گریز کیا۔ جناب مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے لکھا ہے کہ "پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے وہی دعوے تھے۔ واقعی جسے شرم نہ ہو جو چاہے سو کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحب بھی ان دنوں میرٹھ کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہاں سے بعض صاحبوں نے بلانے کی تحریک کی۔ غرض مولانا میں ہر چند مرض کے غلبہ کے اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی مگر ہمت کر کے پہنچے تو وہ بہانہ اور حیلہ کر کے وہاں سے کافور ہو گیا۔ وہاں بھی اس کا جواب مولانا نے ایسے ہی کچھ بیان کیا۔" حضرت قاسم العلوم کے ان معرکوں میں حضرت فخر العلماء کا چار میں شرکت فرمانا اور ان میں سے تین مباحثوں کی روداد اور دو تحریری تقریروں کی اشاعت ثابت ہے پھر یہ کہ ان تمام معرکوں میں حضرت قاسم العلوم کے وہی تن تنہا شاگرد نظر آتے ہیں جنہوں نے تحریر کے ساتھ تقریر کے جوہر بھی دکھائے اور اپنے استاد کے حکم پر کئی روز تک نہ صرف رڑکی کے بازاروں میں تقریریں

کیں، بلکہ سوامی دیانند کے مذہب جدید پر اعتراضات کرنے اور ان اعتراضات کو بطور مضمون اشتہارات میں چھاپ کر بازاروں میں چسپاں کر کے اہم ملی اور دینی فرض کو پورا کیا اور اپنے آپ کو حضرت قاسم العلوم کے علوم و معارف مجاہدات و نظریات کا شتہر اور مبلغ ثابت کیا۔ حضرت مولانا عبد الحئی نے نزہت الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۳۵۴ میں ارقام فرمایا ہے کہ "علمائے ہند میں شیخ وقت علامہ فخر الحسن ابن عبد الرحمٰن حنفی گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے میں صرف کرتے اور مناظرانہ انداز گفتگو ہی پسند فرماتے۔ آپ شیخ الرجل مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر تلانذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے رفقائے کار اور قریبی حلقہ کے افراد میں تھے۔"

امت اسلامیہ کو فرنگی اثرات سے بچانے کی جدوجہد

حضرت قاسم العلوم کے مشن کی تیسری اہم شق ان مسلمانوں کی اصلاح تھی جو لارڈ میکالے کی پالیسی کے تحت مغربی طرز زندگی کے پیرو اور مغربی افکار و خیالات کے اس حد تک دلدادہ ہو گئے تھے کہ انہیں اپنا مذہب اور اپنے مذہب کی تعلیمات فرسودہ اور مہمل معلوم ہوتی تھیں اور جنہیں مغربی علوم و فنون کو اپنانے اور آزمانے میں مسلمانوں کی نجات نظر آتی تھی۔ یہ بھی بڑا مشکل مسئلہ تھا اور ایسے غرب زدہ لوگوں کو دوبارہ اپنے قدیم طرز حیات اور مشرقی انداز فکر کی طرف واپس لانا بظاہر امر محال معلوم ہوتا تھا۔ مگر حضرت قاسم العلوم اللہ کا نام لے کر اس میدان کو سر کرنے کیلئے کمربستہ ہو گئے اور جس طرح انہوں نے بے سروسامانی، پست ہمتی، احساس کمتری اور شکستگی کے ماحول میں حکمرانوں کی مخالفت کے باوجود عیسائی مبلغوں کی کوششوں پر پانی پھیر دیا حالانکہ وقت، سرمایہ، دولت اور ابھرتی ہوئی نخوت و تکبر سب ہی عیسائی مبلغوں کے ساتھ تھے۔ ملازمت کی لالچ اور مستقبل کی تابناکی ان کے تتبع میں نظر آتی تھی مگر اللہ نے دین مبین کو فتح و نصرت سے ہمکنار کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو تو ہر حال میں پورا ہونا تھا۔ اسی طرح اس میدان میں بھی کامیابی اہل حق کا مقدر بن چکی تھی۔ اس مغرب زدہ گروہ کے سرخیل سر سید احمد خان تھے۔ بظاہر دونوں مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی قسمت کے بنانے والے تھے لیکن حضرت قاسم العلوم علوم قدیمہ اور علوم مذہبی کے دلدادہ تھے اور ان کی فکر و فہم کے مطابق جب تک ان علوم کے ذریعہ مسلمان نوجوانوں کی مذہبی اور علمی استعداد کو ترقی نہیں دی جاتی اس وقت تک علوم جدیدہ کی جانب توجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ ان کے یہاں اول علوم قدیمہ اور علوم مذہبی آتے تھے۔ اور اس کے بعد علوم جدیدہ۔ سر سید دونوں علوم کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ پھر یہ کہ مغربی علوم و فنون کی بظاہر چونکا دینے والی روشنی نے انہیں اسلامی نظریات اور افکار کے بارے میں بھی نئے انداز فکر کا حامل بنا دیا تھا۔ حضرت قاسم العلوم کھل کر نہ تو مغربی علوم و فنون کی مخالفت کرنا چاہتے تھے اور نہ انگریزی زبان کے مخالف تھے مگر وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ علوم قدیم اور جدید کا ایک ساتھ تعلیم دینا طلبہ کی استعداد پر برا اثر ڈالے گا۔ یہ اختلافات اپنی جگہ اصولی ضرور تھے مگر سنگین نہیں تھے لیکن اوہام اور ابہام کا ماحول اور مغربی افکار و خیالات کے تحت اسلام کے بنیادی اصولوں کے بارے میں گلکاریاں ان کو پسند نہیں تھیں۔ اور وہ اسے دین کی بقا کے لئے مضرت رساں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سر سید کو فہمائش اور اصلاحی خطوط لکھے جو ان کی تصنیف تصفیۃ العقائد میں موجود ہیں۔ جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے انوار قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ "حضرت قاسم العلوم جھگڑوں سے خواہ وہ دین کے لئے ہوں اور خواہ دنیا کے بیزار نظر آتے ہیں۔ لیکن اصلاح امت کا کام چونکہ اصولی ہے اس لئے اس سے غافل نہ ہو کر سید صاحب کو جو اصلاحی خط لکھ چکے ہیں وہ لکھنا ضروری تھا۔"

یہ دور سنہ ۱۲۸۶ھ سنہ ۱۸۶۶ء کا ہے۔ مگر ان کا یہ اصلاحی کام اس کے بعد بھی جاری رہا۔ حضرت فخر العلماء نے جو علوم قاسمی کے صحیح نقیب اور ترجمان ہیں انتصار الاسلام میں جو مباحثہ اڑکی کی روداد ہے اور جس کی ترتیب سنہ ۱۲۹۵ھ مطابق سنہ ۱۸۷۸ء سے اپنی ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے

سرسید کے خیالات کی اصلاح کے لئے انجام دی تھیں اور ان سے مقصود جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے سرسید کے دینی عقائد کی اصلاح نہیں تھی بلکہ اس گروہ مسلمین کی اصلاح تھی جو مغرب زدہ اور مغربی افکار اور مغربی طرز حیات و معاشرت کے چکر میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اور ان مقاصد سے ہم آہنگ تھا جو لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کا اہم حصہ تھے۔ حضرت فخر العلماء نے اسی رسالہ انتصار اسلام میں جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ تحریر فرمایا ہے، کہ اس رسالہ میں سر سید احمد خان صاحب بہادر کے اوہام کا بھی جواب ہے۔ کیونکہ حضرت چند امور میں پنڈت جی، (سوامی دیانند) کے ہم صفیر ہیں۔ شیطان اور جن اور فرشتوں کے وجود خارجی کے دونوں منکر ہیں۔ اور جنت و دوزخ کے وجود حقیقی کا دونوں کو انکار ہے۔ اگر سید صاحب اور ان کے ہم مذہب بہ نظر انصاف ان تقریروں کو ملاحظہ کریں گے تو امید خدا سے یوں ہے کہ ان کے جی سے سارے وسوسے دور ہو جائیں گے۔ اور شیطان کے وجود خارجی کا اقرار کریں گے۔ جنوں اور فرشتوں کے جسمانی ہونے میں کچھ وہم بھی نہ کریں گے اور جنت و دوزخ کے وجود حقیقی کا یقین کریں گے۔ جنت میں داخل ہونے کی تیاری کریں گے۔ دوزخ سے بچنے کی فکر فرمائیں گے۔ اتنا لکھنے کے بعد

حضرت فخر العلماء اپنی کوششوں کا ذکر مزید فرماتے ہیں جو انہوں نے سرسید کے اصلاح خیالات کے لئے کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "جناب خان صاحب بہادر نے جو سورۂ بقر کی تفسیر لکھی ہے۔ اس میں شیطان اور تمام جن اور فرشتوں اور دوزخ و جنت کے وجود حقیقی خارجی کا انکار کیا ہے۔ اور معجزات انبیاء کی تاویلیں کی ہیں۔ اس کا جواب بندہ نے لکھا ہے جو قریب الاختتام ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا اور اس کی طبع کا سامان میسر ہوا تو وہ بھی عنقریب طبع ہو کر ناظرین کے ملاحظہ میں گزرے گا۔" چونکہ یہ دیباچہ اس وقت لکھا گیا تھا جب حضرت قاسم العلوم کا وصال ہو چکا تھا اس لئے کہ اسی دیباچہ میں ان کی رحلت کا تذکرہ اور سوانح قاسمی کی ترتیب کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کے وصال کے بعد بھی حضرت فخر العلماء معارف قاسمی کے نگہبان اور مبلغ و ناشر کی حیثیت سے اپنے فرائض کی تکمیل میں اپنے دوسرے ہم سبقوں سے بہت زیادہ بلکہ تن تنہا مستعد اور چاق و چوبند نظر آتے ہیں اور یہ ان کے جانشین قاسم العلوم ہونے کا نہایت واضح ثبوت ہے۔

۴۔ اصلاح الرسوم

حضرت قاسم العلوم کے مقدس مشن کی چوتھی اور اہم شق اصلاح الرسوم ہے۔ ہر دور میں جب دین میں انحطاط ہوتا ہے تو قوم غلط قسم کی رسموں اور اوہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی حال جنگ آزادی سے قبل اور اس کے فوراً بعد امت مسلمہ کا تھا۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی عقد بیوگان کے سلسلہ میں اور شادی بیاہ کی تقاریب میں ہندو مذہب کی پیروی کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ مسلمانوں میں بیواؤں کا عقد نہایت معیوب سمجھا جانے لگا تھا اور شادی بیاہ کے موقع پر فضول رسوم اور بے جا اسراف کے نمونے بہ کثرت دیکھنے کو ملتے تھے۔ حضرت قاسم العلوم نے سب سے پہلے بیوہ خواتین کی شادی کے مسئلہ کو اٹھایا اور اپنی تقریروں سے ثابت کیا کہ "بیواؤں کی شادی عین اسلام ہے۔ سوانح مخطوطہ میں ذکر ہے کہ "نکاح ثانی بیوگان کو (مسلمان) ایسا برا اور سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا تو مرنے مارنے کو مستعد ہو جاتے تھے۔ اول اول لوگوں کے کانوں میں جو یہ بات پڑی تو چونکے (حالانکہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک میں عقد بیوگان بھی ایک اہم موضوع تھا) اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ اور بعض بعض نے (مولانا محمد قاسم صاحب کے) خلاف بھی منصوبے بنائے۔ مگر الحمد اللہ حکمت قاسمی رنگ لائے بغیر نہ رہی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے اور بیواؤں کے کانوں تک مضامین نکاح پہنچنے لگے۔ کوئی بیوہ اور وارث بیوہ ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں۔" حضرت قاسم العلوم نے صرف تقریروں ہی سے اس مسئلہ کے حل کی سعی نہیں کی بلکہ خود اپنی بیوہ بہن کی شادی کر کے عملی طور پر عقد بیوگان کی مہم کا آغاز فرمایا اور اس طرح اپنے پدر روحانی کی دعائیں حاصل کیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ نے ایک خط میں حضرت قاسم العلوم کے اس مبارک اور نیک اقدام کو سراہا۔ یہ خط درج ذیل ہے۔ "ہماری جان سے عزیز مولوی محمد قاسم صاحب کی خدمت میں مکرر لکھتا ہوں۔ (اس سے پہلے بھی حاجی صاحب اپنی خوشنودی کا اظہار ایک خط کے ذریعہ فرما چکے تھے) کہ اپنی ہمشیرہ اور برخوردار ضیاء احمد کو سلام و دعا کے بعد کہیں کہ اس احقر کو تمہارے اس (نکاح ثانی) نیک کام سے بہت خوشی ہوئی خدائے تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور دینی اور دنیاوی نعمتوں سے مالا مال فرمائے۔"

"حضرت فخر العلماء جو اپنے استاد محترم کے سچے اور حقیقی پیرو تھے کس طرح قاسم العلوم کے افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت کے معاملہ میں پیچھے رہتے اور کیوں انکا تتبع نہ فرماتے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی بیوہ بہن اولیاء بیگم کی جن کی پہلی شادی انبہٹہ میں شاہ محمد صادق سجادہ نشین انبہٹہ سے ہوئی تھی کے وصال کے بعد ان کی دوسری شادی جناب عزیز علی کے ساتھ کی جس سے دو اولادیں محمد قاسم اور صدیقہ خاتون کی ولادت ہوئی۔ جناب محبوب انصاری نے اپنے خط مورخہ ۲۰ر مارچ ۱۹۶۴ء میں اس کی تصدیق کی ہے کہ بہن صدیقہ صاحبہ جو اولیاء بیگم کے دوسرے خاوند سے بڑی بیٹی ہیں۔ حضرت فخر العلماء عقد بیوگان کے سلسلے میں اپنے استاد مکرم کے ہر طرح شریک کار تھے اس کا اندازہ فیوض قاسمی کے ایک خط سے ہوتا ہے۔ جو حضرت قاسم العلوم نے مرزا عبد القادر بیگ صاحب مراد آبادی کو تحریر کیا تھا۔ اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب نے حضرت فخر العلماء کے ذریعہ حضرت قاسم العلوم کو اپنے نکاح ثانی کے بارے میں مطلع کیا تھا اور جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے یہ عقد ثانی حضرت قاسم العلوم کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی بیوہ چچی کے ساتھ کیا تھا حضرت قاسم العلوم کا خط یہ ہے "جناب مرزا صاحب اسلام وعلیکم کل چوتھی رمضان شریف کو مولوی فخر الحسن صاحب نے آپ کا عنایت نامہ عنایت کیا اور آپ کے نکاح ثانی کا قصہ زبانی بھی بیان فرمایا ملاحظہ فرمایئے، اپنے شاگرد کا کس احترام کے ساتھ تذکرہ فرما رہے ہیں) جزاک اللہ آپ کا نکاح جو بیوہ چچی قرابتی دینی کے بنظر احیائے سنت واقع ہوا۔" یہ خط فیوض قاسمی میں چھٹے نمبر پر ہے۔

جہاں تک شادی بیاہ کے موقع پر بے جا اسراف اور فضول رسموں کا تعلق ہے حضرت فخر العلماء نے اپنے استاد گرامی کی پیروی میں سب سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اگر آپ کے استاد نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر انتہائی سادگی سے کام لیا تو اور شادیوں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ جب آپ کی بہن انبیا بیگم کا حضرت مولانا خلیل احمد کے ساتھ عقد ہوا تو تذکرۃ الخلیل کے مطابق انتہائی سادگی کے ساتھ شادی ہوئی۔ دس بارہ براتی انبیہٹہ سے آئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے انتہائی سادگی اور خاموشی کے ساتھ اپنے فرزند روحانی کا حضرت فخر العلماء کی بہن کے ساتھ نکاح فرما دیا۔ اس نکاح کی تفصیل پہلے ہی اپنے مقام پر بیان کی جا چکی ہے ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت فخر العلماء دامے، درمے، قدمے، سخنے، حضرت قاسم العلوم کے اصلاحی، انقلابی، تدریسی اور تبلیغی مشن کے اہم ترین ستون تھے۔ اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نے آپ کے بارے میں یہ بات بلا وجہ نہیں لکھی تھی، کہ آپ (فخر العلماء) وارستگی مزاج میں مولانا کے (حضرت قاسم العلوم) قدم بہ قدم ہی نہیں بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں۔

حضرت فخر العلماء کی زندگی کا نیا رخ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت قاسم العلوم کی رحلت کا حضرت فخر العلماء کو بے حد غم ہوا اور وہ حضرت کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہونے کے بعد گنگوہ واپس آ گئے۔ استاد کی موت نے ان کی زندگی میں ایک عظیم خلا پیدا کر دیا تھا۔ اب تک یعنی محرم الحرام ۱۲۸۳ھ سے لیکر ۱۲۹۷ھ تک کا دور جو عیسوی حساب سے مئی ۱۸۶۶ء سے شروع ہو کر ۱۸۸۰ء تک جاری رہا۔ اس میں زندگی کے ہر موڑ پر انہیں اپنے استاد کی شفقت اور رہنمائی حاصل تھی۔ تعلیم و تعلم ہو، درس و تدریس ہو، رد نصاریٰ کی مہم ہو، اور اصلاح الرسوم اور اصلاح احوال المسلمین ہو حضرت فخر العلماء ہر جگہ حضرت قاسم العلوم کے

قدم بہ قدم نظر آتے ہیں۔ لیکن اب زندگی میں کوئی بنیادی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ بس ایک تو یہ کام تھا کہ حضرت قاسم العلوم کے معارف اور ان کی زندگی کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے۔ لہٰذا چند ماہ گنگوہ میں قیام کے بعد حضرت فخر العلماء دہلی تشریف لے گئے اور مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی کے تعاون سے حضرت قاسم العلوم کے افکار و اقوال کی نشر و اشاعت کے کام میں منہمک ہو گئے۔ مطبع مجتبائی نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت قاسم العلوم کی تقریباً ۲۳ تصانیف کو ایک بار نہیں بلکہ کئی بار شائع کیا اور حضرت فخر العلماء اس میں مولوی عبد الاحد کے مددگار اور معاون رہے اس کے علاوہ آپ نے دہلی کے قیام کے دوران ابن ماجہ اور ابو داؤد پر حاشیے لکھے۔ اور ابن ماجہ کا حاشیہ بڑے اہتمام سے وہیں شائع ہوا۔ آپ ١٢٩٧ھ کے آخر یا ١٢٩٨ھ کے اوائل میں دہلی آئے اور ١٣٠٣ھ تک یعنی ١٨٨٦ء تک آپ نے وہیں قیام کیا۔ آپ کا یہ تمام تر زمانہ معارف قاسمی کی ترتیب اور سوانح قاسمی کی تحریر میں گزرا لیکن اس کے علاوہ آپ نے اس زمانہ میں طب کی تعلیم کے حصول پر بھی توجہ کی۔

حکیم محمود خاں کی شاگردی

اپنے دور کے سب سے بڑے طبیب اور خاندان شریفی کی مایہ ناز شخصیت جس سے آپ کے قدیمی خاندانی روابط تھے وہ حکیم محمود خان اعظم تھے جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہ کیا، حکیم محمود خان، ان کے والد حکیم صادق خان اور خاندان شریفی کے مؤسس حکیم شریف خان کے حضرت شاہ حسن عسکری، ان کے والد شاہ حسین بخش اور ان کے والد شاہ غلام سادات اور ان کے بزرگ شاہ محمد چشتی قدس سرہ سے نیازمندی کے روابط تھے۔ لہٰذا جب آپ حکیم محمود خان کے یہاں حصول طب کیلئے حاضر ہوئے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اس وقت تک فخر العلماء اپنے استاد مکرم حضرت قاسم العلوم کے علوم کے ناشر، اور ان کے جانشین کی حیثیت سے پہلے ہی علمائے وقت کے حلقہ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا قابل استاد نے اپنے ذہین شاگرد کی دل کھول کر پذیرائی کی اور اپنے فرزندوں عبد المجید خان اور واصل خان کے ساتھ بیٹھ کر پڑھایا ایک تو شاگرد ذہین دوسرے استاد قابل، تیسرے لائق و فائق ہم سبق۔ حضرت فخر العلماء نے اس طرح تکمیل طب کی کہ جب فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو بقول حکیم محمد یوسف گنگوہی برادر خورد حکیم محمد اسمٰعیل اجمیری، حکیم محمود خان نے فرمایا کہ جہاں تک علم طب کا تعلق ہے وہ تو مولوی فخر الحسن صاحب لے گئے۔ حکیم یوسف گنگوہی نے حکیم محمود خاں کے یہ الفاظ خود ان کے فرزند اکبر حکیم عبد المجید خاں سے سنے تھے۔ حیات اجمل کے مصنف قاضی عبد الغفار نے لکھا ہے کہ محمود خان نے خود ہی اپنے درس کو جس میں طلبہ کسب فن کیا کرتے تھے ایک مدرسہ طبیہ کی صورت میں منتقل کر دیا" یہی وہ درس تھا جس میں انہوں نے حضرت فخر العلماء کو فخر الحکماء بنا دیا۔ اور خاندان شریفی کے ارکان کو خاص کر حکیم عبد المجید خان کو ان کا بہت ہی دلدادہ بنا دیا۔ اس لئے "خاندان شریفی کا یہ مایہ ناز سپوت جس نے اپنے عظیم والد حکیم محمود خان کے انتقال کے بعد باپ کی مسند حکمت کو زینت دی یہ جانتا تھا کہ وہ اپنے باپ کے بقول علاج معالجہ میں ان کا صحیح جانشین ہے لیکن جہاں تک فن طب اور اس کی باریکیوں کا سوال ہے۔ یہ نعمت خاندان شریفی سے نکل کر حکیم فخر الحسن کے دماغ میں منتقل ہو چکی ہے۔" حکیم محمود خان جانتے تھے، کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس فن کا زوال بھی یقینی تھا۔ لیکن محمود خان نے بادشاہوں اور حاکموں کی سرپرستی کے بغیر ہی اپنے فن کو ترقی دینے کا ارادہ کیا۔ (انکی) اس تحریک کا سنگ بنیاد مدرسہ طبیہ تھا جو انہوں نے جاری کیا۔" (حیات اجمل صفحہ ۱۲) لیکن مدرسہ کے اجراء سے پہلے ہی انہوں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اپنے خداداد اور خاندانی علم کو مستحق اور ذہین طالب علموں تک ضرور پہنچائیں گے۔ اور ان کا یہ عزم حکیم فخر الحسن کی ذہانت، ذکاوت اور علم طب میں ان کی غیر معمولی استعداد اور قابلیت کے روپ میں نظر آتا ہے۔ مولانا عبد الحی نے اپنی مشہور تصنیف نزہۃ الخواطر جلد آٹھ کے صفحہ ۳۴۵ میں بھی اس بات کی تصدیق کی ہے، کہ

حضرت فخر العلماء نے طب افضل الاطباء شیخ محمود بن صادق شریفی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔ اور آخر عمر میں علاج معالجہ کا سلسلہ بھی کانپور میں اختیار فرمایا۔

حکیم محمود خان اعظم

حکیم محمود خان اکبر شاہ ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد حکیم صادق علی خان سے اکتساب علم کیا اور بہادر شاہ کی تاجداری کا پورا دور گزار کر ۱۸۸۲ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں انتقال فرمایا۔ قاضی عبدالغفار نے سچ کہا ہے کہ "ان کے علم و فضل کی داستان ایک علیحدہ تالیف چاہتی ہے۔ ہندوستان میں آج تک انکے علم و فضل اور کمال فن کے افسانے زبان زد ہیں۔ ان کی تشخیص اور معالجہ کے عجیب و غریب قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر قدرت نے انکو غیر معمولی شخصیت نہ عطا کی ہوتی تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس خاندان اور اس کے ساتھ طب یونانی کی بقا ناممکن تھی۔" محمود خاں اپنے خاندان میں ایک غیور مگر درد مند طبیعت لے کر آئے تھے۔ غریبوں کے حال پر خاص التفات فرماتے تھے۔ لیکن امیروں کے لئے بے حد تند خو تھے۔ مطب میں مجال نہیں تھی کہ کوئی امیر کسی غریب سے آگے بڑھ کر نبض دکھائے اہل دول سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے اور والیان ریاست اگر علاج کے لئے بلاتے تو ہزاروں خوشامدوں اور التجاؤں کے ساتھ جاتے تھے۔" قاضی عبدالغفار نے آگے چل کر جنگ آزادی کے دوران ان کی بے مثال خدمات، بے خوفی، غرباء کی امداد اور گرفتاری کے واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فخر الحکماء حضرت مولانا حکیم فخر الحسن کے استاد کس مرتبہ کے مالک تھے۔ قاضی عبدالغفار حیات اجمل میں جو ان کے چھوٹے صاحبزادے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی سوانح ہے تحریر فرمایا ہے کہ "۱۸۵۷ء کا زمانہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ خوش قسمتی سے خاندان شریفی ان تباہیوں کی زد میں نہیں آیا (حکیم صاحب کی گرفتاری کی بنا پر یہ بیان محل نظر ہے۔) اس کا ایک سبب خود حکیم محمود خان کا شخصی اعزاز تھا جس وقت برطانوی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو نابھا پٹیالہ اور جند کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں اور ان کے مہاراجگان نے برطانوی افسران سے کہدیا تھا کہ شریفی خاندان کی حفاظت کی جائے اس لئے کہ قلعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ انگریزی فوج نے دلی میں داخل ہوتے ہی اس گھر کی حفاظت کے لئے پہرہ بٹھا دیا۔ (بعض اطلاعات کے مطابق حفاظت کا کام مہاراجہ جند کے فوجی دستے نے انجام دیا۔) اور تمام خاندان اس دار و گیر سے بچا رہا۔ مرزا غالب نے بھی حالات غدر کے سلسلہ میں اس واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے۔

جب انگریزوں کو مجاہدین پر غلبہ حاصل ہوا تو دلی سے لوگ بھاگے۔ اس موقع پر حکیم محمود خان نے لاکھوں کروڑوں روپیہ کے اثاثے اپنے پاس بطور امانت رکھے۔" قاضی عبدالغفار "حیات اجمل" کے صفحہ ۱۵-۱۶ میں ارقام فرماتے ہیں کہ "جب دلی والے بھاگے تو ہزارہا اشخاص نے حکیم محمود خان کی حفاظت میں اپنا اثاثہ چھوڑ دیا۔ حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم صاحب کے پاس اپنا قیمتی سامان، زیور، جواہرات محفوظ کرنے کیلئے لاتے تھے اور حکیم صاحب ایک کوٹھری بتا دیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ۔ چنانچہ یہ کوٹھری چھت تک لوگوں کے پلندوں، گٹھڑیوں اور بکسوں سے بھر گئی۔ بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم اندازہ یہ تھا کہ اس وقت اس کوٹھری میں دو کروڑ روپیہ سے زیادہ کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مرتبہ دلی میں محمود خاں ہی کا تھا، کہ لوگ ان کی کوٹھریوں میں اس طرح اپنی دولت ڈال جاتے تھے۔ غدر کے بعد (یعنی جنگ آزادی کے خاتمہ کے بعد) جب لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم صاحب نے اس کوٹھری کا دروازہ کھلوا دیا اور فرمایا کہ جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کر لے جائے۔ قاضی عبدالغفار نے اس کے بعد حکیم محمود خاں کی ان سرگرمیوں پر روشنی ڈالی جو جنگ آزادی کے خاتمہ کے بعد انہوں نے انجام دی۔ قاضی صاحب حیات اجمل میں لکھتے ہیں کہ "اسی طرح دہلی میں اور خصوصاً بلی ماراں کے محلہ میں جو ہزارہا جائدادیں ضبط ہوئیں ان کے لئے حکیم محمود خاں حکام کے پاس جاتے تھے اور انہیں واگذاشت کرا لیتے تھے، جو لوگ گرفتار تھے انہیں رہا کرانے کیلئے کوتوال جایا کرتے تھے اور یہ کہہ کر کہ یہ میرے عزیز ہیں، انہیں رہا کرا لیتے تھے۔

حالانکہ عام طور پر کچہری اور عدالت میں جانے سے وہ سخت نفرت کرتے تھے۔ تاہم غدر کی مصیبت میں دن رات مخلوق کی جو خدمت انجام دی اس کے قصے عرصہ تک دہلی میں زبان زد خاص و عام رہے۔ ایک طرف مزاج کی وہ سختی اور تمکنت کہ اہل دول کی صورت دیکھ کر چیں بجبیں ہو جاتے تھے اور دوسری طرف طبیعت کی یہ نرمی اور گداز کہ غریبوں اور گرفتاران بلا کی خاطر کوتوالی کا چکر لگاتے تھے۔

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی نے دستور الاطباء کی جلد اول کے صفحہ ۱۱ میں حکیم محمود خان کے حالات درج کئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "حکیم صادق علی خان کے بعد ان کے نامور فرزند حکیم محمود خان جانشین ہوئے۔ حکیم محمود خان بے حد ذہین تھے۔ ان کی نباضی، تشخیص اور تجویز کے عجیب و غریب قصے اب تک زبان زد عام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں اس کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ان کو چوہتر سال (قاضی عبد الغفار کے مطابق بہتر سال) کی طویل عمر نصیب ہوئی جس کی وجہ سے ان کو غیر معمولی تجربہ حاصل ہو گیا۔ حکیم محمود خان کی شہرت نہ صرف اطراف ہند میں پھیلی بلکہ افغانستان، ترکستان، ایران، عراق اور عرب تک کے مریض ان کا شہرہ سن کر دہلی کا طواف کرنے لگ گئے۔"

حکیم محمود خان پرانے زمانہ کے ایک نہایت باوضع بزرگ تھے۔ غرباء پر نہایت مہربان تھے۔ ان کے مطب میں امیر غریب سب کو ایک جیسی جگہ ملتی۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی رئیس نے سبقت کر کے کسی غریب سے پہلے نبض دکھانی چاہی اور حکیم صاحب نے سخت غصہ کا اظہار فرمایا۔ جو امراء حکیم صاحب کی عادت سے واقف تھے وہ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ حکیم صاحب کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

تفسیر ابر کرم میں تحریر ہے کہ دار الخلافہ شاہجہان آباد بلکہ تمام ہندوستان میں بوعلی وقت یا بقراط کہا جاتا تھا وہ یہی حضرت حکیم محمود خاں صاحب اور ان کے فرزند، نور نظر، لخت جگر حضرت مولانا حکیم عبد المجید خاں ہیں۔ ثانی الذکر وہی بزرگ ہیں جن کے دل و دماغ نے مدرسہ طبیہ کی راہ نکالی اور جن کا وجود مسعود حکمت و طبابت کا مستند ماخذ ہے۔ دہلی میں آفتاب و ماہتاب فن حکمت کون ہیں۔ یہی دونوں حضرات ہیں۔ اس وقت حکمائے ہند کی ایک کرن ہیں۔ یہی دونوں عالی جناب ہیں۔ یونانی طب قریب المرگ ہو جانے پر مشیت ایزدی نے چاہا کہ اسے پھر از سر نو زندہ کرے اور اس گوہر غلطاں کو جو حکمائے فرنگ اور نیم حکیموں کی کثرت کے سبب مانند سنگریزے کے ریزے ریزے ہونے کو ہے سلامت نکالے بہرحال فی زمانہ دہلی میں دونوں حضرات کا دم غنیمت ہے۔"

قاضی عبد الغفار نے جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد حکیم محمود خان کے دور ابتلا اور اسیری کا ایک واقعہ بھی مرزا غالب کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ "۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر میں واپس آنے لگے۔ اسی اثناء میں حاکم شہر کو چغلی خوروں نے (جو ہر دور میں موجود ہوتے ہیں) نے خبر دی کہ راجہ نریندر بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خان کا مکان مسلمانوں کے لئے جائے پناہ بنا ہوا ہے (یہ بھی فرنگیوں کے دور اقتدار میں ایک جرم تھا۔) اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں موجود ہوں) چنانچہ ۲ رفروری سہ شنبہ کے روز حاکم شہر دوڑ لے کر آ گیا اور مالک خانہ کو مع ساٹھ آدمیوں کے پکڑ کے لے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات ہی میں رکھا۔ لیکن حکیم صاحب کی عزت کا پورا لحاظ کیا گیا۔ بالآخر حکیم محمود خاں، حکیم مرتضےٰ خاں، اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبد الحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہو گئی۔ ۱۲ رفروری کو کچھ اور لوگ چھوڑ دیئے گئے۔ ۱۳ رفروری کو بقیتہ اور رستے رہائی پائی۔" جناب قاضی عبد الغفار نے حکیم محمود خان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو نہایت اچھے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آپ حیات اجمل کے صفحہ ۱۱ میں ارقام فرماتے ہیں کہ "حکیم محمود خان ۷۰ سال زندہ رہے اور مسلسل اپنے فن کے متعلق تصنیف و تالیف میں موجود رہے۔ فنی تصنیف و تالیف کی محرک جو خواہش محمود خان کو بے چین رکھتی تھی وہی چنگاری عبد المجید خان، واصل خان اور اجمل خان کے دل میں بھی روشن تھی۔ سب سے بڑی وراثت جو حکیم محمود خان نے اپنی اولاد کے لئے چھوڑی تھی، وہ

صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک اخلاق انسانی اور جذبہ خدمت خلق اور دوسرے اپنے فن سے محبت۔ دنیا کے مال و متاع سے انہوں نے بہت کم حصہ پایا تھا۔ باپ دادا نے جو کچھ دربار مغلیہ کی یادگار چھوڑا تھا۔ وہ سب سرکار انگریزی کی نذر ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب وہ حکومت کی توجہات سے بے نیاز ہو گئے تو پھر کبھی انہوں نے اس کی طرف رخ نہیں کیا۔ جاگیروں کے ضبط ہونے کے بعد تو وہ بالکل یکسو ہو گئے تھے۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

لیکن اخلاق و اعمال کی جو دولت وہ چھوڑ گئے اس سے ان کے جانشینوں کو بڑی بڑی سعادتیں حاصل ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس دور آخر کے مسیحا تھے۔ مزاج بہت آزاد اور بے پروایانہ تھا لالچ، طمع، غرور اور خود نمائی سے نفرت تھی لیکن خودداری کا جذبہ بہت قوی تھا" (حیات اجمل صفحہ ۱۷ - ۱۸)۔

لیکن ان کے شاگرد رشید حضرت فخر الاطباء کے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے طب یونانی کی نعمتوں سے اہل ہندوستان کو عموماً اور اہل دہلی کو اس قدر نوازا کہ وہ دوسرے طبی علوم سے استفادہ کی جانب ملتفت نہیں ہوتے تھے اور ڈاکٹروں کی توجہات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ حضرت فخر الاطباء کا کہنا تھا کہ حکیم محمود خان کی بدولت جن امراض کا علاج امیروں کے لئے ہزاروں لاکھوں کے اخراجات کا باعث تھا۔ وہی علاج غرباء کو کوڑیوں کے مول میسر تھا۔ ان کے بقول طب یونانی نے اپنی حکمتوں کے خزانے اس طرح عوام اور غرباء پر دا کئے کہ یہ طریقہ علاج ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا سہارا بن گیا۔ اور انہیں کسی خاص کر طب مغربی کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں رہی۔ حکیم فخر الحسن فرماتے تھے کہ ہندوستان میں مغربی علوم اور جدید فنون کے مقابلہ میں حکیم محمود خان ایک ایسا سخت حصار تھے جسے انگریزی حکومت توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور طب یونانی جس کے بارے میں عام طور پر مایوسی کا اظہار کیا جاتا تھا ان کی مہربانی اور توجہ سے ایک ایسی زندہ جاوید حقیقت بن گئی جس سے کسی کو انکار کا یارا نہ تھا۔

حکیم محمود خان اپنی محیر العقول ذہانت کے باعث علاج الامراض میں نت نئے تجربوں کا باعث تھے۔ اور ان کے عجیب و غریب طریقہ علاج کا تمام لوگ لوہا مانتے تھے۔ یادگار دہلی کے مصنف ظہیر الدین نے دہلی کے حالات کے تحت حکیم محمود خان کی حویلی اور ان کے بے مثال طریقہ علاج کے کئی واقعات بیان کئے ہیں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "حکیم غلام رضا خاں کی حویلی سے آگے بڑھ کر بائیں جانب حاذق الملک حکیم عبدالمجید خان کی حویلی ہے۔ آپ شرف خانی خاندان کے فخر تھے۔ دلی کے تمام اطباء بلکہ ہندوستان کے مشاہیر حکمائے ہند یونانی میں حکیم محمد شریف کا خاں کا خاندان مانا ہوا مشہور و معروف ہے۔ اور واقعی حکیم شریف خاں اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔ ایک فن طب ہی نہیں بلکہ دیگر علوم میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ بہت سے رسائل و حواشی آپ کی تصنیف ہیں۔ مگر طبع نہیں ہوئے۔ شرح اسباب پر ان کا مبسوط حاشیہ موجود ہے۔ عنقریب طبع ہونے کی امید ہے۔ حکیم شریف خان کے بعد آپ کے صاحبزادے حکیم صادق علی خان نے مطب سنبھالا اور اپنے والد مرحوم کی طرح زمانہ میں نام پیدا کیا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے حکیم محمود خان صاحب کا شہرہ ہوا۔ اور دور دور کے اطباء ان کا لوہا مان گئے۔ تشخیص امراض کے ساتھ قیافہ کو اتنا دخل تھا کہ دور سے مریض کی صورت دیکھ کر اس کا مرض بتا دیتے تھے۔ ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق نسخہ دیتے تھے (حضرت فخر الاطباء کے حوالے سے یہ بات پہلے ہی بیان ہو چکی ہے) نباضی میں وہ کمال تھا کہ علاوہ امراض کے اور بھی بہت سی باتیں بتا دیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے محض امتحان کے لئے ایک رنڈی کو ڈولی میں بٹھا کر کہار کے ساتھ حکیم صاحب کے مطب میں روانہ کیا۔ مطب کا وقت نہ تھا۔ حکیم صاحب شطرنج کھیلتے تھے۔ اتنے میں ڈولی آئی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کیلئے ڈولی میں ہاتھ ڈالا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی فوراً ڈولی کا پردہ الٹ دیا۔ اور فرمایا کہ قطامہ ڈولی میں بیٹھ کر آئی

ہے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے قصے مشہور ہیں۔ حکیم صاحب کا مزاج بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے ایسی باتیں سرزد ہوتی تھیں کہ ہر لیفول کہ ہنستے ہنستے کچھ دوا بتاتے اور وہ لوگ مزاح سمجھتے اور در حقیقت وہی ان کا علاج ہوتا تھا۔ ان کے اس قسم کے علاج کا ایک واقعہ حیات اجمل کے صفحہ ۱۸ اور ۱۹ میں بھی مذکور ہے۔ جو رسالہ زمانہ بابت ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ کے مطابق دہلی کے ایک شخص کی والدہ بہت بیمار ہوئیں۔ حکیموں کو دکھایا سب نے لاعلاج مرض تجویز کیا۔ آخر میں شخص مذکور حکیم محمود خاں کے پاس پہنچے جنہوں نے حال سن کر تجویز کیا کہ مریضہ کو شربت عناب پلایا جائے۔ اور اسی سے فائدہ ہوا۔ واقعہ کی تفصیل شخص مذکور کی زبانی سنیئے: ایک دفعہ گرمی کے موسم میں ٹھیک دوپہر کے وقت جناب والدہ ماجدہ کو کسی مرض کا دورہ ہوا۔ لیکایک ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ گلے میں بلغم بولنے لگا۔ منہ بند ہوگیا۔ آنکھیں پھر گئیں اور وہ بے ہوش ہوگئیں۔ مکان کے برابر ہی منوہر شرما نامی ایک وید رہتے تھے۔ ان کو بلا کر دکھایا گیا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ سردی اور ہوا کی خرابی ہے مگر مرض بہت بڑھ گیا ہے۔ جانبری کی کوئی امید نہیں۔ بہر حال انہوں نے بہیر دل کی گولی دی مگر وہ کسی طرح حلق سے نہ اتری۔ ناچار والد صاحب گھبرائے ہوئے حکیم محمود خاں کی خدمت میں پہنچے۔ حکیم صاحب مکان کی چھت پر ایک حجرہ میں تسبیح بدست بیٹھے تھے اور وظیفہ خوانی میں محو تھے۔ والد صاحب چونکہ بے تکلف تھے اس لئے وہیں پہنچ گئے اور عرض حال کیا۔ آپ نے جھڑک کر فرمایا کہ جا شربت عناب پلائے۔ اب سوچیے کہ کہاں شربت عناب اور کہاں بہیر دل۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر خیر اس وقت تو چلے آئے۔ پھر تھوڑی دیر میں پہنچے۔ اور جا کر کہا حضرت شربت عناب کے دیتے ہی مریضہ کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہوگئی ہے۔ میں نے آپ کے کہنے سے شربت پلایا ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ مرگئی تو میں قیامت میں آپ کا دامن پکڑوں گا۔ فرمایا کیوں جھوٹ بولتا ہے، تو مجھے خواہ مخواہ دھوپ میں دق کرنا چاہتا ہے۔ اچھا چل۔ یہ کہہ کر آپ پیادہ ساتھ ہو لئے۔ گھر پر آتے ہی ایک لوہے کی نالی سے منہ کھول کر شربت عناب پلوایا۔ اور اس کے پیتے ہی مریضہ کو آرام آگیا۔"

اسی قسم کا ایک واقعہ دہلی اردو اخبار مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۴۱ء کا ہے جو ریاست جے پور کے فکراللک ایک مصاحب کے علاج سے ہے۔ یہ مصاحب صاحب متعدد امراض میں مبتلا تھے۔ اور دواؤں کی صورت یہ تھی کہ اگر ایک مرض میں افاقہ ہوتا تھا تو دوسرا مرض زور کرتا تھا۔ تمام اطبا علاج سے قاصر تھے آخر مہاراجہ جے پور نے حکیم محمود خاں سے رجوع کیا۔ جن کے ڈیڑھ دو ماہ کے علاج سے افاقہ ہوا اور اسی خوشی میں مہاراجہ نے مجلس شادمانی و مسرت منعقد کی اور حکیم صاحب موصوف کو خلعت بیش قیمت پارچہ کا دوشالہ جس میں سات سو روپیہ کا سونا لگا ہوا تھا۔ بطریق انعام عطا کیا۔ یادگار دہلی کے مصنف نے حکیم محمود خاں کی اس کامیابی کو ان کی درویش نوازی، خضر پروری اور غربا نوازی سے تعبیر کیا ہے۔ مصنف موصوف فرماتے ہیں کہ "غرض تمام ہندوستان میں آپ کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ حکیم محمود خاں صاحب علاوہ علمی لیاقت اور ذاتی شرافت کے فقیر دوست اور درویش نواز تھے۔ امیروں کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔ فقیروں کا دم بھرتے تھے۔ دیوبند ضلع سہارنپور میں گھسین شاہ صاحب ایک مجذوب صاحب خلوت تھے۔ حکیم صاحب ہمیشہ دلی سے دیوبند تشریف لے جاتے تھے اور پیادہ کئی کئی روز تک ان کے ساتھ رہتے۔ حکیم حافظ عبدالرحمن صاحب نابینا کہ اکمل الفقرا اور عظام مشائخ میں تھے۔ (اور جن کا ذکر قاضی عبدالغفار نے حیات اجمل میں بھی کیا ہے) اور جن کا مزار اب حضرت سلطان نظام الدین اولیاء کی خانقاہ کے قریب ہے سے مرید تھے۔ ان کا بتایا ہوا وظیفہ حکیم صاحب ہمیشہ بعد مغرب پڑھا کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں کا یہی طریق رہا ہے۔ غرضیکہ حکیم محمود خاں صاحب نہایت آزاد، مستغنی المزاج تھے۔ یہ فقرا ہی کی صحبت کا اثر تھا۔ دوا کا محض بہانہ تھا۔ اور جو مریض آتا تھا بہت جلد شفا پاتا تھا۔" شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی نے صحیح فرمایا ہے کہ حکیم محمود خاں اپنے وقت میں دلی کے بے تاج بادشاہ تھے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

حکیم محمود خاں کا ایک کارنامہ تو مدرسہ طبیہ کا قیام تھا۔ جسے ان کے فرزند اول نے بام عروج تک پہنچایا اور آخری فرزند نے کالج کی شکل دی۔ نیز ان کا ایک کارنامہ دہلی سے اپنے خاندان کے مؤسس حکیم اکمل خاں کے نام پر اکمل الاخبار کا اجراء تھا جس کی ادارت کے فرائض اللہ کے سب سے چھوٹے فرزند حکیم اجمل خاں کے سپرد تھی۔

اکمل الاخبار

جناب امداد صابری نے تاریخ صحافت اردو حصہ دوم میں تحریر فرمایا ہے کہ اکمل الاخبار دہلی۔ بلیماران دیوان حکیم محمود خاں سے یکم جنوری سنہ ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار چہارشنبہ کو نکلتا تھا۔ اس کے مالک و مہتمم سید فخر الدین صاحب تھے۔ یہ اخبار اکمل المطابع میں چھپتا تھا۔ اکمل الاخبار کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حکیم غلام رضا خاں، حکیم غلام نبی، حکیم محمود خاں اور سید فخر الدین کے آپس میں بہت گہرے تعلقات تھے۔ ان کا مشورہ ہوا کہ اخبار نکالا جائے۔ چنانچہ اخبار اور پریس کے نام پر غور ہوا۔ تو یہ طے پایا کہ اپنے جد امجد حکیم محمد شریف خاں کے والد ماجد حکیم اکمل خاں کے نام پر اخبار نکالا جائے اور پریس کھولا جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۶ء میں پریس اور اخبار جاری ہوئے۔ مطبع اور اخبار کے کرتا دھرتا اور مہتمم سید فخر الدین صاحب تھے۔ اور نگراں بقیہ حضرات ہوئے۔ اس پریس میں زیادہ تر شریفی خاندان کی مستند طبی کتابیں چھاپی گئیں۔ شریفی خاندان کی مشہور اور نایاب کتاب علاج الامراض اسی پریس میں چھپی۔ یہ اخبار جب جاری ہوا تو مرزا غالب اس کے منیجر تھے۔ انہوں نے پہلا سرکلر اپنے دوست مولوی سیف الحق سیاح کے نام جاری کیا جس کے الفاظ یہ ہیں" اقبال نشان سیف الحق کو دعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری کے اور تین اشتہار کتاب کی خریداری کے آپ کے پاس پہنچتے ہیں۔ چھوٹے صاحب کو ملاحظہ کروائیے۔ اور اطراف و جوانب اور نزدیک و دور بھیجئے۔ جو صاحب کتاب اور اخبار دونوں کے خریدار ہوں وہ دونوں کی خریداری کی اطلاع کا خط سید فخر الدین مہتمم اکمل المطابع کے نام بھیجیں"!

جناب امداد صابری آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ" چونکہ شریفی خاندان میں خودداری اور خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اخبار ان ہی خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ نڈر اور بے باک تھا۔ سچی بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ اپنے مخالفوں کو پکڑتے تھے۔ جیلوں میں بھیجتے تھے اور سختی کے ساتھ کچلتے تھے۔ لاتعداد مخبر تھے اور ان سے زیادہ خوشامدی لوگ تھے۔ (جو ہر دور میں تھوک کے حساب سے ملتے ہیں) جو جھوٹی سچی رپورٹیں کر کے اپنے مخالفین کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کراتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے اخباروں میں (آفرین ہے ان کی ہمت پر) اس قسم کی خبریں شائع ہوتی تھیں اور اکمل الاخبار ان سے بھرا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ قاضی عبدالغفار نے اکمل الاخبار کے بارے میں حیات اجمل میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں بیشتر قیاس آرائیاں ہیں۔ مگر انہوں نے اسی اخبار کے فائل سے سنہ ۱۸۹۲ء، سنہ ۱۸۹۳ء اور سنہ ۱۸۹۴ء کے اداریوں سے جو اقتباس دیئے ہیں ان سے امداد صابری کے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے کہ اکمل الاخبار ہندوستانی عوام کے جذبات کا صحیح ترجمان تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اہل وطن میں جذبۂ حب الوطنی اور غیرت پیدا ہو۔ مثلاً ۱۲ر جنوری سنہ ۱۸۹۴ء کے اداریہ کے یہ الفاظ ہیں۔" ایسے اخبارات بہت ہیں جو ہمیشہ گورنمنٹ انگریزی کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گورنمنٹ ہمارے لئے ابر رحمت ہے۔ اور ہم کو گورنمنٹ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے اور اسی کی اطاعت میں اپنے جان و مال کو قربان کرنا چاہیئے۔ اسی قسم کے اخبارات مسلمانوں کے قلم سے لکھے جاتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ایسے اخبارات جس قدر تعداد میں زیادہ ہیں اسی قدر ان اخبارات پر بھروسہ اور یقین کرنے والے کم ہیں۔" ان مختصر الفاظ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سنہ ۱۸۵۷ء اور انیسویں صدی کے اواخر تک برصغیر میں جو اخبارات شائع ہوئے ہیں ان میں بیشتر انگریزوں کی ذہنی غلامی سے پاک تھے۔ اور

صحیح معنوں میں محب وطن تھے۔ دوسرے یہ کہ عوام ایسے اخبارات کو ناپسند کرتے تھے جو خوشامدیوں کے نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے تھے۔ یا جو حکومت کی طرف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کے عادی تھے۔

خاندان شریفی کے دوسرے حکماء

حکیم محمود خان کے ذکر میں چونکہ ان کے والد حکیم صادق علی خان، ان کے والد حکیم شریف خان اور ان کے والد حکیم اکمل خان کا ذکر آیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختصر حالات کا اس موقع پر تذکرہ ہو جائے۔ خاندان شریفی کے جد اعلیٰ سلطان محمد ہرات کے رہنے والے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے حیات اجمل میں لکھا ہے کہ سلطان محمد بابر کے عہد کے بعد اور غالباً ہمایوں کے زمانہ میں ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے۔ اور بقول حکیم محمود خان آگرہ میں ان کا مکان سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد تک موجود تھا۔ لیکن حکیم اجمل خان کے بیان کے بموجب (سلطان محمد صاحب کے فرزند) ملا علی قادری ہی اس دور میں خاندان شریفی کے مورث اعلیٰ تھے۔ وہ اکبر اعظم کے عہد میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ اکبر اعظم ہی کے عہد میں اس خاندان کا تعلق دربار شاہی سے قائم ہوا۔ چنانچہ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانہ تک ہر دور میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد ضرور دربار شاہی سے وابستہ رہا۔ ملا علی قادری (اور ان کے بھائی ملا علی دادا) کے علم فضل نے ان کے خاندان میں طب یونانی کے فضل و کمال کی راہ اختیار کی۔ اس خاندان کے سب سے پہلے طبیب حکیم محمد فاضل خان تھے۔ جن کے بیٹے حکیم محمد واصل خان اول عہد عالمگیری میں اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی آئے۔ اور غالباً اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں دربار کے عہدہ طبابت پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اقبال تیموری ہی کا آفتاب نصف النہار سے گزر کر مائل بہ انحطاط تھا۔ اورنگ زیب کا انتقال سنہ ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ اور سنہ ۱۷۴۸ء تک ۴۱ سال کی مدت میں اورنگ زیب کے بعد چار بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت شاہی پر آئے اور گزر گئے۔ ان میں دو قتل ہوئے اور تین کو بمشکل ایک ایک سال مسند تیموری پر سانس لینے کی مہلت نصیب ہوئی۔ اس دور انقلاب کو واصل خان نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اغلب یہ ہے کہ شروع عہد محمد شاہ میں انہوں نے وفات پائی۔ اس کے بعد ان کے دونوں لڑکے اجمل خان اور اکمل خان دربار شاہی سے وابستہ ہوئے۔"

حکیم اکمل خاں

حکیم محمود خان اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ حکیم اکمل خاں کو جو ان کے جد اعلیٰ تھے۔ دربار شاہی سے عظیم آباد (پٹنہ) میں دو لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ (ان ہی کے نام پر اکمل المطابع اور اکمل الاخبار کا نام رکھا گیا تھا) اور حاذق الملک کا خطاب ملا تھا۔ اس طرح خاندان شریفی میں حکیم اکمل خاں حاذق الملک اول تھے۔ بقول قاضی عبدالغفار ان کی ولادت و وفات کی صحیح تاریخیں تو معلوم نہیں لیکن چونکہ یہ ثابت ہے کہ اکمل خان کی مشہور کتاب علاج الامراض سنہ ۱۱۷۷ھ میں لکھی گئی اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ وہ شاہ عالم ثانی کے ابتدائی دور تک ضرور زندہ رہے اور انہوں نے نہ صرف عہد محمد شاہی کے انقلاب انگیز واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ ہندوستان میں خاندان تیموری کے مرض الموت کا آغاز بھی ان ہی کی زندگی کے دوران میں ہو گیا تھا۔"

حکیم شریف خان

قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ "مغلیہ دور کے آخر کے اسی طوفانی سمندر میں ایک موتی کی طرح حکیم اکمل خان کے بیٹے شریف خان پیدا ہوئے۔ ان کا سن ولادت سنہ ۱۷۷۴ء ہے۔ حکیم محمود خان اپنی یادداشت میں کہتے ہیں کہ" ان کے جد امجد حکیم شریف خان کو پانی پت اور ڈاسنہ کے علاقوں میں ۴۵ ہزار کی جاگیر ملی تھی اور شاہ عالم کی وفات کے چار ماہ بعد ان کا انتقال ہوا۔" شریف خان کی زندگی کا یہ دور وہ تھا کہ اقبال تیموری کا آخری گنگورا گر رہا تھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے فرنگی اقتدار نئے ہاتھ پیر

مار نے شروع کر دیتے تھے۔ دلی میں اس وقت مرہٹوں کا اقتدار دربار شاہی پر مسلط تھا۔ اس وقت کی حالت کا اندازہ صرف اسی امر سے ہو سکتا ہے کہ شریف خان کو جاگیر کی جو سند عطا ہوئی تھی اس میں بادشاہ کی مہر کے ساتھ مادھو راؤ سندھیا کا نام "وکیل مطلق، مختار الملک، عمدۃ الامرا" اور "فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی" کے عنوان کے تحت درج ہے۔ اس سند کی تاریخ ۲۷ سال جلوس یعنی ۱۷۸۶ء ہے۔ "قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ "علاوہ فن کمالات کے ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی طب یونانی کی بربادی کو بڑی حد تک روک لیا اور یہ سمجھ کر کہ اب دربار شاہی کی سرپرستی سے ان کا فن محروم ہو گیا ہے۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ بغیر اس سرپرستی کے بھی طب یونانی کو کس طرح باقی رکھا جا سکتا ہے۔ بقول صاحب قاموس المشاہیر حکیم شریف خان نے ۱۲۳۱ھ میں وفات پائی۔ قطب صاحب میں مجلس خانہ کے قریب باولی کی طرف جاتے ہوئے ان کا مزار موجود ہے۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی نے لکھا ہے کہ خاندان شریفی کی طبی حیثیت حکیم شریف خان کے زمانہ میں بہت ممتاز ہو گئی۔ حکیم شریف محمد شاہ کے عہد کے نہایت فاضل اور کامیاب طبیب تھے۔ انہوں نے قانون شرح اسباب اور نفیسی پر حواشی بھی لکھے۔ ان حواشی سے ان کی وسعت نظر تحقیق اور اصابت رائے کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں انہوں نے بعض نہایت دقیق اور مختلف الفیہ مسائل کے متعلق نہایت خوبی کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ حکیم شریف خان کی طبی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اور ان کا مطب مرجع و نام تھا۔ اکثر روسا ان سے مشورہ کرتے تھے اور ان کے کامیاب علاج کے مداح و معترف تھے۔

حکیم صادق علی خان

قاضی عبدالغفار نے حیات اجمل میں لکھا ہے کہ "جس وقت تیمور کی اولاد دلی کے قلعہ میں انگریزوں کی وظیفہ خوار تھی اور ابو النصر محمد معین الدین اکبر شاہ ثانی لال قلعہ میں بجھتے ہوئے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے تھے اس زمانہ میں حکیم شریف خان کے فرزند حکیم صادق علی خان برائے نام اس دربار سے وابستہ تھے بقول حکیم محمود خان اسی زمانہ میں انگریزوں نے اس خاندان کی جاگیر ضبط کر لی اور اس کے بجائے حکیم صادق علی خان کے اور ان کے بھائیوں کی کچھ تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ چونکہ دربار میں کچھ دم باقی نہیں تھا۔ اس لئے لال قلعہ سے حکیم صادق علی خان کا تعلق محض برائے نام تھا۔ البتہ وہ اپنے والد کی طرح اپنے فن کی خدمت میں بہت مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے "زاد غریب" "کلیات خورد و کلاں" "شرح معالجات" "قانونچہ و شرح تشریح اعضاء مرکبہ" "قانون" "رسالہ در خواص ادویہ و غذائیہ و نسخہ مرکبہ در طب" "در رسالہ تقویۃ العقائد" بہت مشہور ہیں۔ فن طب اور زبان عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت کا پتہ ان کی تصانیف سے ملتا ہے۔" آپ کا وصال ۱۲ صفر ۱۲۶۴ھ میں ۸۰ سال کی عمر میں ہوا اسی زمانہ میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بعد خاندان شریفی کا کوئی تعلق دربار سے باقی نہیں رہا۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی نے لکھا ہے کہ حکیم شریف خان کے بعد حکیم صادق علی خان اپنے گراں قدر والد کے جانشین ہوئے۔ وہ اپنے والد کی خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کی علمی قابلیت اور عملی مہارت کی وجہ سے شریف خانی مطب کی مقبولیت بدستور باقی رہا۔ حکیم صادق علی خان عربی اور فارسی کے فاضل تھے اور حکیم شریف خان کی طرح علمی ذخائر پر نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے قانون کے حصہ تشریح الاعضاء مرکبہ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی۔ جس سے ان کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں جا بجا منافع الاعضاء جالینوس شرح قانون حکیم جیلانی، شرح املی وغیرہ کے اقتباسات درج ہیں یہ کتاب شرح التشریح الاعضا المرکبہ کے نام سے مطبع مجتبائی میں شائع ہو چکی ہے اور عرصہ تک مدرسہ طبیہ کے نصاب میں شامل رہی حکیم شریف خان اور حکیم صادق علی خان دونوں کے شاہان مغلیہ سے طبی تعلق تھے اور انہیں طبی خدمات کے معاوضہ میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ جسے ۱۸۵۷ء میں حکومت برطانیہ نے ضبط کر لیا۔

فخر الحکماء کانپور میں

حکیم محمود خان سے اکتساب علم کرنے کے بعد حکیم فخر الحسن نے ان کی نگرانی میں مطب شروع کیا اور ان کے زیر ہدایت نسخہ نویسی شروع ہوئی۔ انہوں نے چند ماہ میں وہ استعداد حاصل کر لی کہ حکیم محمود خان کو ان پر فخر ہونے لگا۔ اسی زمانہ میں کانپور کے بہت سے لوگ خاص کر باط خانہ کانپور کے مخیر افراد جن کی برادری کا ایک بہت بڑا حصہ دلی میں بھی موجود ہے۔ اور جب سے ان کے خاندانی روابط بھی تھے۔ حکیم محمود خان سے درخواست کرنے لگے کہ آپ بھی کبھی کبھی کانپور تشریف لے جایا کیجئے تاکہ اہل کانپور کو آپ کی ذات گرامی سے نفع ہو۔ بساطی برادری کی دلی میں بھی بہت عزت تھی اور اس برادری کے بعض افراد کی حکیم محمود خان سے بھی نیازمندی تھی۔ اس لئے حکیم محمود خاں پر جب ان لوگوں کا اصرار بڑھا تو ایک روز حکیم صاحب نے ان لوگوں سے حکیم فخر الحسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم انکو کانپور لے جاؤ۔ یہ بالکل میرے مثل ہیں۔ حکیم صاحب کا یہ ارشاد اگر ایک طرف استاد کا شاگرد پر بے پناہ اعتماد کا مظہر ہے وہاں شاگرد کی اعلیٰ صلاحیتوں، استعداد، ذہانت اور قابلیت کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ حکیم فخر الحسن کانپور آئے اور یہاں آکر باقاعدہ مطب کیا۔ چونکہ آپ حکیم محمود خاں کے فرستادے کی حیثیت سے کانپور آئے تھے لہذا بساطی بازار کے لوگوں میں آپ حکیم دہلوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مگر آپ کا یہاں زیادہ دل نہیں لگا اور پھر اپنے استاد کی خدمت میں واپس دہلی پہنچ گئے۔ دہلی سے الفت و محبت کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ استاد گرامی کی ذات تھی۔ لیکن اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت فخر الحکماء نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ جسے بچپن کہتے ہیں دہلی میں اپنے نانا حضرت شاہ حسن عسکری شہید کی سرپرستی میں گزارا تھا۔ اور بچپن کے نقوش ان کے ذہن میں بدستور باقی تھے۔ لیکن کانپور جانے اور وہاں رہنے کی وجہ سے اس شہر کے بعض مشہور اشخاص اور علمی شخصیتوں سے ان کے ذاتی مراسم ہو چکے تھے جن میں جناب عبد الرحمٰن خان مالک مطبع نظامی مولانا عبد الجلیل وکیل رفیق خاص پنڈت موتی لال نہرو اور جگی لال جن کا خاندان آجکل شمالی ہند کے امیر ترین خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے قابل ذکر ہیں۔

ان حضرات نے حضرت فخر الحکماء پر بہت زور دیا۔ حکیم محمود خان بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد رشید کے حالات بہتر ہوں۔ اس لئے آخر کار حکیم فخر الحسن کو دہلی کی سکونت ترک کر کے کانپور میں آباد ہونا پڑا مگر اب جو آپ کانپور تشریف لائے تو بساط خانہ آپ کا مستقر نہ تھا۔ اب آپ کا مستقل قیام چٹائی محال بنی تھا جو مولوی عبد الجلیل وکیل اور جگی لال کا محلہ تھا اور جہاں سے عبد الرحمٰن خان کا مطبع اور مکان زیادہ دور نہیں تھا۔ فخر الحکماء نے اس محلہ میں ایک مکان خرید لیا۔ اب گویا ان کا مولوی عبد الجلیل کا اور جگی لال کا مکان ایک ہی محلہ اور ایک ہی سڑک پر واقع تھا۔ اسی زمانہ میں ان کے تعلقات کانپور کے مشہور قاضی خاندان اور جنگ آزادی کے ایک اور ہیرو عظیم اللہ خان اور نانا راؤ کے دوست قاضی محمد اسمٰعیل کے بڑے صاحبزادے قاضی احمد حسین سے ہوتے جن سے حضرت فخر الحکماء کی بعد میں قرابت بھی ہوئی آپ نے اپنے ایک اور ہم محلہ پنڈت پیرتھی ناتھ سے دوستی پیدا کی۔ چند سال بعد مولانا اشرف علی تھانوی بھی کانپور آئے۔ اور اس طرح ان سے بھی رابطہ ہوا۔ غرض کہ حضرت فخر الحکماء کا یہ دور حیات جو ۱۳۰۲ھ سے لیکر ان کی رحلت ۱۳۱۵ھ تک کانپور میں نہایت فارغ البالی، ذہنی سکون اور علمی و عملی سرگرمیوں میں بسر ہوا۔ یہ ان کی فتوحات کا دور تھا۔ اور اس دور میں وہ کانپور کی نہایت مشہور و معروف علمی اور طبی شخصیت بن گئے۔

حکیم ناطق لکھنوی کی روایت ہے کہ اس زمانہ میں کانپور میں ایک بہت بڑا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا جس میں ایک شخص نے جنون کے عالم میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ فریق مخالف یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ قتل عالم جنون میں ہوا طرفین سے عجیب عجیب نکات اور نکتے اٹھائے گئے۔ آخر عدالت نے ماہر

طبیب کی حیثیت سے آپ کو عدالت میں طلب کیا۔ اگرچہ فخر الحکماء اپنے اساتذہ کی طرح کچہری اور عدالت میں جانے سے اجتناب کرتے تھے لیکن یہ معاملہ فن طب سے متعلق تھا۔ حکیم ناطق لکھنوی فرماتے ہیں کہ آپ عدالت میں تشریف لے گئے اور آپ نے دو روز مسلسل جنون اور اس کی اقسام پر بیان دیا۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت فخر الحکماء نے عدالت کو بتایا کہ جنون کی ۵۰ قسمیں ہوتی ہیں۔ اور پھر ہر ہر قسم کا الگ الگ تذکرہ فرمایا۔ انہی حکیم ناطق کا بیان ہے کہ اس گفتگو کو سننے کے لئے کمرہ عدالت دونوں دن کھچا کھچ بھرا رہا اور ہر شخص اس عجیب تقریر سے محو حیرت تھا۔ مگر راقم کو اس پر کوئی حیرت نہیں۔ اس لئے کہ اسے یاد ہے کہ حکیم محمود خان نے حکیم عبدالمجید سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ تم ضرور علاج معالجہ میں میرے جانشین ہو اور میرے علم کو پہنچے ہوئے ہو لیکن جہاں تک فن طب کا تعلق ہے یہ تو مولوی فخر الحسن اپنے ہمراہ لے گئے۔ (بحوالہ حکیم محمد یوسف گنگوہی بروایت حکیم محمد یعقوب قدس) اور حکیم محمود خان جیسے تنک مزاج شخص کے منہ سے غلط بات نہیں نکل سکتی تھی۔ کانپور کے ایک اور مشہور طبیب ڈاکٹر عبدالصمد بھی آپ کی طبی قابلیت کے معترف تھے اور شہر کے دوسرے حکماء جن میں حکیم خواجہ اور حکیم پیارے صاحب بہت مشہور ہیں۔ اکثر معاملات میں آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

جناب دور ہاشمی کا بیان

جناب دور ہاشمی کانپوری جنھیں حضرت جگر مرادآبادی کا شاگرد رشید ہونے کا شرف حاصل ہے اور جن کی ذات سے کانپور اور بنگلور (جنوبی ہند) کی ادبی سرگرمیوں کو تقویت اور تقویت مزید حاصل ہوتی اور جو حضرت فخر الحکماء کے سب سے بڑے پوتے ہیں اپنی یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں کہ "مولوی عبدالجلیل جو کانپور کے ایک ممتاز اور مشہور وکیل تھے آپ (حضرت فخر الحکماء) نہ صرف بحیثیت دوست بلکہ بہ اعتبار معالج کانپور آئے تھے۔ آپ کا قیام محلہ چٹائی محال میں مولوی عبدالجلیل صاحب کی عظیم الشان کوٹھی میں رہا۔ اسی اثناء میں جب آپ کی شہرت ہوئی، اور کانپور کے عوام کو آپ کی دواؤں اور علاج سے شفا ملتی رہی تو وہاں کے ہندو خاص طور پر حکیم صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔ جن میں کانپور کے مشہور کروڑپتی جگی لال موجودہ پدم پت سنگھانیہ کے جد امجد اور کانپور کے مشہور وکیل پنڈت پرتھی ناتھ جن کے نام پر آج بھی کانپور میں پنڈت پرتھی ناتھ ہائی اسکول موجود ہے۔ ان کے اصرار پر حکیم صاحب کو کانپور میں مستقل رہائش اختیار کرنا پڑی اور پھر آپ نے کچھ دنوں بعد محلہ چٹائی محال میں اپنا ذاتی مکان بھی تعمیر کر لیا۔ جس کا نچلا حصہ مطب، دواخانہ اور کتب خانہ کے لئے وقف تھا اور اوپر کے حصہ میں رہائش تھی۔) اور مکان سے ملحق (نہایت عظیم الشان کرسی کی جس میں دو مینارے اور تین گنبد تھے) ایک مسجد کی بنا ڈالی۔ مکان تو آج باقی نہیں لیکن مسجد موجود ہے"۔ یہ مکان جسے سنہ ۱۹۳۱ء کے ہندو مسلم فسادات میں سامان لوٹنے کے بعد آگ لگا دی گئی تھی اور جس میں آپ کا عظیم الشان کتب خانہ بھی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ آپ کے ورثاء نے جگی لال کے اعزا میں سے ایک کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اسی عزیز نے اسے منہدم کر کے اسے اپنے مکان کے اندر شامل کر لیا۔" جناب دور ہاشمی نے آگے چل کر اپنے منجھلے بھائی جناب وحید الحسن کے حوالہ سے حضرت فخر الحکماء کی طبی زندگی کا ایک واقعہ بھی اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔ مرحوم فرماتے تھے کہ "میرے بھائی وحید الحسن کا بیان ہے کہ کانپور کے ایک مشہور اور مقبول طبیب حکیم خواجہ محمد صاحب جو ہمارے خاندانی طبیب تھے۔ انہوں نے غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں میرے بھائی سے کہا کہ کہو تو تمہارے دادا مرحوم (حکیم فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک نسخہ تیار کر دوں جو میرے پاس خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ بھائی نے پوچھا کہ وہ نسخہ کیا ہے تو حکیم صاحب موصوف نے بتایا کہ ڈیڑھ من خالص دودھ میں ایک تولہ شنگرف کو پکانا ہے اور یہ کام چالیس دن میں مکمل ہوگا کیونکہ دودھ کو کونڈوں پر رات دن پکانا ہوگا یہاں تک کہ خشک ہو جائے اور اس کے بعد جب دودھ خشک ہو جائے تو پھر شنگرف کھرل کر کے سفوف بنایا جائے گا اور اس کی خوراک

روزانہ ایک ماشہ ہوگی جو ایک پاؤ گرم دودھ کے ساتھ استعمال ہوگی۔ حکیم خواجہ کا کہنا تھا کہ یہ نسخہ نہ صرف مقوی باہ تھا بلکہ رگوں پٹھوں کو مضبوط اور طاقت ور بناتا تھا اور اس سے عمر بڑھتی ہے۔"

اسی طرح حضرت فخر الحکماء کے بارے میں خاندانی روایات میں ہے کہ وہ روزانہ صبح سویرے نہار منہ ایک امرود کے استعمال کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح امرود کے استعمال سے معدہ کے جملہ امراض ختم ہو جاتے ہیں۔ خاندانی روایات کے مطابق انہوں نے یہ بات ڈاکٹر عبد الصمد صاحب کی والدہ کو بتائی تھی اور وہ تازندگی روزانہ صبح سویرے ایک امرود استعمال کرتی تھیں۔ جناب دور ہاشمی کی یادداشت میں ہے کہ خود حضرت فخر الحکماء نے یہ شنگرف والا نسخہ استعمال کیا تھا جس کی بناء پر انہیں سردی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ انتہائی سردی میں بھی وائل کا فالسائی رنگ کا انگرکھا استعمال کرتے تھے۔ اور گرمیوں کے ایام میں انہوں نے اپنے گھر میں ایک گہرا گڑھا کھدوا لیا تھا جس میں دوپہر کو بیٹھے رہتے تھے۔"

حضرت فخر الحکماء کی کامیاب ادویات

حضرت فخر الحکماء کے صاحبزادے مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی نے اپنی تصنیف اصول الشاشی مع عمدۃ الحواشی کے آخری صفحہ میں اپنے والد کے اہم نسخوں کا ذکر فرما کر اس کے مختصر خواص کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے حضرت فخر الحکماء کی طبی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مولانا فیض الحسن کے الفاظ یہ ہیں "العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان چونکہ علمی خدمت کے پہلو بہ پہلو بمصداق حدیث شریف مذکور بدنی خدمت بھی موجب سعادت تھی۔ اور ادھر جناب والد ماجد مولانا حافظ حکیم مولوی فخر الحسن گنگوہی مرحوم ومغفور فخر تلامذہ روزگار جناب حذاقت مآب حکیم محمود خان دہلوی کے مجرب ومفید اور بیش بہا نسخے میرے پاس وراثتاً موجود تھے جن سے بوجہ وفات حسرت آیات جناب والد مرحوم ومغفور عام لوگ متمتع نہ ہوسکتے تھے۔ اور نہ آئندہ کسی زمانہ میں ان سے عام فائدے کی امید کی جاسکتی تھی۔ اس لئے اور نیز اس لئے کہ اگر کوئی صاحب مستفید ہوں تو ان مرحوم کے حق میں کہ حکم ہے کہ بمقتضائے خاصہ انسانی الانسان عبید الاحسان دعائے خیر کرگزریں اور جناب باری عز اسمہ اس استفاع کا سبب قریب ہونے کی وجہ سے کیا عجب ہے کہ ان کے متعلق اپنی نکتہ نوازی کو کام فرما جائیں اور اس طرح سے ہیں ان کے حقوق سے سبکدوش ہو جاؤں۔ چند کثیر الوقوع امراض کے نسخے تیار کرکے اس کتاب کے ٹائیٹل پر جو علمی خدمت کا ایک قابل قدر علمی نمونہ ہے۔ بغرض رفاہ عام درج کئے جاتے ہیں۔ اگر ناظرین نے فائدہ اٹھانے میں پہلوتہی نہ کی تو انشاء اللہ چند مفید عام نسخے اور بھی تیار کرلئے جائیں گے۔ ان دواؤں کے یہ نام ہیں: ۱۔ سفوف سلیمانی ۲۔ خوشبودار مسی ۳۔ تمباکو کے قوام کی نقرئی مشکی گولیاں ۴۔ حب معطر دہن ۵۔ دوائے قمل ۶۔ سرمۂ دردنما ۷۔ عرق مسی ۸۔ شربت مقوی باہ واعضائے رئیسہ ۹۔ مانع غثیان وقے ۱۰۔ حب سرفہ نمبر اول ۱۱۔ حب سرفہ نمبر ۲ (۱۲) حب سرفہ نمبر ۳ (۱۳) حب سرفہ نمبر چہارم (۱۴) حب بخار ۱۵۔ قبض کشا ۱۶۔ سنون جامع النفع ۱۷۔ اکسیر احمر ۱۸۔ عرق عشبہ مرکب مصفی خون ۱۹۔ طلا معجز نما نشک والا ۲۰۔ حب سرخ ۲۱۔ عجیب روغن ۲۲۔ بواسیر کی گولیاں ۲۳۔ سفوف سوزاک ۲۴۔ حبوب ڈبہ وفلل شکم ۲۵۔ سنون (منجن) مستحکم دندان خوشبودار ۲۶۔ سرمہ مجلی بصر ۲۷۔ سرمہ مقوی نظر ۲۸۔ سرمہ دافع سوزش ۲۹۔ حب حیات ۳۰۔ حب ترش ۳۱۔ حب قبض ۳۲۔ حب مسہل ۳۳۔ اکسیر امفز ۳۴۔ حب جریان ۳۵۔ حب ممسک ۳۶۔ حب پیچش ۳۷۔ حب طلال ۳۸۔ حب آتشک ۳۹۔ روغن مقوی دماغ ۴۰۔ حب مقوی اعضائے رئیسہ۔

ہیضہ کا علاج

حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے لکھا ہے کہ حضرت فخر الحکماء نے کانپور میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑنے پر ایک نسخہ تجویز فرمایا تھا۔ جس میں ۹۰ فیصد کامیابی ہوئی۔ آپ نے اس نسخہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے اصول اشاشی مع عمدۃ المواشی کے آخری صفحہ پر یہ ارتقام فرمایا ہے یہ یوں تو ہیضہ کے بہت علاج ہوئے اور کم وبیش مفید بھی ہوئے۔ مگر جناب والد مرحوم کا یہ مجرب اور بیش بہا نسخہ اپنی معجز نما تاثیر سے تیر بہدف ہوا۔ اب سے دور کانپور میں تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا، کس شدت کا ہیضہ ہوا تھا۔ روزانہ ہزاروں موتیں ہوتی تھیں۔ اس وقت جناب والد مرحوم (حضرت فخر الحکماء مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی) نے عام طور پر اسی نسخہ کا استعمال فرمایا تھا۔ فرماتے تھے (حضرت فخر الحکماء) کہ "۹۰ فیصد کے حساب سے مبتلائے ہیضہ شفایاب ہوئے تھے" خیال فرمائیے کتاب سے ۹۵ برس پہلے (۱۹۸۰ء) جب میڈیکل سائنس نے ترقی کے وہ مدارج طے نہیں کئے تھے جو اب ہمیں نظر آرہے ہیں۔ اسی وقت ہیضہ جیسے موذی مرض کے خلاف طبی یونانی کی حدود میں رہتے ہوئے ایسا کامیاب نسخہ ترتیب دینا جس میں ہیضہ سے اموات میں ۹۰ فیصد کمی ہو جائے اپنی جگہ کتنا حیرت انگیز اور عظیم الشان کارنامہ تھا۔

عقد ثانی

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت فخر العلماء کی زندگی کا آخری حصہ جو کانپور میں بسر ہوا وہ ان کے حیرت انگیز طبی کمالات پر مشتمل ہے جس کے باعث ان کو مالی اعتبار سے وہ آسودگی حاصل ہوئی جو اس سے پہلے ان کو حاصل نہیں تھی آپ نے اپنے دونوں فرزندوں یعنی مولانا حافظ مولوی نور الحسن اور مولانا حافظ فیض الحسن کو اعلیٰ تعلیم کے لئے دلی روانہ کیا۔ جہاں ان دونوں نے مدرسہ حسین بخش میں تعلیم حاصل کی۔ ان دونوں نے اپنے والد ماجد کے حکم پر حضرت فخر العلماء کے خالہ زاد بھائی مولانا صدیق احمد انبیٹھوی سے مالیر کوٹلہ میں بھی تعلیم حاصل کی مگر ابھی ان کی تعلیمی زندگی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی کہ ان کے سر سے ان کے والد کا سایہ اٹھ گیا مگر ان دونوں نے بہر حال اپنی دینی اور دنیوی تعلیم اسی حادثہ جانکاہ کے باوجود مکمل کی۔ اور اس ضمن میں انہیں اپنی دادی کی سرپرستی اور توجہ حاصل رہی۔ دونوں فرزندوں کے دور رہنے اور والدہ ماجدہ کے گنگوہ میں مستقل قیام کے باعث حضرت فخر العلماء کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا تھا، جس کا فی الوقت پر ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ آپ کے احباب نے ایسے ماحول میں آپ پر زور دیا کہ آپ نکاح ثانی فرمائیں۔ اس وقت آپ کے عزیز دوست مولوی عبد الجلیل کی اہلیہ کی بہن بتول بیگم موجود تھیں۔

آپ نے ان سے عقد ثانی فرما لیا جنھیں عرف عام میں بتولن بھی کہتے تھے اور ان ہی سے آپکی آخری اولاد اور آخری صاحبزادے محمد احمد تولد ہوئے مگر یہ بھی صرف چھ سال کے تھے کہ حضرت فخر العلماء نے وصال فرمایا اور آپ کے فرزند ثانی حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے ان کی تربیت فرمائی۔ حضرت فخر العلماء کا یہ دور جیسا کہ پہلے کئی بار بیان کیا جا چکا ہے فارغ البالی کا دور تھا اور اگرچہ کہ انہوں نے گنگوہ کی سکونت ترک کر دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ یہ چاہتے تھے کہ انکے دونوں فرزند گنگوہ ہی میں بود و باش اختیار کریں اس لئے وہ اپنے چھوٹے بھائی مولوی منظر حسین کو وقتاً فوقتاً کافی روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ اس وقت تک مولوی منظر حسین کے خلف الرشید مولوی حاجی عزیز حسین تولد ہو چکے تھے۔ اس لئے جب رقم گنگوہ روانہ کی جاتی تو حضرت فخر العلماء اپنے چھوٹے بھائی کو ہدایت کرتے کہ وہ تینوں لڑکوں کے نام سے یعنی نور الحسن، فیض الحسن اور عزیز حسین کے نام سے جائیداد خرید لیں اور رقوم کی روانگی کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ حضرت والد کی دوسری اہلیہ الہ آباد کے سید منور علی کی بڑی صاحبزادی ہیں جو الہ آباد سے کانپور آکر اس لئے آباد ہو گئے تھے کہ انکی بہن ثریا بیگم کی شادی ننھے نواب سے جو نواب آغا میر وزیر اودھ کے صاحبزادے تھے۔ ہو گئی تھی۔

اندر سے نخے نواب کی بہن کی شادی نواب ردولیا سے ہوئی تھی جن کا احاطہ نواب صاحب آج بھی کانپور میں بے حد مشہور ہے۔ نخے نواب ہی کے تعلق سے ثریا بیگم کو وثیقہ ملا۔ اور ان کے رشتے سے بتول بیگم کو بھی ایک معقول وثیقہ ملتا رہا جس کا کچھ حصہ ان کے صاحبزادے محمد احمد کو بھی ملا اور وہ قیام پاکستان تک یہ وثیقہ وصول کرتے رہے۔

مرض الموت

حضرت فخر العلماء کو جب کانپور میں قیام کرتے ۱۲ سال کی مدت ہو گئی تو آپ بیمار پڑے۔ لیکن خاندانی روایت کے مطابق آپ ذیابطیس کے پرانے مریض تھے اور یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ بعض حلقے کہتے ہیں کہ شنگرف کے کشتہ کے ردعمل نے ان کو مرض الموت میں مبتلا کر دیا۔ بہر حال کوئی صورت ہو حضرت فخر العلماء نے ابتدا میں خود اپنا علاج کیا مگر جب وہ مایوس ہو گئے تو پھر انہوں نے دوسرے حکماء کو رجوع کیا۔ لیکن ان حکیموں نے جو دوائیں بھی تجویز کیں حضرت فخر الحکماء ان کو پہلے ہی استعمال کر چکے تھے۔ جناب دور ہاشمی کی یادداشت کے مطابق، جب حکیم صاحب کا زمانہ رحلت قریب آیا تو دوسرے مشہور طبیب حکیم صاحب کے پاس آتے تھے اور اپنے اپنے مجوزہ نسخے حکیم صاحب کو استعمال کرنے کی ترغیب دیتے تھے لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہتی تھی جب حکیم صاحب یہ فرماتے تھے کہ وہ یہ دوائیں پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں۔" الغرض حضرت فخر العلماء سنہ ۱۳۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۹۷ء میں وصال فرما گئے اور باطوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کے انتقال پر آپ کے احباب میں غم و افسوس کی لہر دوڑ گئی۔ اور مولوی عبد الجلیل وکیل نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ یہ حکیم صاحب کی وفات نہیں ہم لوگوں کی وفات ہے اور یہ بات آگے چل کر صحیح بھی ثابت ہوئی۔ مولانا عبد الحئی نے بھی نزہۃ الخواطر میں یہی لکھا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے سنہ ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی۔ مولانا انوار الحسن شیرکوٹی اور دوسرے بزرگوں نے حضرت فخر العلماء کے سن وفات کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کی ہیں وہ نادانستہ طور پر غلط ہیں۔ اور صحیح سن وفات سنہ ۱۳۱۵ھ ہی ہے اس لئے کہ آپ کی رحلت کے بعد آپ کے دوسرے صاحبزادے مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی کی ہدایت پر ابو داؤد شریف کا جو حاشیہ مطبع مجیدی سے شائع ہوا اس میں بھی ۱۳۱۵ھ کا سن پڑا ہے۔

عجیب و غریب خواب

یہ سال اس لحاظ سے حضرت فخر العلماء کے خاندان اور احباب پر بھاری تھا کہ اس سال یکے بعد دیگرے کانپور میں چار اموات ہوئیں، خاندانی روایات کے مطابق مولوی عبد الجلیل کے خاندان میں ایک خاتون نے انہیں، ان کے رشتے کے ایک عزیز قاضی احمد حسین اور حضرت فخر العلماء کو ایک سرسبز باغ میں کھانا کھاتے ہوئے دیکھا یہی چاروں دوست یکے بعد دیگرے اسی سن سنہ ۱۳۱۵ھ میں سوا سوا مہینہ کے وقفہ سے انتقال فرما گئے اور چاروں کا مرض الموت ایک تھا یعنی پہلے ایک پھنسی نکلتی تھی جو بڑھ کر ناسور بنتی تھی، یہاں تک کہ یہ مرض جان لیوا بن جاتا۔ اس روایت سے اس بیان کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا انتقال ذیابطیس کی وجہ سے ہوا بہر حال یہ سال کانپور کے مسلمانوں پر بہت بھاری تھا۔

حلیہ

آپ کے پوتے دور ہاشمی کانپوری نے تحریر فرمایا ہے، کہ فخر العلماء میانہ قد، گداز جسم، آنکھیں خوشنما اور جاذب، دانت بے حد حسین یعنی چہرہ بھرا ہوا، رنگ گندمی، داڑھی گھنی، نصف ماہ کامل کی صورت میں" مولانا عبد الحئی نے نزہۃ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۴۵۳ میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت فخر العلماء "صورتاً حسین و جمیل، تندرست و توانا دلے اور خوش مزاج انسان تھے۔" اور یہی بات دوسری کتابوں میں بھی مرقوم ہے

حضرت فخر العلماء کی اولاد واپس گنگوہ میں

آپ کی رحلت کے بعد آپ کے خاندان میں بے حد غم منایا گیا۔ آپ کی والدہ بھائی اور بہن سب صدمہ سے نیم جاں ہو گئے اور آپ کے بھائی کانپور آکر اپنے دونوں بھتیجوں کو گنگوہ لے گئے چھوٹے بھتیجے

جو بہت ہی کم سن تھے اپنی والدہ کے ساتھ کانپور ہی میں رہے۔ جنہوں نے کانپور کے قاضی خاندان میں عقد ثانی کر لیا تھا لیکن آپ کے فرزندوں کا گنگوہ میں دل نہ لگا اور یہ لوگ پھر کانپور واپس آگئے۔ کانپور آنے کی ایک وجہ مسماۃ بتولن کا انتقال بھی تھا۔ جو اپنی دوسری شادی کے بعد ایام زچگی میں ہی فوت ہوگئیں۔ بات یہ تھی کہ جب حضرت فخر الکملہ کے یہاں ولادت ہوئی تھی تو حضرت والا نے زچگی کے دوسرے دن ہی انہیں ساتھ دسترخوان پر بٹھا کر کھانا کھلایا تھا مرحومہ یہ سمجھیں کہ یہ بات معمول کے مطابق ہے۔ وہ یہ بھول گئیں کہ حکیم صاحب نے انہیں گولیاں بھی کھلائی تھیں جن کے باعث وہ زچگی کے دوسرے دن ہی کھانے پینے کے قابل ہوگئیں تھیں۔ جب دوسرے عقد کے بعد ان کے یہاں زچگی ہوئی تو انہوں نے دوسرے دن معمول کے مطابق کھانا پینا شروع کیا جو سم قاتل بن گیا اور ان کی رحلت کا سبب بنا۔ اب یہ دونوں بھائی تھے اور ان کے تیسرے چھوٹے بھائی جن کا واحد سہارا اب یہی دونوں رہ گئے تھے

مرثیہ

حضرت فخر العلماء کے یہ دونوں فرزند بھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئے تھے کہ انہیں اپنے والد کے حادثۂ رحلت سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر اپنے تیسرے بھائی کی تربیت اور پرورش اور سب میں اہم بات یہ کہ تعلیم کا تکملہ کا مسئلہ ایسے عالم میں جس قدر غم کیا جائے کم ہے۔ آپ کے فرزند ثانی حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے اس عالم میں اپنے والد کی رحلت پر جو مرثیہ کہا وہ اصول اتنا ہی مع عمدۃ الحواشی میں شائع ہو چکا ہے جس سے ان کے دلی کرب اور قلبی افسوس کا اظہار ہوتا ہے۔

بیعت

حضرت فخر العلماء جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حضرت قاسم العلوم کے عاشق تھے لہذا انہیں اپنی روحانی تسکین کے لئے کبھی کسی اور کے سامنے دامن پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ لہذا آپ دوران طالب علمی میں ہی اپنے استاد مکرم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے بیعت ہوگئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت قاسم العلوم کے تمام سوانح نگاروں نے حضرت فخر العلماء کا نام ان کے مریدوں میں نہیں لکھا۔ ان کی تسکین کے لئے حجۃ الاسلام کی اس ابتدائی عبارت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جس میں حضرت فخر العلماء نے اپنے استاد مکرم کے نام کے ساتھ مرشد کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ یہ عبارت اپنے مقام پر نقل کی جا چکی ہے۔ اور یہ عبارت جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے انوار قاسمی کے صفحہ ۴۹ میں بھی نقل کی ہے اور یہ کتاب حضرت قاسم العلوم کے دوران حیات میں طبع ہو چکی تھی لہذا اس کے غلط ہونے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حضرت قاسم العلوم کے انتقال کے بعد حضرت فخر العلماء نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے دوبارہ بیعت کی۔ اور اسی بیعت کے سلسلہ میں انہوں نے اپنے سگے خالہ زاد بھائی حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کی امداد حاصل کی یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت فخر العلماء حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد گنگوہ سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔ اور ایک طرف تو معارف قاسمی کی اشاعت میں مصروف و منہمک تھے اور دوسری جانب وہ حکیم محمود خان سے طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ دور ۱۲۹۷ھ سے لیکر ۱۳۰۳ھ تک کا ہے۔ ان کی حضرت گنگوہی سے دوبارہ بیعت کا تذکرہ ان متعدد خطوط میں ہے جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے خلیفہ حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کو لکھے جو اس زمانہ میں بسلسلہ درس و تدریس دہلی میں مقیم تھے۔ یہ خطوط مکاتیب رشیدیہ میں نمبر ۲۲، ۲۳، ۲۷ اور ۳۶ میں موجود ہیں۔ ان خطوں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی حضرت قاسم العلوم کے متبعین کے لئے بے حد ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ مکتوب نمبر ۲۲ میں جس میں ۱۴ رجب ۱۳۰۱ھ کی تاریخ درج ہے۔ حضرت گنگوہی نے مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کو تحریر فرمایا ہے کہ "ابھی بخیریت ہوں جواب آپ کے چار خط کا سابق روانہ کر چکا تھا۔ اب اور خط آیا ہے جس میں فخر الحسن صاحب کا خط ہے اس کا جواب تو وہی جواب ہے جو پہلے لکھ چکا ہوں (گویا دوبارہ بیعت کا مسئلہ پہلے سے چل

رہا تھا) اور اگر (وہ) خواہ مخواہ مجھ سے تعلق بلا واسطہ چاہتے ہیں۔ تو آپ کے ملاقات تک ملتوی رکھیں اور چند بار استخارہ کر لیویں۔ بعد استخارہ دقرار رائے بر وقت دیکھا جائے گا۔ کچھ جلدی کی بات نہیں" اتنا لکھنے کے بعد اور معاملات میں اظہار کیا گیا۔ آگے چل کر پھر اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں، اور اس مرتبہ مولانا فخر الحسن سے براہ راست مخاطب ہے کہ "پیر جی فخر الحسن اگر آپ سے (مولانا صدیق احمد) بیعت کر لیویں تو بہتر ہے ورنہ جواب اول لکھ چکا ہوں۔ اسی پر عمل کریں پیر جیو صاحب کو بعد سلام مسنون۔ مضمون واحد ہے مستطیل خط کی ضرورت نہیں۔" خط نمبر ۲۴ میں جو مولانا صدیق احمد انبھٹوی کے نام ہے اور جس پر ۶ شعبان ۱۳۰۱ھ کی تاریخ درج ہے۔ مولانا رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی فخر الحسن کے واسطے جیسا آپ نے مناسب جانا بہتر ہے۔ اب بیعت ان کو ذکر جہر بارہ تسبیح معمول چشتیہ تلقین فرما دیں۔ وہ کرتے رہیں پھر وقت ملاقات دیکھا جائے گا"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بیعت کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور بیعت کا انحصار حضرت فخر العلماء کے گنگوہ جانے پر منحصر ہے۔ خط نمبر ۲۷ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فخر العلماء گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد سے مل لئے۔ اور مل کر دہلی واپس چلے گئے، گویا بیعت ہو گئی۔ اس خط میں جو اس سے پہلے کے خطوں کی طرح حضرت مولانا صدیق احمد انبھٹوی کے نام ہے۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ "یہاں سب طرح عافیت ہے۔ مولوی فخر الحسن جاتے تھے۔ ان کو خط نہ دے سکا طبع نے تحریر سے کاہلی کی۔ آج جمعہ کو لکھتا ہوں"۔ اس خط پر ۱۳۰۲ھ کا سن دیا ہے۔ گویا بیعت کے تذکرہ اور بیعت میں ایک سال کا تفاوت ہے۔ اس کے مولانا مولانا صدیق احمد صاحب کے نام ایک اور خط میں جس پر ۱۳۰۲ھ کا سن دیا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد نے تحریر فرمایا کہ "مولوی عبد الصمد صاحب کو بھی سلام مسنون فرما دیں۔ حافظ خیر الدین صاحب اگر ہوں سلام پہنچے اور مولوی پیر جی فخر الحسن صاحب کو بھی فقط" اس کے بعد ایک اور خط میں جو مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے نام ہے حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے مولانا فخر الحسن صاحب کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خط مکاتیب رشیدیہ میں نمبر ۴۲ پر ہے۔ ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت کی تھی۔ حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی نے جو اپنے حقیقی پھوپھا حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے خلیفہ بھی تھے۔ سنن ابوداؤد مطبوعہ مجیدی پریس کانپور کیلئے جو مقدمہ تحریر کیا ہے اور جو سنن ابوداؤد کی ابتداء میں موجود ہے لکھا ہے کہ حضرت فخر العلماء فخر المحدثین مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اور انہوں نے سلطان الاولیاء مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی شرف بیعت وتلمذ حاصل کیا۔" جناب محمد اسمٰعیل انصاری گنگوہی نے بعض کتابوں میں یہ بھی پڑھا ہے کہ حضرت فخر العلماء کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی بیعت کا شرف حاصل تھا۔ جناب اسمٰعیل انصاری کی تحریر سے متعلقہ اقتباس پیش خدمت ہے۔ جناب اسمٰعیل انصاری فرماتے ہیں کہ "حضرت والا کی بیعت کے متعلق بھی میں سند سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ ان کی بیعت حضرت مولانا گنگوہی سے ہوئی۔ اگرچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے تذکرہ میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ جس کی نشاندہی کرنے سے بوجہ اپنی معذوری (علالت) کے فی الحال قاصر ہوں۔ بہر حال بیعت حضرت گنگوہی سے ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری گفتگو عزیزی الطاف سلمہ (برادر خورد راقم الحروف) سے ہوئی تھی اس وقت کوئی تذکرہ میرے پیش نظر تھا جس میں حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ کی حضرت والا (حضرت فخر العلماء) کو ہدایات کا ذکر تھا اب نہ اس کتاب کا نام ذہن میں ہے اور نہ تذکرہ کی تفصیل یاد رہی ہے" بہر حال حضرت فخر العلماء کی حضرت قاسم العلوم سے اور ان کی رحلت کے بعد حضرت گنگوہی سے بیعت تو متذکرہ بالا حوالوں سے ثابت ہے رہا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کا معاملہ تو یہ بھی بعید از حقیقت نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے اکثر احباب جن میں سید العلماء مولانا احمد حسن امروہوی بھی شامل ہیں کی حاجی صاحب سے بیعت ثابت ہے۔

تصنیف وتالیف

جیسا کہ پہلے مختصراً بیان کیا جا چکا ہے۔ حضرت فخر العلماءؒ نے علوم و معارف قاسمی کی ترتیب و تشہیر کے ساتھ ساتھ
علوم حدیث میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا حضرت قاسم العلوم کے ایک خط میں جو فیوض قاسمیہ
کے صفحہ ۴۱ اور ۴۰، ۳۹، ۳۸ میں موجود ہے تذکرۃً بتایا گیا ہے کہ حضرت فخر العلماء ابن ماجہ کی تصحیح
کے سلسلہ میں کچھ روز کے لئے دہلی میں ہیں اور یہ کہ یہ کتاب میر معظم علی کے مطبع میں طبع ہو رہی ہے۔"
مولانا سید احمد رضا بجنوری نقشبندی مجددی نے انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری کی جلد دوم کے صفحہ
۲۲۷ میں "حضرت مولانا الحاج حافظ حکیم سید فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے سلسلہ میں
تحریر فرمایا ہے کہ آپ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ زیادہ مدت
کانپور میں قیام فرمایا، وہاں مطب کا شغل تھا۔ حدیث کے بہت بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ سنن ابن ماجہ
کا حاشیہ لکھا جو خوب مشہور و معروف ہے اور کئی بار چھپ چکا ہے۔ اس میں آپ نے علامہ سیوطی اور
حضرت شیخ عبد الغنی مجددی دہلوی کی شروح ابن ماجہ کو مزید اضافوں کے ساتھ جمع فرما دیا ہے۔ سنن
ابی داؤد کا حاشیہ درس محمود کے نام سے نہایت تحقیق کے ساتھ لکھا۔ ابو داؤد کے ساتھ بھی
بظاہر درس کا شغل نہیں رہا۔ مطب کی مصروفیات اور وہ بھی کانپور جیسے بڑے شہر میں۔ ان حالات میں
اس قدر عظیم الشان علمی حدیثی تصنیفی خدمات کر جانا مذکور الصدر شیخین اور معلمین کی برکات و کرامات میں
سے ہے۔ جس طرح ہمارے معظم و محترم مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری تلمیذ خاص حضرت نانوتوی نے بھی
باوجود غیر معمولی مصروفیت مطب اور غیر علمی درسی مشغلہ کے علم کلام و عقائد کے نہایت اہم و دقیق
مسائل پر اور رد شیعہ وغیرہ میں بڑی تحقیق سے فصیح و بلیغ عربی، فارسی زبان میں کتابیں تالیف
فرمائی تھیں (جو شائع ہونے کے بعد نادر ہو چکی ہیں) اس دور انحطاط میں اسی قسم کے نمونے اس کے
سوا اور کیا کہا جائے کہ ان حضرات کے اعلیٰ روحانی و باطنی کمالات کے اظہار کے عین کرشمے تھے" جناب
عبد الرشید نعمانی نے سنن ابن ماجہ سے متعلق بڑی تقطیع پر جو رسالہ عربی زبان میں تحریر فرمایا ہے اور
جسے نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی نے شائع کیا ہے اس کے صفحہ ۵۲ پر
حضرت فخر العلماء کے علمی کارناموں کا تذکرہ ہے جس کا اردو ترجمہ حضرت مولانا فاروق احمد انبیٹھوی کے دو
صاحبزادے حضرت مولانا محمد احمد نے جن کی تبلیغی خدمات سے تمام اہل پاکستان واقف ہیں اور جو جامعہ
اسلامیہ بھاولپور کے ایک معزز استاد ہیں کیا ہے۔ یہ ترجمہ ذیل میں پیش خدمت ہے شارحین ابن ماجہ
میں سے محدث فخر الحسن گنگوہی ہیں۔ ابن ماجہ پر ایک طویل اور نفیس حاشیہ لکھا ہے جس کو انجاح الحاجۃ
مصنفہ شیخ عبد الغنی دہلوی اور مصباح الزجاجۃ مصنفہ سیوطی سے جمع کیا ہے۔ اور پھر اس
میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ کیا ہے اور یہ حاشیہ کتاب ابن ماجہ کے ساتھ چھپ چکا ہے اور اس
حاشیہ کی عظمت و افادیت کا اندازہ شیخ خلیل الحسن (حضرت فخر العلماء کے صاحبزادے) کے ان الفاظ سے
ہو سکتا ہے جو انہوں نے ابو داؤد کے مقدمہ میں ذکر کئے ہیں۔ یہ حاشیہ کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ اور
یکے بعد دیگرے لوگ اس سے سیراب ہو رہے ہیں۔ اور علمائے کاملین نے استفادہ اور اس کی مقبولیت کے
پیش نظر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ شیخ فخر الحسن حضرت شیخ عارف باللہ علامہ محمد قاسم نانوتوی اور
محدث نیکو کار گنگوہی کے تلامذہ میں سے ہیں ان کا ایک بہترین حاشیہ سنن ابی داؤد پر بھی ہے
جس کا نام تعلیق المحمود ہے اور یہ دونوں حاشیے ہندوستان میں طبع ہو چکے ہیں اور ان دونوں حاشیوں
کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علوم و فنون حدیث میں (حضرت فخر العلماء کو) بہت اچھا مقام حاصل
تھا لیکن مجھے ان کی سوانح اور تاریخ وفات کے متعلق واقفیت حاصل نہیں ہو سکی۔" جناب عبد الرشید
نعمانی کی عربی عبارت کے ترجمہ کے بعد یہ عبارت تحریر ہے ترجمہ احقر الانام محمد الاحمد الانصاری
الراجی الی رحمۃ ربہ الباری۔ الاستاذ فی الحدیث بالجامعہ

سنن ابن ماجہ

جناب عبدالرشید نعمانی نے امام ابن ماجہ اور علم حدیث میں جو کتاب تصنیف فرمائی ہے اس میں انہوں نے بتایا ہے، کہ صحاح ستہ کی کتابوں میں سنن ابن ماجہ کا نمبر چھٹا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب دو حیثیتوں کے اعتبار سے تمام صحاح ستہ میں ممتاز ہے ایک حسن ترتیب یعنی جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ احادیث کو ابواب وار بغیر کسی تکرار کے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے اور دوسری کتابوں میں بیان نہیں کیا گیا اور یہی اس کی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر ان کے شیخ حافظ ابوزرعہ رازی کی زبان سے یہ بے ساختہ الفاظ نکل گئے تھے۔ "اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور مصنفات بیکار اور معطل ہو کر رہ جائیں گی" دوسری نمایاں خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ یہ بہت سی ان حدیثوں پر مشتمل ہے کہ جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں (یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی) یکسر خالی ہیں اور اسی بنا پر اس کی احادیث اور کتابوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ وہ عام طور پر ایسی حدیثیں بیان کیا کرتے تھے جو اوروں کو معلوم نہیں تھیں۔ علامہ ابوالحسن سندھی کی رائے ہے امام ابن ماجہ کا یہ طرز عمل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اتباع پر مبنی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں بہت سی زائد حدیثوں کا پایا جانا ہی اس کا وہ امتیاز ہے کہ جس کو دیکھ کر بہت سے حفاظ وقت نے صحاح کی تعداد پانچ سے بڑھا کر چھ کر دی۔ جناب عبدالرشید نعمانی کے بیان کے مطابق "تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے سنن ابن ماجہ کو کتب ستہ کے مقابلے میں اس کو جگہ دی وہ حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی المتوفی سنہ ۵۰۷ھ ہیں بعد کو تمام مصنفین اطراف رجال نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ "پھر مصنفین اطراف و رجال نے ان ہی کی متابعت کی" ارباب رجال میں سب سے پہلے حافظ عبدالغنی مقدسی المتوفی سنہ ۶۰۰ھ نے الکمال فی اسماء الرجال میں ان چھ کتابوں کے رجال کو یکجا مدون کیا ہے۔ اس کے بعد حدیث کے علماء میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ چھٹی کتاب صحاح میں ابن ماجہ کو تسلیم کیا جائے یا امام مالک کی کتاب موطا کو، حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی مالکی المتوفی سنہ ۵۲۵ھ نے صحاح کی چھٹی کتاب موطا امام مالک کو بنایا ہے اور محدث مبارک بن محمد المعروف بابن الاثیر جزری المتوفی سنہ ۶۰۶ھ نے محدث رزین کی رائے سے اتفاق کیا اور علامہ محدث عبدالغنی نابلسی حنفی سنہ ۱۱۴۳ھ اپنی مشہور کتاب ذخائر المواریث کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ،

"چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے۔ اہل مشرق کے نزدیک ابو عبداللہ محمد بن ماجہ کی کتاب السنن ہے۔ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک بن انس اصبحی کی کتاب موطا۔ لیکن محدث ابوالحسن سندھی لکھتے ہیں کہ" عام متاخرین اس طرف ہیں کہ یہ (سنن ابن ماجہ) صحاح ستہ کی چھٹی کتاب ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ" ان علماء نے اس کو پر اس لئے مقدم رکھا کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی روایتیں زائد ہیں برخلاف موطا کے کہ اس میں یہ بات نہیں ہے ورنہ صحت و قوت روایات کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ مشہور مورخ ابن خلکان نے بھی سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ کی چھٹی کتاب تسلیم کیا ہے۔

جناب عبدالرشید نعمانی نے لکھا ہے کہ "ابن ماجہ نے اپنی کتاب کی ترتیب و تدوین اور احادیث کے انتخاب میں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور متعدد جگہ غریب احادیث کی تفصیل دی ہے۔ مختلف بلاد کی جو مخصوص روایات ہیں ان پر نشاندہی کی ہے۔ غرض امام نے لاکھوں احادیث کے ذخیرہ سے چار ہزار روایات کا انتخاب کر کے ان کو مختلف ابواب کے تحت پوری مناسبت کے ساتھ درج کیا ہے۔ تاہم چونکہ سنن ابن ماجہ میں کتب ستہ کی

نسبت ضعیف حدیثیں زیادہ ہیں اس لئے اس کا درجہ صحاح ستہ میں سب سے فروتر ہے لیکن واضح رہے کہ یہ ترجیح بحیثیت مجموعی ہے۔ یعنی صحاح ستہ کی بقیہ کتابوں کو مجموعی حیثیت سے صحت کے لحاظ سے اس پر ترجیح حاصل ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "سنن ابن ماجہ میں بتیس (۳۲) کتابیں۔ پندرہ سو ابواب اور چار ہزار حدیثیں ہیں۔ جو تھوڑی سی روایات کے علاوہ سب کی سب عمدہ ہیں۔ لیکن بقول مولانا عبد الرشید نعمانی سنن ماجہ پر جتنا کام ہوا ہے وہ صحاح ستہ کی تیسری کتاب سنن نسائی پر بھی نہیں ہوا۔" آپ نے جو فہرست دی ہے اس کے مطابق سنن ابن ماجہ پر ۹ مختلف محدثوں نے کام کیا ہے۔ لیکن اس میں حضرت فخر العلماء کی شرح کے بارے میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ حاشیہ بر سنن ابن ماجہ مولانا فخر الحسن گنگوہی نہایت مشہور اور مقبول حاشیہ ہے۔ جو بارہا طبع ہو چکا ہے۔ اس حاشیہ میں علامہ سیوطی اور مولانا عبد الغنی دونوں کی شرحوں کو مع مزید اضافہ کے جمع کر دیا ہے۔ یہ کام علامہ نعمانی کی بیان کی ہوئی دیگر آٹھ کتابوں میں نہیں ہے۔ علامہ نعمانی کے بقول علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ کے حاشیہ کا نام مصباح الزجاجہ شرح سنن ابن ماجہ ہے جو بقول ان کے "یہ بھی ایک مختصر سا حاشیہ ہے۔ شیخ علی بن سلیمان نے اس کا بھی اختصار کیا ہے جس کا نام نور مصباح الزجاجہ ہے۔ یہ اختصار مصر میں طبع ہو چکا ہے۔" علامہ نعمانی نے شیخ عبد الغنی بن ابی سعید مجددی دہلوی حنفی المتوفی سنہ ۱۲۹۵ھ کی شرح کا نام انجاح الحاجہ بہ شرح سنن ابن ماجہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ بھی ایک مختصر مگر جامع اور عمدہ حاشیہ ہے" حقیقت یہ ہے کہ فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی نے سنن ابن ماجہ کے حاشیہ میں اس مشہور کتاب کے بہترین حواشی کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اور نہ صرف یہ اہم خدمت انجام دی ہے بلکہ اس کے ساتھ اپنی جانب سے نہایت مفید اور عالمانہ اضافے بھی فرمائے ہیں اس لئے آج تک آپ کے اس علمی کارنامہ کی مقبولیت قائم ہے اور اس امر کے باوجود کہ آپ کی علمی شخصیت پر اب تک ایک گہرا اور دبیز پردہ پڑا ہے۔ آپ کی یہ تصنیف اپنی خوبیوں کی وجہ سے علمی حلقوں میں برابر قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ سنن ابن ماجہ کے متعدد نسخے شائع ہو چکے ہیں جن میں مطبع مجیدی کا مطبوعہ نسخہ خاص شہرت کا حامل ہے لیکن حضرت فخر العلماء نے سنن ابن ماجہ پر پہلے پہل دلی میں کام کیا اور اس کا ذکر حضرت قاسم العلوم کے مطبوعہ خطوط میں بھی موجود ہے حضرت فخر العلماء کی اس ضمن میں کوششوں کا تذکرہ سنن ابن ماجہ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی کے آخری حصہ پر بھی ملتا ہے۔ یہ تحریر حسب ذیل ہے "مشتاقان احادیث نبوی علیہ السلام کو مژدہ و بشارت اور طالبان آثار و اخبار خیر الانام کو نوید و نظارت ہو کہ ان دنوں میں بہ توفیق خالق لیل و نہار سنن ابن ماجہ کو جس کو جناب عالم فاضل محدث کامل مولانا مولوی فخر الحسن گنگوہی نے بہ اہتمام تمام محشی فرمایا اور جہاں ضرورت ہوئی تو اپنی طرف سے توضیح مطالب کو کرسی ظہور پر بٹھایا۔ مطالب کی تشریح ایسی ہے کہ الفاظ سے پہلے مضمون ذہن میں آجائے گا۔ غرض جو دیکھے گا۔ حظ وافر اٹھائے گا۔ اب پھر دوسری بار بہ تصحیح کامل مولانا محمد طاہر مطبع فاروقی دہلی میں اول سے نصف تک بندہ کمترین مالک مطبع کے اہتمام سے اور نصف آخر مطبع مجتبائی دہلی میں بہ اجازت بندہ عاجز بہ اہتمام مولوی عبد الاحد نہایت کوشش اور سعی بلیغ سے چھپوائی گئی ہے" اس عبارت کے اختتام پر محمد مظہر مہتمم مطبع فاروقی کا نام دیا گیا ہے اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی اور اس کی اشاعت کا قصد نہ کرے۔ مگر اس حاشیہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ متواتر چھپ رہا ہے اور جیسا کہ مولانا عبد الرشید نعمانی نے اپنی متذکرہ کتاب "ابن ماجہ اور فن حدیث" میں ذکر کیا ہے یہ حاشیہ نہایت کارآمد ہے۔

سنن ابی داؤد

امام ابو داؤد سجستانی نے اپنی کتاب السنن کا انتخاب پانچ لاکھ احادیث کو سامنے رکھ کر کیا ہے چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں جن سے ان روایات کا

انتخاب کیا ہے جو اس کتاب میں درج ہیں۔" چونکہ امام ابوداؤد پر فقہی رنگ غالب تھا اس لئے "اس کتاب میں آپ کو دیگر کتب حدیث کی طرح زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں نہیں ملیں گی اور گو اس بنا پر احادیث کے بہت سے ابواب سے یہ کتاب خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گا۔ چنانچہ امام حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی المتوفی ۷۰۸ھ صحاح ستہ کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "احادیث فقہیہ کے امور میں ابوداؤد کو جو بات حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحاح ستہ کو نہیں" خود امام ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے کتاب السنن میں صرف احکام ہی کو تصنیف کیا ہے۔ زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کو تصنیف نہیں کیا۔" امام غزالی نے اسی بنا پر تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لئے کافی ہے۔ اور محدث ذکریا ساجی کے الفاظ یہ ہیں "اصل اسلام کتاب اللہ ہے اور فرمان اسلام سنن ابی داؤد" حافظ ابو محمد عبداللہ نے لکھا ہے کہ وہ چار آئمہ کہ جنہوں نے صحیح حدیث کی تشریح کی اور ثابت کو سقیم سے اور خطا کو صواب سے جدا کیا یہ چار ہیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، اور نسائی۔ جناب عبدالرشید نعمانی نے لکھا ہے کہ "امام ابوداؤد نے کتاب السنن کی تکمیل اپنے عہد شباب ہی میں کر لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ان کے شیخ امام احمد ابن حنبل زندہ تھے۔ امام ابوداؤد نے جب یہ کتاب امام ممدوح کی خدمت میں لے جا کر پیش کی تو امام ممدوح نے اسے پسند فرمایا اور اس کی تحسین کی تصنیف ہونے کے ساتھ ساتھ ہی حق تعالٰی نے اس کتاب کو جو قبول عام بخشا وہ صحاح ستہ میں کسی کتاب کو نصیب نہیں ہو سکا چنانچہ امام موصوف کے شاگرد حافظ محمد بن   درری المتوفی ۳۳۱ھ کا بیان ہے کہ "جب انہوں نے کتاب السنن تصنیف کی   اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو محدثین کے لئے ان کی کتاب قرآن کی طرح قابل اتباع بن گئی۔"

سنن ابوداؤد پر بہت کم کام ہوا

حالانکہ ابوداؤد صحاح ستہ کی چوتھی کتاب ہے۔ اور اس کا درجہ بخاری، مسلم اور نسائی کے بعد ہے اور اگرچہ اس کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ لیکن محدثین نے اس کتاب پر بہت کم کام کیا اور اس کی کوئی قابل ذکر شرح نہیں لکھی گئی۔ اور نہ اس کا کوئی حاشیہ اچھا دستیاب تھا۔ یہ اللہ تعالٰی کا احسان ہے کہ اس نے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک کے ایک دور افتادہ ضلع کے دور افتادہ قصبہ انبیہٹہ اور گنگوہ کے دو عالموں کو جو ایک ہی خاندان کے فرد تھے اس کتاب کی سب سے بہتر شرح اور سب سے بہتر حاشیہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ میری مراد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی سے ہے جو رشتہ میں سالے بہنوئی ہونے کے ساتھ ایک ہی درسگاہ یعنی دارالعلوم دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ ابوداؤد کی اچھی شرح نہ ہونے کی تصدیق خود حضرت سہارنپوری نے فرمائی ہے۔ تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۲۶۷ اور ۲۶۸ پر حدیث اور فقہ کے عنوان کے تحت "سنن ابی داؤد سے خاص اعتنا" کی ذیلی سرخی کے بعد مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ "کتب حدیث میں ابوداؤد شریف کو بالخصوص آپ مشکل سمجھتے۔ اور اس کے درس میں خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ یہ بات صاحب فن ہی سمجھ سکتا ہے کہ ابوداؤد میں دیگر کتب حدیث کی بہ نسبت کیا اشکال بڑھا ہوا ہے عوام کی فہم کو اس سے تعلق نہیں۔ مولانا یحییٰ صاحب بھی اس میں حضرت کے ہم خیال تھے اور اس لئے جب سے آپ مدرسہ میں (مظاہر العلوم) تشریف لائے۔ ابوداؤد کا سبق آپ کے پاس یا مولوی یحییٰ صاحب کے پاس رہا اور آپ نے تیسرے کے پاس اس کا جانا گوارہ نہیں فرمایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد کی بعض عبارتیں ایسی مغلق ہیں کہ مہارت فن کے بعد بھی ان کا حل مشکل ہے۔ نیز صاحب ابی داؤد نے ابواب فقہ کے جمع کرنے کا خود بھی اہتمام کیا۔

اور گویا محدث و فقیہ دونوں کا منصب پورا فرمایا ہے۔ اسی لئے اس کی شان اور بڑھ گئی۔ پھر اس کی کوئی شرح بھی ایسی شافی و کافی نہیں جو اس کے حل مطالب میں مدد دے سکے۔ غایت المقصود اور عون المعبود اگرچہ اسی کی شرح کہلاتی ہیں مگر ان کے مؤلف متاخرین اہل حدیث ہیں جو مقلدین کو ناطی ٹھہراتے ہیں"" اکابرین دیوبند میں سب سے پہلی ہستی حضرت فخر العلماء کی ہے جنہوں نے اس کا نہایت عمدہ حاشیہ تعلیق المحمود کے نام سے لکھا ہے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ فیض الحسن نے جو آپ کے حقیقی بھتیجے حضرت مولانا خلیل سہارنپوری کے خلیفہ بھی تھے اصول اشاشی مع عمدۃ الحواشی کے صفحہ دو پر ان دقتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا سامنا حضرت فخر العلماء کو تعلیق المحمود کی تحریر میں کرنا پڑا۔ حضرت مولانا فیض الحسن فرماتے ہیں کہ "اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں کہ یہ کتاب صحاح ستہ میں جس قدر خدمت کی محتاج تھی اسی قدر بے توجہی کی حالت میں مبتلا تھی (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے بھی یہی بات فرمائی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) کسی نے اس کے اغلاط رفع کرنے کی کوشش نہیں کی کثرت سے نسخہ غلط در غلط چھپتا اور بکتا رہا کیونکہ عدم سے وجود بہرا افضل ہے ترتیب متن ایسی مشکل ہوگئی تھی کہ جس کی حد نہیں بہت سے ابواب موخر بہت سے مقدم بہت سے ساقط ہو گئے تھے۔ سطریں کی سطریں غائب تھیں۔ موجودہ نسخوں کے حواشی بے حد عنرکا ہ تھے۔ جن سے مطلب حل نہیں ہوتا تھا۔ نظر بر آں حضرت والد ماجد مولانا حافظ حکیم مولوی فخر الحسن صاحب مرحوم گنگوہی نے اس کی درستی کی طرف توجہ اور بہت سے قلمی صحیح نسخوں سے کئی کئی دفعہ مقابلہ فرمایا۔ اس طرح متن درست فرما کر اس کے حواشی لکھنے کا ارادہ فرمایا۔ جامع اور مبسوط حاشیہ تصنیف فرمایا جس کا نام تعلیق المحمود رکھا۔ خاکسار نے اس کی تصحیح اور اہتمام طبع میں دو تین سال تک عرق ریزی کی اور بہ کمال صحت و صفائی $\frac{20}{26}$ تقطیع پر مطبع نامی کانپور میں چھپوائی" حضرت مولانا فیض الحسن صاحب گنگوہی کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت فخر العلماء نے تعلیق المحمود کی تصنیف اپنی زندگی کے آواخر میں کی۔ حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی کی زندگی میں سنن ابوداؤد کی اشاعت کا اہتمام مطبع مجیدی کانپور نے بھی کیا۔ سنن ابوداؤد مطبوعہ مجیدی پریس کانپور کے آغاز میں حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی کا ابتدائیہ بھی شامل ہے جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ابوداؤد کی شرحوں میں علامہ الحاج الحافظ الحکیم مولانا فخر الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا حاشیہ اپنی شرح و بسط اور معانی و مفہوم کی وضاحت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مولانا شیر کوٹی نے بھی انوار قاسمی کے صفحہ ۵۲۶ میں بھی اس کا ذکر کر رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت فخر العلماء" کی تصانیف میں حاشیہ ابوداؤد شریف بھی ہے جس کا حوالہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۱۹۲ پر دیا ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب بذل المجہود شرح ابوداؤد کے لکھتے وقت جو کتابیں زیر مطالعہ رکھتے تھے ان میں سے چھ ابوداؤد کے نسخے تھے جن میں مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ کردہ نسخہ ابوداؤد مطبوعہ اصح المطابع بھی تھا۔ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی نے جو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ کے شاگرد اور بذل کی تصنیف کے وقت سہارنپور میں موجود تھے فرماتے تھے کہ حضرت سہارنپوری حضرت فخر العلماء کے حاشیہ کی بہت تعریف فرماتے تھے اور کہا کرتے کہ اس حاشیہ نے ان کی بہت سی مشکلات کو رفع کر دیا۔ ابوداؤد کا یہ حاشیہ بھی کئی بار اور بار بار شائع ہوا جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ راقم نے اس کے کئی ایڈیشن دیکھے ہیں جو مطبع مجیدی کانپور سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے اور مطبع نامی اور اصح المطابع کے نسخوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے بھی یہ لکھا ہے کہ تالیف شرح حدیث کیلئے بڑی ہمت درکار ہے۔ وہ اس سلسلہ میں کے تحت تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۲۶۸ میں ارقام فرمایا ہے کہ "تالیف جتنا دشوار کام ہے اس کو کوئی مولفین کے دلوں سے پوچھے بالخصوص شرح حدیث کی تالیف کہ لفظ لفظ پر ادب و التجا اور ضعف بشریت ، ہیچ مدانی کی نذر پیش کرنے کی ضرورت ہے

اور وہ آزادی جس کو طبیعت کا ملنا بولتے ہیں کسی وقت بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔" ایسے دشوار گذار مراحل سے گزر کر حضرت فخر العلماء نے صحاح ستہ کی دو کتابوں کے معرکۃ الآرا حاشیئے لکھے۔ جو یقیناً مسلم حدیث کی مہتم بالشان خدمت ہے اور جس کا اجرا انہیں ابدالآباد تک ملتا رہے گا اور دنیا میں تو انہیں نیک نامی حاصل ہی ہو کر رہی کہ محدث گنگوہی کہلائے اور دنیا کے دینی اور علمی حلقوں میں جس کا اعتراف ان کی حقیقی بھتیجی بیگم پیرزادہ ضیاء الحق نے کیا ہے۔ بیگم پیرزادہ بیان کرتی ہیں کہ سفر حج کے دوران جب وہ سعودی عرب گئیں اور ارباب علم کو معلوم ہوا کہ وہ حضرت فخر العلماء کی بھتیجی ہیں تو وہاں ان کا بے حد احترام کیا گیا۔

شرح تلخیص مفتاح

حضرت فخر العلماء کی تیسری اہم علمی تصنیف شرح تلخیص مفتاح ہے جس کا ذکر حضرت مولانا عبدالحئی نے نزہۃ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۳۵ میں کیا ہے۔ مولانا عبدالحئی نے حضرت فخر العلماء کی تینوں علمی کاوشوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے "آپ نے سنن ابوداؤد پر نہایت تفصیلی حاشیہ لکھا ہے جس کا نام تعلیق المحمود ہے۔ آپ نے تلخیص المفتاح پر بھی مبسوط حاشیہ لکھا اور ابن ماجہ پر بھی اختصار کے ساتھ حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔" شرح تلخیص مفتاح عربی مدارس میں تواتر کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔ درحقیقت یہ کتاب عربی ادب کی ایک اہم کتاب مفتاح العلوم کی تلخیص کی شرح ہے۔ اور مولوی عبدالرحیم ناظم کتبہ شرقیہ دارالعلوم اسلامیہ پشاور کی فہرست کتب بابت مکتبہ شرقیہ دارالعلوم اسلامیہ پشاور کی فہرست کتب" کے مطابق مفتاح العلوم (عربی) فنون عربیت کے شعبہ ہائے ہندگانہ متداولہ پر مشتمل ہے اور اس میں ہر ایک کے فن کے اصول نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اس کا ہر ایک باب ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا پورا نام ابو یعقوب یوسف بن ابی بکر المعروف بہ سراج الدین المختار زمی اسکاکی ہے مولوی عبدالرحیم نے لکھا ہے کہ علامہ سکاکی علم بلاغت میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور عربی فنون میں انہیں امام تسلیم کیا گیا ہے۔ علامہ زاہدی کو بھی ان سے نسبت شاگردی ہے۔ کہتے ہیں کہ علم تسخیر اور دعوت کو ایک ملکہ بھی وہ یہ طولیٰ رکھتے تھے۔ سلطان چغتائی خان ابن چنگیز خان کو جب ان کے فضائل کا حال معلوم ہوا، تو انہیں بلاکر اپنا مصاحب مقرر کیا۔ آخر کار حبش عمید جو بادشاہ مذکور کا وزیر اعظم ہے۔ سلطان کی قربت اور احترام کی وجہ سے ان سے حسد کرنے لگا اور اس کی حاسدانہ کارروائیوں کے باعث امام سکاکی کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اور تین سال قید میں رہ کر انہوں نے سنہ ۶۲۶ھ مطابق ۱۲۲۹ء قید خانہ ہی میں انتقال فرمایا اور دنیائے اسلام ایک عظیم مفکر اور عالم سے محروم ہو گئی۔" تلخیص مفتاح اس شہرہ آفاق ادیب کی عظیم کتاب مفتاح العلوم سے اخذ کی گئی ہے اور مولانا عبدالرحیم کے الفاظ میں "تلخیص المفتاح کا ماخذ اس معرکۃ الآرا تصنیف کا فن معانی و بیان ہے۔ اور اس کے تیسرے باب کی تلخیص ہے۔ تلخیص المفتاح کے مصنف کا پورا نام جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی الشافعی المعروف بہ خطیب دمشق ہے۔ آپ کا سنہ ۷۳۹ھ میں وصال ہوا۔ لیکن یہ تلخیص بھی اپنی ادق زبان کی بناء پر شرح کی محتاج تھی۔ چنانچہ حضرت فخر العلماء نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ اور اس کے ادق مضامین کو نہایت آسان الفاظ میں بیان فرمایا اور اس میں جا بجا اردو اور فارسی کے اشعار کے ذریعہ معانی اور مطالب بیان کئے گئے۔ یہ شرح تلخیص مفتاح حضرت والا کی زندگی ہی میں طبع ہو گئی تھی مگر یہ شرح اس قدر مقبول ہوئی کہ مطبع مجتبائی دہلی کو اسے کئی بار شائع کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ میری نظر سے شرح تلخیص المفتاح کا وہ نسخہ بھی گذرا ہے جو مطبع رحیمیہ دیوبند نے شائع کیا تھا۔ کوشش بسیار کے بعد راقم الحروف کو شرح تلخیص مفتاح کا وہ نسخہ ہاتھ لگا جو مطبع مجتبائی دہلی سے چوتھی بار ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۲۶ء طبع ہوا تھا۔ اس نسخہ کے آخری صفحہ پر جو عبارت

درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شرح تلخیص مفتاح دوسری بار ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں طبع ہوئی تھی اور اس کے آخری صفحے پر مولانا غلام رسول عادل گڑھی نے تحریر کیا تھا کہ "ہم خدائے بزرگ و برتر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے شرح تلخیص مفتاح کا اہم کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور الفاظ کو معنی کا زیور پہنایا گیا۔ اور یہ کتاب جو معانی اور مطالب کے لحاظ سے قدرت کا بہت بڑا معجزہ ہے قوم اور ملت کی رہنمائی کرتی رہے گی اور صراط مستقیم دکھاتی رہے گی۔" اس کے بعد آخر میں یہ تحریر ہے کہ "الحمد للہ علی احسانہ کہ کتاب ہذا بار چہارم بہ تصحیح تمام تنقیح بالا کلام بماہ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۲۶ء باہتمام احقر الانام محمد عبد الاحد عفی عنہ در مطبع مجتبائی واقع دہلی طبع گردید" لیکن افسوس ہے کہ مطبع مجتبائی اور مطبع رحیمیہ کے نسخوں میں کسی ایک کے سرورق پر یہ تحریر نہیں کہ حضرت فخر العلماء نے تلخیص المفتاح کی شرح فرمائی ہے۔ البتہ حاشیہ میں کہیں لفظ فخر سے، کہیں فخر الحسن کے نام سے اور کہیں صرف ف سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ اہم معقول تخلیقی کام حضرت فخر العلماء کا ہے۔
مولانا غلام رسول عادل گڑھی کی متذکرہ بالا تحریر میں بھی حضرت فخر العلماء کا نام نہیں ہے۔ انہوں نے البتہ یہ ضرور تحریر کیا ہے کہ یہ گراں قدر نسخہ مع مختصر شرح کے ساتھ تیرہویں صدی ہجری میں شائع ہو رہا ہے اور اسکی طباعت میں یہ پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہ اغلاط سے پاک ہو۔ انہوں نے شرح تلخیص مفتاح کی اشاعت کی تاریخ بھی نکالی جو تلخیص صحیح ہے۔ راقم الحروف نے جب پہلے شرح تلخیص مفتاح مطبوعہ مطبع رحیمیہ کا دار العلوم کراچی کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی اس لئے کہ سرورق پر حضرت فخر العلماء کا نام نہیں تھا۔ اسے سب سے بڑی حیرت اس بات پر تھی کہ حضرت مولانا عبد الحئی نے نزہۃ الخواطر میں اس بات کا کیسے تذکرہ کر دیا کہ حضرت فخر العلماء نے شرح تلخیص المفتاح کا کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن اس وقت راقم الحروف کے پیر بھائی مولانا عاشق الٰہی بلند شہری نے مولانا عبد الحئی کی تحریر کی تصدیق کی اور کہا کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا فخر الحسن نے اس شرح میں ایک جگہ یہ شعر بھی لکھا ہے۔ ۹

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

اور تلاش کرنے پر یہ شعر شرح تلخیص مفتاح کے صفحہ چار پر مل گیا اس کے بعد تو جابجا فخر الحسن، فخر اور صرف ف نظر آنے لگا اور پتہ چلا یہ خیال کہ سرورق پر حضرت فخر العلماء کا نام نہیں ہے ناشرین کی قصداً نہیں بلکہ سہواً ہے۔ بہر حال یہ کتاب جو عربی ادب کی مشکل ترین کتابوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے حضرت فخر العلماء کی کوششوں سے عام طالب علم کے لئے نہایت آسان ہو گئی ہے۔
ان تین علمی کاوشوں کے علاوہ جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے مولانا شفیق احمد انبیٹھوی نے جو حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی کے صاحبزادے اور مولانا اعجاز الحق قدوسی کے استاد تھے راقم الحروف کو یہ بتایا تھا کہ حضرت فخر العلماء نے کنز الدقائق کا ایک نسخہ بھی ایسا نہیں ملا جس سے مولانا شفیق احمد انبیٹھوی کی بات کی تصدیق ہو سکے۔ راقم نے کنز کے بہت سے حواشی دیکھے مگر انہیں حضرت فخر العلماء کا حاشیہ نظر نہیں آیا۔

حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت

مولانا حکیم محمد یوسف صاحب گنگوہی حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور یہ بات ان کے صاحبزادے حکیم محمد یعقوب قدوسی نے راقم کو بھی بتائی۔ جناب اسمٰعیل انصاری نے بھی لکھا ہے کہ "علمی حیثیت سے حضرت والا (حضرت فخر العلماء) کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اور اپنے زمانہ کے متبحر اور فاضل اہل عالم کہلاتے تھے۔ لیکن ان کی ذہانت، استعداد اور قابلیت کے بارے میں جو صحیح رائے ان کے اساتذہ کی ہو سکتی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا

محمد یعقوب صاحب نے ان کے بارے میں سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی میں تحریر فرمایا کہ آپ عمدہ استعداد کے مالک ہیں۔ اسی قسم کی بات حضرت قاسم العلوم کے کانوکیشن ایڈریس میں کہی گئی ہے۔ جس کا تذکرہ اپنے مقام پر ہو چکا ہے۔ مجموعۂ مکتوبات قاسمی بنام قاسم العلوم کے دس خطوں میں تین خط حضرت فخر العلماء کے نام ہیں۔ جن سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کی نگاہ میں حضرت فخر العلماء کا کیا مرتبہ تھا بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان ربط خاص کا سبب حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت ہے۔ حضرت فخر العلماء کے نام حضرت قاسم العلوم کے پہلے خط کا آغاز جو اس مجموعہ کا نامہ دہم ہے۔ ان الفاظ سے ہوا۔ "بعد سنت ہائے بے پایاں احباب محمد قاسم عفی اللہ عنہ بخدمت سراپا مکرمت جامع کمالات عزیزم مولوی فخر الحسن صاحب دام کمالاتہ" اس کے بعد اسی خط میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "برادر من اس تمام دانشمندی کے باوجود کہ خدائے تعالیٰ نے (بقول جناب انوار الحسن شیر کوٹی، حضرت مولانا قاسم صاحب کے نزدیک مولانا فخر الحسن دانشمند تھے اس لئے یہاں ان کے لئے دانشمندی کا لفظ استعمال فرمایا) آپ کو بخشی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ اس ناچیز کو تکلیف دیتے ہیں۔ خیر آپ کی خاطرداری اگر ملحوظ نہ ہوتا تو ظاہری سستی ان جیسے کاموں کے لئے خود مانع ہے۔ مجبوراً جو کچھ میری ناقص سمجھ میں آتا ہے یہ بندہ تحریر کرتا ہے" حضرت قاسم العلوم کے مکتوب ہشتم کا آغاز ان لفظوں سے ہوتا ہے۔ جامع علوم مولوی فخر الحسن صاحب دام کمالاتہ۔ اس خط کے آغاز میں آپ حضرت فخر العلماء کو لکھتے ہیں کہ "آج کے احباب کے خطوط کے جوابوں کے لکھنے کی حرکت پیدا ہوئی تو آپ کے خط کا جواب لکھنا بھی یاد آیا۔ خط تلاش کرنے میں لگ گیا، لیکن نہ ملا، لیکن آپ کا دوسرا پرانا خط علامہ طوسی کا حضرت علی کی امامت کے بارے میں اور امام معصوم کی ضرورت کے دلائل پر مشتمل خیالات کے متعلق نظر پڑ گیا۔ چونکہ اس کا آخری مضمون بھی وہی ہے کہ جو آخری خط میں تھا اور اس طرف چونکہ یہ خط بھاگ دوڑ میں وطن پہنچا تھا تو اس کے جواب کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے میری رائے یہ ہوئی کہ اس کے تمام مضامین کا جواب لکھ کر آپ کے پاس بھیجدوں۔ شاید آپ کے دل سے میرے لئے دعا نکل جائے۔ اے عزیز اس عاجز کا ہاتھ پکڑنا چاہئے کہ گناہوں کے بوجھ نے خدا جانے مجھے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اسی خط کے اس حصہ کی نقل جو کہ فارسی میں ہے یہ ہے "اے عزیز دست ایں افتادہ باید گرفت۔ بار گناہم ندانم کجا برد" اسی خط کے آخری جملوں میں شاگرد رشید کے لئے جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں، وہ بلاشبہ حضرت فخر العلماء کی استعداد، ذہانت اور قابلیت کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ آپ فرماتے ہیں، کہ "چونکہ اس قدر لکھنا ان عزیز کیلئے کافی ہے اس لئے اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ قلم کو روک لوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان عزیز خود عمدہ استعداد کے مالک ہیں۔ اپنے حسن ظن سے اس نارسا کو بیکار میں پکڑ لیتے ہیں۔ خیر اگر پسند آئے تو اللہ کی طرف سے سمجھئے کیونکہ اس کے ہاتھ میں فضل ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اگر میں نے غلط کہا ہو تو مجھے آگاہ فرمائیں کہ ناکارہ نے اس طرح بے سوچے سمجھے قلم برداشتہ لکھ دیا ہے۔ (جناب انوار الحسن شیر کوٹی نے لفظ قلم برداشتہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اندازہ لگائیے کہ یہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان جیسے مضامین عالیہ کا فی البدیہہ بلا فکری تامل لکھنے کا اظہار کیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو علم لدنی سے بہرہ وافر ملا ہوا تھا) اپنی مجلس میں بیٹھنے والوں کو میری طرف سے سلام پہنچا دیں۔ اور مجھے اپنے مشتاقین ملاقات میں سمجھیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہاری اور مولوی احمد حسن و مولوی محمود حسن کی طرف سے میرے دل میں کیا رکھ دیا ہے کہ اکثر سو گنا آپ لوگوں کے کام کی طرف کھینچتے ہیں۔ باقی دعائے خیر میں مجھے یاد رکھیں کہ نجات کا ذریعہ احباب کی دعا کے سوا اور کچھ نہیں۔ غالباً مولوی محمود حسن کے نکاح کی

تقریب میں دیوبند قدم رنجہ فرمائیں گے لیکن افسوس کہ علیگڑھ راہ سے ایک طرف واقع ہوا ہے"۔
قاسم العلوم کے یہ تینوں خط جن میں سے دو کے ان اقتباسات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت سے متعلق تھے لیکن یہ خطوط مجموعی حیثیت سے بھی حضرت فخر العلماء کی قابلیت کا ثبوت ہیں۔ اگر چہ کہ یہ خطوط حضرت فخر العلماء کے خطوط کے جواب میں حضرت قاسم العلوم نے تحریر فرمائے ہیں مگر ظاہر ہے کہ جب تک حضرت فخر العلماء کے خطوط میں اچھے قسم کے نکات نہ ہوں گے اس وقت تک ان کے اتنے طویل جواب کس طرح ممکن تھے۔ یہ سارے خطوط قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم کے نام سے ناشران قرآن لمیٹڈ نے ۳۸ اردو بازار لاہور سے شائع کر دیے ہیں لیکن یہاں ان کا اجمالی تذکرہ جناب انوار الحسن صاحب کے مقدمہ کے اس حصہ سے جس کا عنوان تفصیل مکتوبات ہے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ یہ حصہ کتاب کے صفحہ ۱۸ سے لیکر ۲۸ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے اور ذیل کا اقتباس صفحہ ۲۹ سے صفحہ ۳۲ کے درمیان سے نقل کیا جا رہا ہے مگر مکتوبات کی ترتیب پروفیسر ایوب قادری کی کتاب "محمد احسن نانوتوی" کے مطابق ہے۔

مکتوب ہشتم

مجموعہ قاسم العلوم کے چار نمبر شائع ہوئے تھے۔ پہلا نمبر ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو، دوسرا نمبر ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ کو، تیسرا نمبر ۱۵ جمادی الاول ۱۲۹۲ھ کو اور چوتھا نمبر ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ اس آخری مجموعہ میں تین مکتوب ہیں اور تینوں حضرت فخر العلماء کے نام ہیں۔ ان میں پہلا مکتوب جسے جناب ایوب قادری کی ترتیب کے مطابق مکتوب ہشتم کہا جاتا ہے "در تحقیق و اثبات شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام رضی اللہ عنہ مطابق قواعد سنیاں" ہے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی لکھتے ہیں کہ "یہ مکتوب مولانا فخر الحسن گنگوہی کے نام ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص تلامذہ میں تھے۔ اس خط میں حضرت والا نے سنیوں کے اصول کے موافق حضرت سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کو ثابت فرمایا ہے۔ یہ مکتوب حضرت والا کی اجتہادی شان کا ایک خاص نشان ہے جس میں نہایت محتاط طریقہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوزیشن واضح کی گئی ہے۔ اور حضرت شہید کربلا کی شہادت پر مجتہدانہ رنگ میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ یہ مکتوب مطبوعہ اٹھارہ صفحات تک چلا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت قاسم العلوم نے شہادت امام پر امام السلام کی حیثیت سے آخری اور قطعی بحث کی ہے جس کے بعد فقہی حیثیت سے اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور جس میں یزید کا کردار متعین ہو کر واضح صورت میں سامنے آجاتا ہے۔

مکتوب نہم

قاسم العلوم شائع کردہ منشی امتیاز علی میں اس خط کا نمبر نہم ہے۔ اور یہ رد جواب استدلالات، علامہ طوسی دوبارہ امامت و بیان معنی اختلاف امتی و حدیث مستخلف ہے۔ جناب انوار الحسن شیرکوٹی تحریر فرماتے ہیں کہ "اس مکتوب میں جو مولانا فخر الحسن گنگوہی کے نام ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "اختلاف فی رحمۃ" کی صحیح حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ علامہ طوسی جو اپنے زمانہ کے مشہور محقق اور فلسفی ہیں شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی امامت اور امام معصوم کی ضرورت پر جو دلائل پیش کئے ہیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے معتقدات خیالات اور استدلالات کی دھجیاں فضائے آسمان میں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ اور علامہ طوسی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل کو پڑھ کر ادنیٰ بصیرت رکھنے والا اہل علم بھی صاف سمجھ سکتا ہے کہ علامہ طوسی مولانا کے سامنے ایک طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مثلاً علامہ طوسی امام کی ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "امام کی ضرورت اس لئے ہے کہ رعایا میں غلطی کا احتمال ہے اگر امام میں بھی غلطی کا احتمال

ہو تو تسلسل لازم آتا ہے" یعنی دین کے سمجھنے میں رعایا سے غلطی کا امکان ہے۔ امام میں بھی اگر غلطی کا امکان ہوگا تو پھر اس کی اصلاح کے لئے اور کوئی امام درکار ہوگا اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہو جائے گا جو منطق کی رو سے غلط ہے لہٰذا امام کی اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ رعایا کی غلطی کو درست کر سکے۔ اور اسی وجہ سے اس کا غلطی سے معصوم ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس قاسم العلوم فرماتے ہیں کہ "اگر ہم قرآن کے لفظ پر غور کریں تو جان لیں گے کہ امام کی ضرورت صرف نیکی کے حکم کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے ہے ارشاد فرمایا ہے۔ "وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکین و قدرت عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے لوگوں کو روکیں" القصہ نماز قائم کرنے اور امر بالمعروف کی حقیقت کے بارے میں اگر ہم غور کریں تو کوئی بات ایسی نہیں نکلتی جو عصمت سے وابستہ ہو بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ امام کو قدرت کے وقت امر بالمعروف کے لئے تمام علوم کا حامل ہونا ضروری ہو۔ ہاں اس قدر ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ذرا پہلے معروف اور منکر سے واقفیت ہو خواہ وہ دوسرے علماء کی ہی زبانی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ یہ بات صاف ہے ورنہ دوسروں کی امامت خود بر طرف حضرت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت بھی قابل تامل بن جائے گی۔ کیونکہ علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بتدریج حضور کو حاصل ہوئے (جو ۲۳ سال تک اترتے رہے) اگر خدا کے کلام کا سمجھنا معصوم کے سوا دوسروں کو محال ہوتا تو پھر "اے لوگو۔ اے ایمان والو" اور اسی طرح "ان کے فرقے ہی سے کیوں نہ ایک ایسی جماعت سفر کرے کہ وہ دین میں سمجھ حاصل کرے۔" اور اسی طرح کی دوسری آیات تکلیف مالا یطاق کی قسم سے بن کر رہ جائیں گی۔ ورنہ امام کو کلام ربانی کافی ہے۔ آخر اسی کلام کی شان میں "ہر چیز کو بیان کرنے والا" "ایمان والوں کے لئے کلام اللہ ہدایت اور خوشخبری ہے" (اور متقین کے لئے ہدایت ہے) فرمایا ہے کہ جب امام کو کلام الٰہی کا سمجھنا دراک اور کلام اللہ ہر چیز کو بیان کرتا ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ امام معصوم ہو۔ ہاں کلام الٰہی اگر "ہر چیز کو بیان کرنے والا" نہ ہوتا تو پھر وحی کی ضرورت پڑتی۔ اس وقت اگر عصمت کی شرط لگاتے جو کہ ہمارے لئے وحی کے لئے ضروری نہیں تو پھر ہم ضروری کہتے ہاں اگر انبیاء کی طرح اماموں کے ہر قسم کے افعال کی پیروی ضروری ہوتی تو البتہ اسی وقت دلیل کے بموجب آئمہ کی عصمت ضروری ہوتی۔ رہی یہ بات کہ "تم پر میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت لازمی ہے"۔ جو فرمائی ہے تو مطلق تمام افعال کی پیروی اور اطاعت کو لازمی قرار نہیں دیا بلکہ ان مستقل سنتوں کی پیروی ضروری قرار دی ہے جو اصحاب اور علماء میں سے ہر آنے اور جانے والے کے پیش نظر انہوں نے کی ہے۔ کیونکہ خلفائے راشدین عام حکم کے ماتحت "تم اسی کی پیروی کرو، جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اور اس کے سوا اور مددگاروں کی پیروی مت کرو" اور اسی طرح تمام حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہمارے اس دین کے معاملے میں جو کوئی ایسی نئی بات نکالے گا جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے اور صحابہ اس بات پر مامور ہیں کہ وہی پر عمل کریں اور ما سوا اس کے پیروی نہ کریں۔" حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے علامہ طوسی کے استدلال کی جو دھجیاں اڑائی ہیں وہ ہم نے پوری نقل نہیں کی ہیں، بلکہ اس کا ایک حصہ پیش کیا ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا عبارت کو نمونہ کے طور پر سمجھا جائے جس سے ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت مولانا کے عقلیہ اور نقلیہ اجتہادی دلائل کے سامنے غلط منزل کی طرف چل پڑنے والا بڑے سے بڑا محقق اور علامہ بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اور وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی اجتہادی قوتوں کو اس طرح استعمال فرماتے تھے کہ اہل علم حیران رہ جاتے تھے۔ اور کسی سے بھی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ امام کے بارے میں آگے چل کر حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "دین کی بنیاد قرآن کریم ہے۔ ہاں احکام نافذ کرتے وقت دین کی فہم ضروری ہے اور اس کے

لئے آمرکی خود فہمی ضروری نہیں جیسا کہ تمہیں معلوم ہوچکا ہے (حضرت فخر العلماء کی طرف اشارہ ہے) اور اگر طلوس کی مراد یہ ہے کہ امام اقامت دین کرے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ امام دین کا قائم کرنے والا اور شرع متین کا حامی ہوتا ہے کہ وہی مطلب نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہم معنی ہے لیکن اتنی بات کا علم ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ کجا یہ کہ فہم میں بھول چوک سے محفوظ رہ سکے۔" ان عبارتی ٹکڑوں پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کا انداز خاص اجتہادی ہے اور قرآن اور سنت پر ان کی گہری نظر ہے جو صرف ایک مجتہد ہی کی ہوسکتی ہے وہ کسی کا سہارا لیکر نہیں چلتے۔ حضرت قاسم العلوم کے تمام تحریری کارناموں میں ان کا یہی انداز ہے۔ خاص طور پر قاسم العلوم کے مکتوبات میں مجتہدانہ قوتیں پوری شان بصیرت کی غماز ہیں۔" یہ مکتوبات اپنے خاص شاگردوں اور مذہبی غور وفکر رکھنے والے افراد کے نام ہیں۔ اس لئے ان سے کھل کر بات کرنا ان مکتوبات کی اصل روح ہے اور جب ان پڑھے لکھے ذہین اور قابل اعتماد افراد سے تحریری طور پر مخاطب ہوتا ہے تو پھر اس کے ذہن و فکر کی تمام قوتیں بروئے کار آتی ہیں اور یہی قوتیں جن کو جناب انوار الحسن شیرکوٹی نے اجتہادی صلاحیتوں سے تعبیر کیا ہے ان مکتوبات میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مکتوب دہم

قاسم العلوم کے چوتھے نمبر کا یہ آخری مکتوب بھی جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے حضرت فخر العلماء کے نام ہے اور جناب ایوب قادری کے بقول (جس نے اپنے زمانہ کے امام کو نہ پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا ہے"۔ جناب انوار الحسن لکھتے ہیں کہ "اب چوتھے نمبر کا تیسرا مکتوب ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ مکتوب انہوں نے مولانا فخر الحسن گنگوہی کو ان کے خط کے جواب میں بھی لکھا ہے جنہوں نے حسب بالا حدیث کی تحقیق دریافت کی تھی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کا یہ مکتوب مطبوعہ صفحات پر سات مضمون پر پھیلا ہوا ہے جس میں مذکورہ حدیث کی تحقیقات کا رنگ غضب کا عالمانہ ہے۔ اور اس میں بھی وہی اجتہادی شان نظر آتی ہے۔

مولانا عبدالحیٔ کا بیان

مولانا عبدالحیٔ نے نزہۃ الخواطر کی جلد آٹھ کے صفحہ ۳۵۴ میں حضرت فخر العلماء کی شان میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کی علمیت، قابلیت، حضرت قاسم العلوم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حکیم محمود خان اعظم سے ان کی قربت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خانوادے کے اس عظیم رکن کی گواہی کو کس طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ" علمائے ہند میں شیخ الوقت علامہ فخر الحسن ابن عبدالرحمن حنفی گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک ممتاز شخصیت تھے جو اقران واماثل میں امتیازی شان رکھتے تھے اور علم وفضل میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ الرجل مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے رفقائے کار اور قریبی حلقہ کے افراد میں شامل تھے۔ آپ نے حدیث شیخ العلامہ رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی۔ گفتگو اور محاورۂ کلام میں بے مثال تھے۔ حق گوئی اور صاف گوئی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ دین سے غیر معمولی شغف تھا۔ دین سے متعلق جو درد ان کی ذات میں پنہاں تھا وہ انہیں جرأت وہمت دیتا تھا اور وہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے میں صرف کرتے۔ اور مناظرانہ انداز گفتگو ہی پسند فرماتے"۔ مولوی محمد ادریس نگرامی نے تذکرہ علمائے حال مطبوعہ سنہ ۱۸۹۷ء کے صفحہ ۴۶ میں ارقام فرمایا ہے کہ مولوی حکیم سید فخر الحسن گنگوہی، قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اُستاد کے نقش قدم

حضرت فخر العلماء کی ذہانت اور قابلیت کا ذکر اوپر بیان کیا جاچکا ہے مگر ان کی سب سے

بڑی خوبی جو اول سے آخر تک ان کے مزاج پر حاوی رہی وہ خوف خدا اور اتباع سنت کے بعد اپنے استاد مکرم کے افکار اور اعمال کی پیروی تھی اور یہی وہ بات تھی جس کا سب سے پہلے ادراک مولانا محمد یعقوب صاحب نے کیا تھا اور جس کا اوپر کئی بار تذکرہ ہو چکا ہے۔ یعنی وارفتگی حال میں حضرت فخر العلماء مولانا محمد قاسم نانوتوی کے قدم بہ قدم تھے۔ مولانا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی نے لکھا ہے کہ "مولانا فخر الحسن صاحب بہت بڑے مصنف اور مقرر تھے"۔ لیکن تحریر و تقریر کی خوبیاں معارف قاسمی کی اشاعت کے لئے تھیں۔ "حضرت قاسم العلوم بقول مولانا انوار الحسن شیرکوٹی "جھگڑوں سے خواہ وہ دین کے لئے ہوں اور خواہ دنیا کے لئے بیزار نظر آتے ہیں اور اسی سلسلہ میں انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے اس خط کا حوالہ دیا جو انہوں نے سرسید کے عقائد کے بارے میں پیر جی محمد عارف کو لکھا تھا اور خاص طور پر ان کے اس جملہ کو حوالہ دیا کہ "پیر جی صاحب یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں الجھتا اور الجھے بھی تو کیونکر الجھے۔ وہ کونسی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار رہو۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ شاغل چھوڑ کر اس نفسا نفسی میں پڑ جائے"۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار مولانا منصور علی خان نے مذہب منصور میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ حضرت قاسم العلوم "نہ کسی سے دشمنی کرتے اور نہ کسی کو برا کہتے۔ باہمی نزاع بالکل پسند خاطر نہ تھا۔ اتفاق کو بے حد پسند کرتے تھے"۔ ان کی یہ خوبی بھی حضرت فخر العلماء بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ نے تقریر دل پذیر کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ "اب خداوند ذوالجلال سے دعا ہے کہ مسلمانوں میں آپس میں اتفاق دے اور ظاہر و باطن کی اصلاح فرمائے اور دین اسلام کا بول بالا ہو" انتصار اسلام کے دیباچہ میں تو ان کا یہ جذبہ اور بھی نمایاں ہے اور یہاں اس کا تخاطب براہ راست اپنے ہم مکتبوں اور ہم درس ساتھیوں سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جناب مولانا مرحوم نے شاگرد و معتقد بہت چھوڑے۔ اب ان کو چاہیئے کہ جناب مولانا مرحوم کی طرح جان و مال، عزت و آبرو کا کچھ خیال نہ کریں۔ آپس کے جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ خدا اور رسول کے دشمنوں سے لڑیں۔ حتی الوسع دین اسلام کی حمایت کریں۔ بندہ بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ سب میں ادنیٰ ہے، لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے۔ ؎ بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اب رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ اسلام اور اہل اسلام کو ترقی دے۔ ہمارے گناہوں پر خیال نہ فرمائے۔ خاک ذلت سے اٹھا کر تخت عزت پر بٹھائے۔ اسلام کا بول بالا ہو۔ دشمنان دین کا منہ کالا ہو۔ ؎ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ندوۃ العلماء

اور بین الاسلامی اتحاد کی راہ میں ان کا سب سے آخری کارنامہ ندوۃ العلماء کی تحریک میں شرکت و شمولیت ہے اس لئے کہ ولی اللہی تحریک کی تائید جس طرح دار العلوم دیوبند کے قیام سے ہوئی اسی طرح دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام سے بھی ہوئی ہم اس ضمن میں کسی تفصیل کا ارتکاب نہیں کر رہے ہیں بلکہ پیام ندوۃ العلماء کے نام سے جو کتاب محمد الحسنی نے اکتوبر نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع کی اس میں تجدید علوم کے نام سے تحریر ہے کہ "آج ہم اس عہد کی تجدید کرتے ہیں جو ہندوستان کے مخلص اور روشن ضمیر علماء نے (۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء) میں کانپور کے مدرسہ فیض عام میں کیا تھا وہ یقیناً ایک مبارک اور تاریخی گھڑی تھی جس کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی" اور "مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک اور تاریخی موقع پر اس زریں فہرست پر ایک نظر ڈال لی جائے جس میں مولانا سید محمد علی مونگیری کے علاوہ جو اس تحریک کے محرک اور بانی تھے دوسرے شرکائے محفل میں حضرت فخر العلماء مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا شاہ سلیمان پھلواری،

مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا عبد الغنی خان خورشید آبادی اور مولانا شاہ تجمل حسین دیسنوی قابل ذکر تھے۔ آج جب ہم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے اتحاد کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی داغ بیل ڈالنے والوں میں حضرت قاسم العلوم کے دونوں ممتاز ترین شاگرد یعنی حضرت فخر العلماء اور حضرت شیخ الہند نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ انہی بزرگوں کا کارنامہ ہے کہ آج ملت اسلامیہ کے یہ دونوں عظیم دار العلوم خدمت اسلامی کے لئے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوئے ہیں۔

حضرت قاسم العلوم کی رحلت کے بعد ان کے مقدس مشن کو آگے بڑھانے کیلئے اس سے زیادہ دردمند اپیل اور کیا ہو سکتی تھی۔ حضرت فخر العلماء نے اس اپیل میں حضرت قاسم العلوم کے شاگردوں کو براہ راست مخاطب کر کے انہیں ان کا فرض یاد دلایا ہے۔ جہاں تک جان و مال، عزت و آبرو کو ترک کر کے قاسمی مشن کو کامیاب بنانے اور مفردات قاسمی کی ترویج و اشاعت کا معاملہ ہے حضرت فخر العلماء صحیح معنوں میں یہ اپیل کرنے کے مستحق تھے اس لئے کہ انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنے استاد کے مشن کو آگے بڑھایا تھا اور اپنے آپ کو حضرت قاسم العلوم کا ایک ادنیٰ شاگرد اور اس انتساب کو اپنے لئے فخر لکھ کر شاگردی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر حضرت قاسم العلوم کے مزاج کی اس کیفیت کو کہ اپنے آپ کو گمنام رکھا جائے اور گمنام سمجھا جائے تو حضرت فخر العلماء نے ان کی اس خواہش کا بھی بدرجہ اتم تکملہ کر دیا۔ تمام ذہانت و دیانت، قابلیت و صلاحیت، استعداد اور علمیت کے اپنے آپ کو ایسا گمنام بنایا کہ جب آپ نے انتقال فرمایا تو جوار وطن میں دفن ہونے کی بجائے کانپور کے بساطیوں کے قبرستان کے ایک گمنام گوشے کی ایک گمنام قبر میں ابدی استراحت اختیار فرمائی اور مرنے کے بعد بھی اسوۂ قاسمی کو تازہ کیا۔ حضرت شیخ الہند کا بڑا مرتبہ ہے اور بہت سے لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قاسم العلوم کی زبان تھے تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ مگر حضرت قاسم العلوم کا مزاج دار، سفر و حضر میں ان کا ساتھی، تحریر و تقریر میں معارف قاسمی کا پیامبر، علوم قاسمی کی اشاعت کا سب سے سرگرم اور فعال کارکن۔ اور اپنی زندگی کو اپنے قدم بہ قدم نبھانے والا ان کے لئے جینے اور مرنے والا اور ان کے گمنامی کے جذبہ کی صحیح قدر کرنے والا گمنامی کے عالم میں کانپور کے ایک ویرانے میں محو استراحت ہے جہاں وہ ابد تک آرام کرے گا۔ اسے یقیناً اس بات کا صدمہ نہیں ہوگا کہ اس نے جس ادارے کیلئے اپنی زندگی تج دی اور اس ادارہ کے روح رواں کے لئے اس نے جو قربانیاں دیں اس کا اس ادارے کے بزرگوں اور کارکنوں نے کوئی لحاظ نہیں کیا یہاں تک کہ جب اس ادارے کی صد سالہ تاریخ کتابی شکل میں آئی تو اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن جو لوگ حضرت فخر العلماء کی قربانیوں، ایثار، جذبۂ عمل اور علوم قاسمی کی نشر و اشاعت میں ان کے کلیدی کردار سے واقف ہیں اور خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو اس فروگذاشت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

حضرت نانوتوی کے وصال کے بعد یوں تو ان کے تینوں مشہور شاگردوں نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک کر دیا۔ میری مراد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی، حضرت سید العلماء مولانا احمد حسن امروہوی، اور حضرت فخر العلماء مولانا فخر الحسن محدث گنگوہی سے ہے لیکن اول الذکر دونوں ۱۴
شاگرد یعنی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید العلماء امروہوی رحمۃ اللہ علیہ بعد میں اکابر علماء کے کہنے پر دوبارہ اپنے علمی کام میں مشغول ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات مبارک میں توسیع بھی عطا فرمائی اور انہیں ملک و ملت اور دین کی خدمت کا موقع بھی عنایت کیا۔ یعنی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصال اپنے استاد مکرم کے وصال کے چالیس سال بعد اور حضرت سید العلماء کا وصال اپنے استاد کے وصال کے بتیس سال بعد ہوا مگر حضرت فخر العلماء نے حضرت قاسم العلوم کی

وفات کے بعد نہ صرف دیوبند اور گنگوہ کو چھوڑ دیا بلکہ ان دونوں علاقوں سے نقل سکونت کرنے کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے پیشہ کو بھی خیرباد کہدیا اور گنگوہ اور دیوبند سے دہلی اور پھر وہاں سے کانپور تشریف لے جا کر اپنے آپ کو اپنے استاد کی خواہش کے مطابق گمنامی کی وادی میں کھو دیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے استاد کے علم اور مشن کے لئے وقف کر دیئے مگر انہیں اپنے استاد سے جدائی کا اس قدر غم تھا کہ وہ حضرت نانوتوی کے وصال کے ۱۷ برس کے اندر ہی اندر ۱۸۹۷ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے درس و تدریس کے پیشہ کو پھر نہیں اپنایا۔ مگر تصنیف و تالیف کے مشاغل میں مصروف رہے جن کا اپنے موقع پر تذکرہ ہو چکا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی مدرسہ جامع العلوم جامع مسجد پٹکاپور کانپور میں آمد کے موقع پر حضرت شیخ الہند کے ساتھ ان کی ملاقات کا تذکرہ حیات شیخ الہند مصنفہ میاں اصغر حسین دیوبندی کے صفحہ ۱۷۶ پر ہے۔ اسی طرح آپ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے کہنے پر مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور کانپور کے آٹھویں جلسہ دستار بندی کی صدارت فرمائی جو ۷ رجب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں منعقد ہوا تھا اور جس میں انہوں نے چھ علماء کی دستار بندی فرمائی۔ جس میں خود ان کے فرزند ارجمند مولوی نور الحسن بھی شامل تھے اور اس تقریب سعید میں شمولیت حضرت فخر العلماء کا آخری علمی مشغلہ تھا کہ آپ نے اسی سال وفات پائی اور باغ طیبوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ میں نے ان کی قبر مبارک کی زیارت کی ہے مگر یہ قبر بھی بے کتبے کی تھی۔ اور اب اگر مجھے کہا جائے کہ تم ان کے مزار مبارک کی نشاندہی کر دو تو شاید یہ چیز اب میرے امکان سے باہر ہو۔

متوسلین و لواحقین

حضرت فخر العلماء کے والد ماجد، والدہ، بھائی بہنوں اور بہنوئیوں کا اپنے مقام پر تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ان کی اولاد اور ان کے بھائی اور بہنوں کی اولاد کا تذکرہ کر کے حیات فخر العلماء کو اپنے اختتام پر پہنچایا جاتا ہے۔

اولاد

حضرت والا کے صرف تین فرزند ہوئے۔ پہلے فرزند کا نام مولانا حافظ نور الحسن تھا جن کا شمار حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں کیا جاتا ہے اور اشرف السوانح میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے مولانا حافظ نور الحسن نے مشہور کتاب حسامی کی تصحیح میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں جن کا اعتراف ان کے چھوٹے بھائی نے بھی حسامی کے حواشی کی اشاعت کے موقع پر کیا ہے۔ مولانا نور الحسن کا نام حضرت قاسم العلوم نے تجویز کیا تھا جس کی تصدیق قاسم العلوم کے مطالعہ سے ہو جاتی ہے۔ اور جن کا اپنے موقع پر تذکرہ بھی ہو چکا ہے مولانا نور الحسن نے اپنی ان علمی خدمات کے علاوہ اپنی عمر مدرسہ جامع العلوم پٹکاپور کانپور کی نائب مہتممی میں گزاری اور ریٹائرمنٹ کے بعد عمر کا باقی حصہ مادر شریف میں جو کانپور سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر کانپور جھانسی روڈ پر واقع ہے گزارا جہاں ان کی صاحبزادی کا قیام تھا اور آپ نے وہیں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے مادر والے ان کی روحانی عظمت اور بزرگی کے متعدد واقعات بیان کرتے ہیں۔

مولانا نور الحسن کی صرف ایک دختر تھیں جن کا نام خاتون جنت تھا۔ ان کی شادی اپنے حقیقی خالہ زاد بھائی علی احمد سے ہوئی تھی۔ ان کا بھی عین عالم جوانی میں انتقال ہوا۔ مرحومہ کی صرف ایک ہی صاحبزادی تھیں جن کا نام عائشہ خاتون ہے۔ ان کی شادی مولانا حافظ فیض الحسن کے لڑکے سید الطاف حسین کے ساتھ ہوئی اور ماشاء اللہ سے وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اور کراچی میں قیام پذیر ہیں

حضرت فخر العلماء کے دوسرے صاحبزادے کا نام مولانا حافظ فیض الحسن تھا اور یہ نام بھی حضرت قاسم العلوم ہی کا تجویز کردہ ہے مولانا حافظ فیض الحسن نے ابتداً مدرسہ حسین بخش دہلی میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد آپ نے اپنے چچا مولانا صدیق احمد انبہٹوی سے مالیر کوٹلہ میں تحصیل علم کی۔ مولانا

حافظ فیض الحسن صحیح معنوں میں اپنے عظیم والد کے جانشین تھے۔ آپ نے اصول الشاشی، سلم العلوم، حسامی اور رشیدیہ پر حاشیے تحریر کئے اور ان تمام کتابوں کی اشاعت کے لئے مخزن العلوم کے نام سے ایک تعلیمی اور تصنیفی ادارہ بھی قائم کیا جس کے تحت یہ کتابیں شائع ہوئیں۔ اسی غرض سے آپ نے اپنے مکان واقع چٹائی محال میں اپنے بڑے صاحبزادے سعید الحسن کے نام سے مطبع سعیدی بھی قائم کیا، جو کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ اور راقم الحروف نے بھی اسے دیکھا ہے۔ مولانا فیض الحسن ایک اعلیٰ پایہ کے خوش نویس بھی تھے اور اپنی شائع کردہ کتابوں کے سرورق کا ڈیزائن وہ خود تیار کرتے تھے مولانا فیض الحسن نے اپنے زمانہ کی سیاسی زندگی میں بھی حصہ لیا تھا اور مسجد مچھلی بازار کانپور کے سانحہ انہدام کے سلسلہ میں (سنہ ۱۹۱۳ء) میں جو جلوس جامع مسجد کانپور سے نکلا تھا اس میں وہ بحیثیت ایک قائد کے صرف شریک ہی نہیں تھے بلکہ اس جلوس کا تاریخی جھنڈا اور اس کی عبارت بھی ان ہی کی تیار کردہ اور تحریر کردہ تھی۔ یہ جھنڈا برطانوی حکومت کی کوشش کے باوجود انگریز حکام کو ہاتھ نہ لگ سکا۔ مولانا فیض الحسن تحریک پاکستان کے بھی سرگرم حامی تھے۔ مگر افسوس کہ سنہ ۱۹۴۳ء میں انتقال کے باعث وہ اس تحریک کو پھلتے پھولتے نہ دیکھ سکے۔ مولانا فیض الحسن نے اردو اور عربی میں اشعار اور نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں حضرت گنگوہی کی شان میں ان کا عربی قصیدہ اپنے والد ماجد کی رحلت کے بعد ان کی یاد میں ایک عربی نظم اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی شان میں ایک اردو نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مولانا حافظ فیض الحسن کا روحانیت میں بھی خاصا بلند مقام ہے اس لئے کہ انہیں اپنے حقیقی پھوپھا مولانا خلیل احمد سہارن پوری سے بیعت کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ اور ان کا شمار حضرت سہارنپوری کے خلفاء میں بھی ہوتا ہے (ملاحظہ فرمایئے تذکرۃ الخلیل) مولانا حافظ فیض الحسن نے اپنے چچا مولانا صدیق احمد انبیھٹوی سے بھی روحانی تربیت حاصل کی تھی۔ مولانا حافظ فیض الحسن اپنے والد کی طرح ایک زبردست حریت پسند تھے اور انہوں نے تاحیات کہیں ملازمت نہیں کی کتابوں کی اشاعت اور قرآن پاک اور دوسری کتابوں کی صحت سے جو رقم انہیں حاصل ہوتی تھی، اسی پر انہوں نے زندگی بھر تکیہ کیا اور قناعت و استغنا کی ایک ایسی روشن مثال قائم کر گئے جس کی مشکل ہی سے نظیر ملے گی۔ حضرت مولانا حافظ فیض الحسن کے تین فرزند اور دو صاحبزادیاں تھیں پہلے صاحبزادے کا نام سعید الحسن تھا جنھیں ادبی دنیا میں دور ہاشمی کانپوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جنھیں حضرت جگر مرادآبادی کے اکمل ترین شاگردوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے آپ کا کلام "کلام دور" کے عنوان سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ دوسرے صاحبزادے کا نام وحید الحسن ہے جن کی شادی قاضی اکرم حسین مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ جناب وحید الحسن اور ان کی اہلیہ اور اولاد کراچی ہی میں مقیم ہے۔ حضرت مولانا فیض الحسن کے تیسرے صاحبزادے کا نام حمید الحسن تھا جو اپنے بڑے بھائی کی طرح شاعر تھے اور شوق تخلص کرتے تھے۔ جناب دور ہاشمی نے اپنی زندگی کا کافی حصہ بنگلور جنوبی ہند میں گذارا اس لئے ان کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی مگر اپنی زندگی کے آخری ایام انہوں نے کراچی ہی میں گزارے اور یہیں انہوں نے سنہ ۱۹۷۵ء میں انتقال فرمایا اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہو گئے جناب وحید الحسن بقید حیات ہیں اور ان کے چار بیٹوں اور دو بیٹیوں سے حضرت فخر العلماء کا سلسلۂ نسب چل رہا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے تیسرے بھائی جناب حمید الحسن شوق نے اپنی زندگی پی۔ آئی۔ اے کی ملازمت میں گزاری۔ آپ کی شادی آپ کی چچازاد بہن رقیہ سے ہوئی جن سے انکی بھی اولاد ہیں چار لڑکے اور دو لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ مولانا حافظ فیض الحسن گنگوہی کی پہلی صاحبزادی آمنہ خاتون کی شادی اپنے خالہ زاد بھائی سید ذوالفقار حسین رضوی بن سید احمد میاں بن حکیم طالب علی بن حکیم باقر علی بن حکیم خادم علی بن حکیم پناہ علی سے ہوئی جو کڑہ مانک پور

کی سکونت ترک کر کے اٹاوہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ آمنہ خاتون کے بھی چار لڑکے اور دو لڑکیاں
بقید حیات ہیں آمنہ خاتون نے سنہ ۱۹۷۲ء میں اور ان کے شوہر نے سنہ ۱۹۷۶ء میں وصال فرمایا اور
دونوں پاپوش نگر کے قبرستان میں ابدی آرام میں مصروف ہیں۔ مولانا فیض الحسن کی دوسری صاحبزادی
محمودہ خاتون کی شادی حضرت مولانا نے اپنے چچا زاد بھائی شاہ ظریف حسین گنگوہی کے ساتھ کر دی تھی
جن کا ذکر حضرت فخر العلماء کے بھائی شاہ مظہر حسین کی اولادوں کے باب میں آئے گا محمودہ خاتون نے
چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنی یادگار میں چھوڑیں جن میں ایک کے علاوہ باقی سب بقید حیات ہیں۔

حضرت فخر العلماء کے تیسرے فرزند محمد احمد اپنے دو بھائیوں کے برعکس کانپور میں تولد ہوئے
اور حضرت والا کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف چھ سال تھی۔ آپ بسلسلہ ملازمت کافی عرصہ جھانسی
میں قیام پذیر رہے اس کے بعد آپ ہجرت فرما کر لاہور تشریف لے گئے اور ریلوے سے ریٹائرمنٹ
کے بعد کراچی آ گئے اور یہیں وصال فرمایا۔ جناب محمد احمد اعلیٰ استعداد کے شاعر تھے اور فوق تخلص
کرتے تھے اور آپ کا شمار بھی خانوادہ جگر مراد آبادی میں کیا جاتا ہے جو ان کے نزدیک ان کے مرشد
کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ بلکہ آپ کے بھتیجے درد ہاشمی آپ ہی کی تحریک پر حضرت جگر کے شاگرد ہوئے
تھے اور حضرت جگر مراد آبادی نے برسہا برس ان دونوں کو روزانہ دو غزلیں کہنے کی ہدایت کر رکھی
تھی جو استاد مکرم کے سامنے پیش کرنے کے بعد ضائع کر دی جاتی تھیں۔ آپ کی شادی کانپور کے مشہور محلہ
فراش خانہ میں ہوئی اور آپ کے چار صاحبزادے اور ۴ صاحبزادیاں ماشاء اللہ سے اب بھی بقید
حیات ہیں۔ افسوس کہ حضرت فوق کانپوری کا دیوان اب تک شائع نہیں ہو سکا اور ادبی دنیا اب انکے
نام تک سے آشنا نہیں رہی۔

برادر خورد

حضرت فخر العلماء کے ایک ہی بھائی تھے جن کا ذکر اپنے مقام پر
ہو چکا ہے مگر حضرت پیر جی مولوی مظہر حسین کا خاندان خوب
پھلا پھولا۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی حقیقی ماموں زاد بہن آپ
کی اہلیہ تھیں۔ مولوی مظہر حسین کے دو فرزند اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے کا نام حاجی عزیز حسین
تھا جن کی اہلیہ ان کی حقیقی پھوپی زاد بہن میمونہ تھیں (دختر حکیم محمد اسمٰعیل آجیری) آپ نے دار العلوم
دیوبند میں تعلیم پائی اور اپنی ساری زندگی اسی عظیم ادارہ کی خدمت ہی میں بسر کر دی۔ آپکا انتقال
ہو چکا ہے، آپ کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑے لڑکے کا نام بشیر حسین اور چھوٹے کا
شبیر حسین تھا۔ بشیر حسین کا انتقال ہو چکا ہے مگر شبیر حسین ابھی ماشاء اللہ حیات ہیں۔ آپ کی
صاحبزادیاں صفیہ بیگم اور رضیہ بیگم بھی حیات ہیں اور اولاد والی ہیں۔

شاہ مظہر حسین کے دوسرے صاحبزادے شاہ ظریف حسین تھے جن کا سنہ ۱۹۶۵ء میں
انتقال ہو گیا آپ بھی گنگوہ ہی میں مدفون ہیں شاہ ظریف حسین کی شادی اپنے حقیقی تایہ زاد بھائی
مولانا مولوی حافظ فیض الحسن کی چھوٹی صاحبزادی محمودہ بیگم سے ہوئی۔ شاہ ظریف حسین نے بھی
دار العلوم دیوبند سے تکمیل علم کی اور مسلم لیگ اور پاکستان کی خدمت میں بڑی سے بڑی قربانی سے
دریغ نہیں کیا۔ آپ کو سہارنپور مسلم لیگ میں ایک نہایت اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ آپ کے چار صاحبزادے
اور تین صاحبزادیاں ہیں جن میں ایک کے علاوہ سب حیات ہیں۔ اور خوش و خرم ہیں۔

شاہ مظہر حسین کی بڑی صاحبزادی ام سلمیٰ کی شادی حکیم محمد اسمٰعیل امبیری سے ہوئی۔
تھی۔ مگر ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اور آپ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئیں۔ اور اپنی ساری طویل عمر
بیوگی ہی میں گزار دی۔ آپ کا سنہ ۱۹۷۹ء میں انتقال ہوا اور گنگوہ ہی میں مدفون ہوئیں۔ دوسری
صاحبزادی کا نام کلثوم تھا۔ جو مولوی محمد رام پوری کے عقد میں آئیں اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی
اپنی یادگار چھوڑے جن میں صاحبزادے حیات ہیں اور ان کی اہلیہ حافظ قاری ظریف حسین گنگوہی کی

بڑی صاحبزادی ہیں۔ تیسری صاحبزادی کا نام رشیدہ بیگم ہے جو شاہ ضیاء الحق کے نکاح میں آئیں۔ یہ صاحبزادی حیات ہیں اور ان کے سات صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ پیرزادہ ضیاء الحق بھی گنگوہ کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ پاکستان کے ایک سابق گورنر جنرل ملک غلام محمد ان کے کلاس فیلو تھے۔ پیرزادہ صاحب نے احیائے اسلامی کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا اور جماعت اسلامی ہند کے رکن کی حیثیت سے اپنی اہلیہ اور اولاد کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد بھی کافی عرصہ تک دیار ہند میں تحریک اسلامی کو فروغ پہنچایا۔ شاہ مظہر حسین کی چوتھی صاحبزادی حمیدہ بیگم بھی حیات ہیں۔ اور آپ کی تین صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے اچھے حال میں ہیں۔ آپ کی شادی جناب اشفاق احمد قدوسی کے ساتھ ہوئی تھی جن کا کراچی میں انتقال ہوا۔ مرحوم اشفاق احمد قدوسی کو تعلیم کا مولا کا بڑا شوق تھا اور آپ کے قائم کردہ کئی ادارے اب بھی کراچی میں تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں

حضرت فخر العلماء کی بہن اولیاء بیگم کی شادی کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے محمد قاسم اور ایک صاحبزادی صدیقہ تھیں جن کی اولادیں خوب پھول پھل رہی ہیں۔

آپ کی دوسری بہن انبیاء بیگم سے ایک صاحبزادے حافظ محمد ابراہیم اور ایک صاحبزادی تولد ہوئیں۔ ان دونوں کا تفصیلی تذکرہ تذکرۃ الخلیل میں موجود ہے آپ کی بھانجی منیرہ بیگم کی اولاد آجکل ڈیرہ غازی خان میں آباد ہے۔

حضرت فخر العلماء کی تیسری بہن قطبی بیگم کا بھی اپنے مقام پر ذکر ہو چکا ہے۔ آپ کی اولاد میں حکیم محمد سعید امبیٹھوی نے بڑی شہرت پائی اور مولانا اشرف علی تھانوی سے مجاز صحبت کا شرف حاصل کیا۔ اور آپ کے بڑے صاحبزادے کو بھی حضرت تھانوی سے یہی اعزاز حاصل ہوا۔ قطبی بیگم کی دو صاحبزادیاں تھیں پہلی صاحبزادی کی شادی مولوی محمد رامپوری سے اور دوسری صاحبزادی میمونہ کی شادی شاہ عزیز حسین سے ہوئی جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

ان تمام خاندانی روابط کے قیام و استحکام میں حضرت فخر العلماء کی والدہ الٰہی بیگم دختر شاہ حسن عسکری شہید کو بڑا دخل حاصل تھا۔ جن کی سعادت مند اولادیں ان کے ہر حکم کو بجا لانے میں اپنی سعادت اور عزت سمجھتی تھیں اور حضرت فخر العلماء کی یہ عظیم والدہ اپنے عظیم فرزند کے وصال کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک حیات رہیں اور حضرت فخر العلماء کی بھانجی منیرہ کی ذاتی طور پر تربیت فرماتی رہیں جو اپنی والدہ انبیاء بیگم کے انتقال کے بعد اپنی نانی ہی کے یہاں اپنے والد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی اجازت و ہدایت پر مقیم رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت فخر العلماء اور ان کے ان تمام متوسلین اور ان کی اولادوں پر اپنی خصوصی مہربانیاں رکھیں۔ کہ یہ ایک عظیم عالم دین ایک بڑے محدث ایک جرأت مند محب وطن مبلغ مصنف اور سرشار آزادی سے نسبت قریبہ رکھتے ہیں اور ہر طرح اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کے مستحق ہیں۔ حضرت فخر العلماء علوم دینیہ میں رشیدی اور قاسمی مجالس کی یادگاروں میں ایک خصوصی حیثیت کے حامل تھے اور آج دنیا میں علوم قاسمی کو جو تابانی اور بندگی حاصل ہے اس کا سب سے بڑا ذریعہ اور وسیلہ ہیں جس سے ارباب دیوبند اغماض تو برت سکتے ہیں مگر انکار نہیں کر سکتے۔